انتساب

میں اپنی اس کتاب کو اپنے محسن اور دوست روشن علی بھیم جی کی ذات گرامی سے منسوب کرتا ہوں۔

www.IqbalCyberLibrary.Net
All rights reserved.
©2002-2006

چند ابتدائی باتیں

سب سے پہلے یہ باتیں سن لیجیئے۔ان سے آگے چل کر،میرے سمجھنے میں آپ کو مدد ملے گی۔

(۱)

میں نے اپنے حالات زندگی قلم بند کرنے کے سلسلے میں کامل چھ برس تک،زیادہ تر مسلسل اور گاہ گاہ غیر مسلسل عرق ریزی کی ہے۔ڈیڑھ برس کی محنت کے بعد پہلا مسودہ تیار کیا۔اسے ردی کی ٹوکری میں ڈال دیا۔پھر ڈیڑھ برس میں دوسرا مسودہ مکمل کیا،اس پر بھی تنسیخ کا خط کھینچ دیا۔پھر ڈیڑھ پونے دو برس صرف کر کے نو سو صفحوں کا تیسرا مسودہ تحریر کیا اور تین ہزار میں اس کی کتابت بھی مکمل کرالی۔مگر جب اس پر غائر نظر ڈالی تو پتا چلا کہ اس مسودے کو بھی میں نے ایک ایسے گھبرائے ہوئے آدمی کی طرح لکھا ہے،جو صبح کو بیدار ہو کر رات کے خواب کو،اس خوف سے جلدی جلدی الٹا سیدھا لکھ مارتا ہے کہ کہیں وہ اس کے ذہن کی گرفت سے نہ نکل جائے۔

اور خدا خدا کر کے اب یہ چوتھا مسودہ شائع کیا جا رہا ہے۔

اور میرے دل کی بات آپ پوچھیں تو یہ بھی کہہ دوں کہ میں اس چوتھے مسودے سے بھی مطمئن نہیں ہوں۔لیکن کیا کروں اب مجھ میں دم باقی نہیں رہا کہ مزید عرق ریزی کر کے پانچواں مسودہ لکھوں اور اسے بھی قلم زد کر دوں۔

اور اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی سوچتا ہوں کہ اب میرے چل چلاؤ کا وقت سر پر آن پہنچا ہے۔اور ''جرس فریاد می دارد کہ بر بندید محمل ہا'' کی آوازیں برابر کانوں میں چلی آ رہی ہیں۔اور یہ مصرعہ کہ:نسیم جا گو کمر کو باندھو۔اٹھاؤ بستر کہ رات کم ہے:۔

دل میں گونجتا رہتا ہے۔اور دل میں ڈرتا ہوں کہ کہیں ایسا نہ ہو۔۔۔کہ تحریر ہی میں خدا کے فضل سے موت آ جائے،اور مسودہ نا تمام پڑا رہے۔اس لئے اب جیسا بھی ہے۔یہ چوتھا مسودہ پیش کر رہا ہوں۔۔

حافظے کا ضعف

میں کبھی قوی حافظے کا مالک نہیں رہا۔ اور اب تو یہ عالم ہو گیا ہے کہ رات کو کیا چیز کھائی تھی۔ صبح کو یہ بھی یاد نہیں رہتا۔ کئی مہینے کی بات ہے کہ تاروں کی چھاؤں میں ٹہلنے کے لئے نکلا تھا، واپسی میں اپنے گھر کا راستہ بھول گیا۔ وہ تو کہیئے کہ ایک میرے ہم عمر ٹہلتے ہوئے مل گئے، میں نے ان سے پوچھا کہ یہیں کہیں ایک برساتی نالے کے قریب جو ایک گنبد والا مکان ہے۔ کیا آپ اس کا راستہ بتا سکتے ہیں؟۔ انہوں نے کہا کہ کیا آپ جوش صاحب کے مکان جانا چاہتے ہیں۔ میں نے کہا جی ہاں، اور ان نیک مرد نے مجھ کو میرے گھر پہنچا دیا۔ اور رخصت ہوتے ہوئے انہوں نے مجھ سے کہا آج سے چالیس بیالس برس پیشتر میں نے جوش صاحب کو آگرے میں دیکھا تھا۔ میرا نام نصیر احمد ہے۔ جوش صاحب سے میرا سلام کہہ دیجیئے گا۔ میں نے فرط شرم سے انہیں یہ نہیں بتایا کہ میں ہی جوش ہوں۔

اور تو اور آپ کو مشکل سے یقین آئے گا کہ ایک روز ایک خط لکھنے کے بعد جب دست خط کرنے کی باری آئی تو اپنا تخلص بھول گیا، چند سیکنڈ تک مجھ پر عجیب کرب کی کیفیت طاری رہی۔ دل دھڑ دھڑ کرنے لگا۔ اور اگر دو چار سیکنڈ کے اندر اندر اپنا تخلص یاد نہ آجاتا تو یقین فرمایئے کہ میرا دم نکل جاتا۔

میں نے یہ بات اس واسطے لکھ دی ہے کہ اگر میری زندگی میں کسی واقعے کی کمی بیشی یا تقدم و تاخر نظر آئے تو اسے آپ میرا ارادی فعل نہ سمجھیں اور میری حالت پر ترس کھا کر اسے معاف کر دیں۔

حالات قلم بند کرنے کی جگر کاویاں

پچھتر برس کی پہاڑسی زندگی کا احاطہ کرنا بچوں کا کھیل نہیں۔ میں نے بجھے ہوئے حافظے کے تہہ در تہہ پیچیدہ اور گھور اندھیروں میں ٹٹول ٹٹول کر یہ سفر طے کیا ہے۔ ان اندھیاروں میں میرے حالات اس قدر الجھے اور ایک دوسرے پر چڑھے ہوئے ملے کہ یہ پتہ نہیں چلتا تھا کہ کون سا واقعہ مقدم ہے اور کون موخر۔ اور نسیان کا غول بیابانی مجھے کس طرف لیے جا رہا ہے۔ پھونک پھونک کر، قدم رکھتا آگے بڑھتا رہا۔ اپنی پیری کو لڑکپن کی سرحدوں تک کھینچ کر لے گیا۔ لڑکپن سے ریعان شباب کی جانب باگ موڑی، ریعان شباب سے بھرپور جوانی اور جوانی سے ادھیڑ عمر کے کوہ و بیابان طے کرتا ہوا بڑھاپے کی اس بٹیر تک آ گیا۔ کیا بتاؤں اس جان کاہ سفر میں کیا کیا جتن کرنا پڑے۔۔ میں نے اپنے بڑھاپے کو بچہ بنا کر اپنے ماں باپ کی آغوش میں بٹھایا۔ اپنے گھر کی انگنائی میں کلیلیں کیں، پرانی برساتوں کو جگایا، اپنے مدرسوں اور بورڈنگ ہاؤسوں میں گیا، اپنے لنگوٹیا یاروں کو پکارا اور اپنے موت کی نیند سوئے مور خان شباب کے شانے ہلائے۔ اور اپنے دور افتاد دوستوں کو اشاروں سے قریب بلایا۔ اور اپنی جونای کے شبستانوں میں پہنچا۔ جہاں زلفوں کی شمیم اب تک مچل رہی ہے۔ اور ٹوٹے پیمانوں اور بجھی شمعوں کے انبار لگے ہوئے ہیں۔ اور گیسوؤں سے گری ہوئی افشاں کے ذرے اب تک دمک رہے ہیں۔ وہاں پہنچ کر اپنے بچھڑے ہوئے معشوقوں کو اس مسند پر بٹھایا قوس قزح اور کاہکشاں کے رنگ جس کا طواف کیا کرتے تھے۔ اور ماضی سے جب اپنے کو ڈسوا چکا تو قلم کو خون میں ڈبو ڈبو کر سب کچھ قلم بند کر لیا۔ اور آپ کو سنانے بیٹھ گیا۔

کہتے ہیں لکھنو میں ایک بوڑھے میرزا صاحب رہتے تھے۔ جنہوں نے حضرت جان عالم واجد علی شاہ کی آنکھیں دیکھی تھیں۔ ایک بار چند نوجوانوں نے اصرار کیا کہ

میرزا صاحب قبلہ کچھ پرانے حالات سنایئے۔انہوں نے سینہ پیٹ کر کہا لڑکو مجھ سے وہ داستان نہ سنو، ورنہ میری چھاتی شق ہو جائے گی۔تمہاری تھوڑی دیر کی دل چسپی ہو جائے گی اور میں پہروں کے لئے بے کار ہو کر رہ جاؤں گا۔لیکن جب ان نوجوانوں نے ان کے قدم پکڑ لیے تو ماضی کی طرف پلٹنے پر مجبور ہو گئے۔اور حالات سناتے سناتے تھوڑی دیر میں ان کا یہ عالم ہو گیا کہ گلا رندھ گیا۔ہچکیاں لے لے کر رونے لگے''اور ہائے جان عالم کہہ کر بے ہوش ہو گئے''۔سو بندہ پرور اپنا حال سنا کر میں بھی اس طرح ہچکیاں لے کر رو رہا ہوں۔ہائے ماضی کے ڈنک،

اپنے کبھی کے رنگ محل میں جو ہم گئے
آنسو ٹپک پڑے در و دیوار دیکھ کر

(۴)

خودکشائی

میری زندگی کے چار بنیادی میلانات ہیں،شعر گوئی،عشق بازی،علم طلبی اور انسان دوستی۔۔ان سب کو سلسلہ وار دیکھ لیجیئے۔تا کہ آپ سمجھ لیں کہ میں کیا ہوں؟

ا۔شعر گوئی

میں نے شاعر بننے کی تمنا کبھی نہیں کی، بلکہ شعر خود خواہش آں کرد کہ گرد دفن ما، میں شاعری کے پیچھے کبھی نہیں دوڑا بلکہ شاعری نے خود میرا انتخاب کیا۔اور نو برس کی عمر میں ہی مجھ کو پکڑ لیا۔اگر شاعری کوئی اچھی شے ہے تو واللہ میں کسی آفرین کا مستحق نہیں ہوں۔اور اگر وہ کوئی بری چیز ہے تو خدا کی قسم میں کسی ملامت کا بھی سزاوار نہیں۔

بار ہا گفتم و بار دیگر می گویم
کہ من دل شدہ،ایں راہ نہ خود می پویم
در پس آئینہ،طوطی صفت داشتہ اند
آنچہ استاد ازل گفت،بگو،می گویم

شاعری میری حاکم ہے ۔میں محکوم ہوں ۔وہ جابر ہے میں مجبور،وہ قاہر ہے میں مقہور وہ آمر ہے اور میں مامور۔شاعری کے باب میں بعض بزرگوں نے ایک کاص دینی مصلحت کی بنا پر جس کی شرح کا یہاں موقع نہیں ،یہ عجیب کلیہ وضع فرمایا ہے کہ صرف اس موزوں کلام پر شعر کا اطلاق ہوگا جو بالقصد کہا گیا ہو۔۔اگر یہ کلیہ تسلیم کرلیا جائے تو میں نے آج کی تاریخ تک ایک مصرٔ بھی بالقصد''موزوں کرنے کا ارتکاب نہیں کیا ہے۔اس لئے آپ کو اختیار کامل حاصل ہے کہ میرے تمام کلام کو شاعری سے کلیتہ خارج فرما کر میرے غیر شاعر ہونے کا اعلان فرمادیں۔میں خوش ،میرا خدا خوش۔

آپ نے مجھے شاعر ہونے کا انعام ہی کب دیا تھا کہ اب مجھے نا شاعر تسلیم فرما کر ،اس انعام سے محروم فرمادیں گے۔اس سلسلے میں ایک بات اور بھی سن لیجئے۔کہ شاعری وہ بد بلا ہے کہ ہر موزوں طبع تخلص دار کے کان میں یہ افسوں پھونک دیتی ہے کہ بیٹا تم اپنے دور کے سب سے بڑے شاعر ہو۔اس لئے باورچی ٹولے کا ہر لونڈا،اپنے کو نعمت خان عالی سے بڑا سمجھنے لگتا ہے۔

جھوٹ کیوں بولوں میرے گوش مبارک میں بھی شاعری یہ افسوں پھونک چکی ہے کہ حضور اقدس واعلیٰ اس بیسویں صدی کے سب سے عظیم شاعر یعنی اشعر الشعراء ہیں۔۔۔لیکن قوت وحیات کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ میری عقل بیمار نہیں ہے۔اور وہ مجھ سے نہایت سنجیدگی اور دیانت سے کہتی ہے کہ خاں صاحب بہادر انائے شاعری کے فریب میں نہ آجایئے۔اور وہ جو کچھ کان میں پھونک رہی ہے۔اس سے پھول نہ جایئے۔ہاں بے شک یہ ہوسکتا ہے کہ آپ شاعر یا بہت بڑے شاعر ہوں۔لیکن اس طرح اس کا بھی مساوی امکان ہے کہ آپ معمولی شاعر، برے شاعر یا سرے سے شاعر ہی نہ ہوں۔اس لئے دانائی یہی ہے کہ آپ ابھی اپنے بارے میں کوئی قطعی رائے قائم نہ کریں۔

ذہن انسانی میں عمل ارتقا برابر جاری ہے۔ اور آپ کی موت کے سوڈیڑھ سو برس بعد بھی نقادان ادب کا ذہن اس سطح پر آجائے گا کہ وہ آپ کے متعلق فیصلہ کر سکیں۔ اس لئے سر دست دانش مندی یہی ہے کہ آپ گومگو میں رہیں۔ عقل کا مشورہ باون تولے پاؤ رتی کا ہے۔ اس کی معقولیت میں شک کرنا حماقت ہے۔ لیکن میں اس وقت اعراف میں بیٹھا ہوا ہوں، ایک طرف کھوکھلا انائے شعرانہ ہے، ایک طرف ٹھوس عقل سلیم۔ جب انا کی طرف سے ہوا آتی ہے تو اکڑ کر باون گز کا ہو جاتا ہوں اور جب عقل کی جانب سے ڈانٹ پڑتی ہے تو سکڑ کر بالشتیا بن جاتا ہوں۔ دو عملی میں ہمارا آشیاں ہے۔

۶۔ عشق بازی

ہوش آتے ہی اچھی صورتیں میری نگاہوں کو اپنی طرف کھینچنے لگی تھیں۔ اور یہ شعر سب سے زیادہ مجھ پر صادق آتا ہے کہ،

ہوئے جوان، تو مرنے لگے حسینوں پر
ہمیں تو موت، ہی آئی شباب کے بدلے

یہ سچ ہے کہ عشق فطرت کا بہت بڑا فریب ہے۔ جو اس لئے دیا جاتا ہے کہ انسان، افزائش نسل کے توسط سے موت کے مقابلے میں حیات پیدا کرتا رہے۔ اپنے وجود میں کمی اور آبادی کے تن وتوش میں اضافہ کرے۔ اپنی جوانی گھالے۔ اور فطرت کے بچوں کو اپنا بچہ سمجھ کر پالے۔ اپنا جوہر گھٹائے دنیا کی رونق بڑھائے، اور جب تک جوان رہے۔

مرا مہر سیہ چشماں، ز سر بیروں نہ خواہد شد
قضائے آسمانست ایں ودیگر گوں نہ خواہد شد

کے نعرے لگاتا رہے اور پھر مرتے دم تک شیرہ ٹپکتی ہوئی جلیبی کی طرح پڑا رہے۔ لیکن یہ بات بہت دیر میں سمجھ میں آئی کہ کل دور عشق میں رہتا تھا اور اب عہد عقل

میں اپنے پر ہنستا ہوں۔لیکن اب کیا فائدہ جب چڑیاں چگ گئیں کھیت، چالاک فطرت دھوکا دے کر مسکرا رہی ہے۔اور میں ایک فریب خوردہ انسان کی مانند جھینپا ہوا بیٹھا ہوں:۔

پر جھڑ گئے ،دم گر گئی،پھرتے ہیں لنڈورے

لیکن ماہ رخوں کی ناشکری اور سلونیوں کی نمک حرامی ہوگی کہ اگر میں اس بات کا اعتراف نہ کروں کہ ان کے عشق کے بغیر میں آدمی نہیں بن سکتا تھا۔میرا تمام کلام اور بالخصوص شاعری کی کج کلاہی انہیں متوالیوں اور مدھ مانیوں کی جوتیوں کا تصدق ہے۔ اگر ان کی نظروں کے بان میرے دل کو چھلنی کر کے، گداختگی نہ پیدا کر دیتے تو خدا کی قسم مرتے دم تک میں گنگوہ شریف کا مولوی عبدالصمد بنا رہتا۔

میں نے کوئے بتاں میں جس قدر بھی اپنی صحت ،جوانی، دولت اور زندگانی مٹھیاں بھر بھر کر لوٹائی ہے۔اس سے کہیں زیادہ دینی کمائی کر چکا ہوں۔اور مکھڑوں کے خدوخال چن چن کر میں نے اپنے گردوپیش اس قدر عظیم سرمایا جمع کرلیا ہے۔جسے آج تک گھر بیٹھے کھا رہا ہوں۔اور مرتے دم تک کھاتا رہوں گا۔

شادم از زندگی خویش کہ کارے کردم

رب شباب کی قسم آج بھی جب کبھی کسی نوکیلے مکھڑے کو دیکھ لیتا ہوں، وہ مکھڑا انی بن کر کچھ سے میرے سینے میں چبھ جاتا ہے۔

جانتا ہوں کہ بدتوفیق صالحین میری بات سن کر منہ بنالیں گے۔لیکن میں ڈنکے کی چوٹ کہتا ہوں کہ ہر چند میرے بال سفید ہو چکے ہیں۔لیکن بحمداللہ میرا نامہ اعمال ابھی تک سیاہ ہے۔اور آج بھی یہی کہہ رہا ہوں کہ:

گر چہ پیرم تو چناں تنگ در آغوشم گیر
کہ سحر گہ ،زکنار تو، جواں بر خیزم

۳۔علم طلبی عشق کی طرح، مجھ کو حصول علم کو چسکا بھی لڑکپن سے ہی تھا۔میرے

باپ چاہتے تھے کہ مجھ کو گھر کے مکتب میں ہی پڑھائیں اور نظروں سے اوجھل نہ ہونے دیں۔ لیکن میں نے اتنا مہنا مت مچایا کہ وہ مجھ کو باہر بھیج کر پڑھانے پر مجبور ہو گئے۔ اگر میرے دل میں علم کی لگن نہ ہوتی تو دوسرے رئیس زادوں کی طرح جاہل رہ جاتا۔ میں بچپن میں کوئی کھیل نہیں کھیلا۔ اور ہوش آتے ہی کتابوں کا مطالعہ شروع کر دیا۔

جوانی کی اندھیری برساتوں میں بھی ہر چند میری جھنجھاتی راتیں، سارنگیوں کی رؤں رؤں، مجیروں کی کھن کھن، طبلوں کی ٹکوروں اور گھنی زلفوں کی چھاؤں میں پینگ لیا کرتی تھی۔ لیکن میرے دن کتابوں کے مطالعے، شعروں کی تخلیق اور علماء و شعراء کی صحبتوں میں بسر ہوا کرتے تھے۔ اور جب دن کے وقت میرے من چلے دوست راہش و رنگ کی دعوت دیتے تھے تو میں ان سے کہا کرتا تھا کہ یاروں کا تو یہ اٹل اصول ہے کہ دن کو سولجر (سپاہی) بنے رہو۔ اور رات کو لوفر (اوباش)۔

میرے دل میں، جوانی آتے ہی، دین سے بغاوت کا میلان پیدا ہو گیا تھا۔ اور میرے راسخ العقیدہ باپ تک جب یہ خبر پہنچی تھی کہ میں بعض مسلمات کا مذاق اڑاتا ہوں تو انہوں نے میرے منہ پر تھپڑ مار کر فرمایا تھا کہ مجھے اس کا خوف پیدا ہو گیا ہے کہ تو، آگے چل کر گم راہ ہو جائے گا۔ ''اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ میرے باپ کا خیال درست نکلا، اور میں ''گم راہ'' ہو گیا اسے فضل کرتے نہیں لگتی بار)۔

ستاروں کے مشاہدے سے میرے تفکر کی ابتدا ہوئی تھی۔ تارے دیکھ کر میں بار بار سوچتا تھا کہ یہ میں کیا ان کی چمک دمک کا راز کیا ہے انہیں کس نے بنایا ہے اور کیوں بنایا ہے۔ شاید یہ تارے ہی ہیں جو سب سے پہلے بچوں کا دل موہ کر ان سے پوچھتے ہیں ننھے بھلا بتاؤ تو ہم کیا ہیں۔

جب سن آگے بڑھا فکر کا میدان بھی وسیع ہو گیا، پورے نظام شمسی پر نظر پڑنے لگی۔ اور اس بات کی لگن لگ گئی کہ علت العلل کا سراغ لگاؤں۔ ذات و صفات کے تمام

مسائل کو الٹوں پلٹوں، پگھلاؤں، کھرچوں، کریدوں، ناپوں، تولوں، جانچوں، پرکھوں، ٹھونکوں، بجاؤں، کوٹوں، چھانوں، پھٹکوں، اساؤں، چھوؤں، چکھوں، سونگھوں، بلواؤں، سنوں اور دیکھوں۔

مجھے خوب یاد ہے کہ اندھیری راتوں کو جب تاروں بھرے آسمان کی طرف نگاہ اٹھاتا تھا تو بار بار یہ سوال پیدا دل کو برمانے لگتا تھا کہ ارے یہ سب کچھ کیا ہے؟ یہ سب کچھ ارادی ہے کہ اتفاقی؟ یہ سب کچھ کسی حکیم و عادل کا کارخانہ ہے یا کسی اندھی توانائی کی فقط اچھل کود؟ اور یہ سب آخر ہے کیوں اس کی پشت پر آخر کوئی مقصد ہے کہ نہیں؟ اور اپنے رب کی موجودگی میں یہ بے چارہ مرطوب اس قدر پائے مال و معتوب کیوں ہے؟

میں نے ان مسائل پر غور کیا بار بار غور کیا، دم گھٹنے کی حد تک غور کیا..... اس کوچے میں برسوں پاپڑ بیلے کتابوں پر کتابیں پڑھیں ہندو مسلم یہودی، زرتشتی، بدھی، جینی اور عیسائی علماء کے سامنے برسوں دیوزہ گروں کے مانند کاسہ گدائی بڑھایا، علم کی بھیک مانگی، آگاہی کے واسطے ان کے آستانوں پر ناک رگڑی، گڑگڑا گڑگڑا کر، دامن پھیلایا لیکن کچھ بھی حاصل نہ ہو سکا۔

اس کے بعد مدعیان معرفت یعنی صوفیا و مشائخ کے دروازے کھٹکھٹائے ان کی جوتیاں سیدھی کیں لیکن چند اشراقی اشاروں کے سوا کچھ بھی پلے نہ پڑا۔ اور وہ اشارے بھی کیا سارے کے سارے وجدانی فریب۔

اس طرح عمر گزرتی اور جوانی ڈھلتی گئی اور آخر کار پیری آ گئی۔ پیری آتے ہی سر کے بال گر گئے اور کھوپڑی میں آگاہی کا اکھوا پھوٹ آیا نا توانی نے توانائی پیدا کر دی، اور بالآخر میں نے علم کے قلعے کو فتح کر لیا۔ آپ سمجھے کیوں کر؟ یعنی مجھے اس بات کا پورا پورا علم حاصل ہو گیا کہ میں جاہل نرا کاجل اور بے پناہ جاہل ہوں۔

بندہ نواز ارتقاء کی اس ابتدائی طفلانہ و تاریک منزل میں ایک نیم وحشی انسان کو اپنے جہل کا پتا چل جانا ہی سب سے بڑی سعادت ہے۔

سن ہو گئے کان تو سماعت پائی
آنکھیں پتھرائیں تو بصارت پائی
جب علم کے سب کھنگال ڈالے قلزم
تب ' دولت عرفان جہالت پائی

گواہ رہنا اے زمین و آسمان کہ میں نے علم کو ڈھونڈا لیکن پایا نہیں میں جاہل پیدا ہوا تھا۔ اور جاہل ہی مروں گا۔ تجھ پر ہزار افسوس اے ''خلیفہ رحمٰن'' اے ظلوم جہول انسان!!

۴۔ انسان دوستی..... (الف) ہاں انسان کرہ ارض کی جان..... انسان دشمنی' عظیم عددان..... حب انسانی' عین ایمان' انسان کا چہرہ' گیتا اور قرآن۔ اور لا سلطان الا الانسان!

اے مجھے ''کافر باللہ'' کہنے والو تم کو معلوم نہیں کہ کافر مومن بالانسان ہے۔ خود تمہارا دین کہتا ہے کہ اللہ کی رحمت' سے یہ بعید نہیں کہ وہ کافروں کو معاف کر دے' لیکن حقوق العباد کے پامال کرنے والے یعنی کافر بالانسان کی بخشش کے بارے میں' خدا نے اپنا اقتدار بندوں کو بخش دیا ہے۔ اور جب تک مظلوم' اپنے ظالم کو معاف نہیں کرے گا اسے بخشا نہیں جائے گا۔ کافر باللہ کے لیے تو۔

شنیدم کہ درد وز امید و بیم
بداں را ' بینکاں بہ بخشد کریم

کا سہارا موجود ہے مگر کافر بالانسان کے واسطے' جب تک کہ انسان اس کو معاف نہ کر دے' بخشش کا کوئی امکان ہی نہیں ہے۔ دوستو' انسان دوستی' کوئی ہنسی کھیل نہیں۔ اس کوچے میں ہر قدم پر خون تھوکنا پڑتا ہے۔

رہ رو راہ محبت کا خدا حافظ ہے
اس میں دو چار بہت سخت مقام آتے ہیں

تمہاری نیت مجاہدات نفس کے سامنے حور و قصور اور کوثر و طہور کے پرے جمے ہوئے ہیں۔ لیکن میرے جذبہ حب انسانی کی گلی حوران مقصورات کے خیموں کی طرف نہیں مڑتی، براہ راست دار کی طرف لے جاتی ہے۔

جی ہاں میں خود اپنے تجربوں کی بنا پر اس امر کا اعتراف کرتا ہوں کہ عشق شہوانی[1] بھی ایک ایسی بلائے بد ہے کہ انسان بلبلا اٹھتا ہے اور کہتا پھرتا ہے۔

وہ نہیں بھولتا جدھر جاؤں
ہائے میں کیا کروں کدھر جاؤں

اور ایک عشق کی ماری نعرہ زن ہوتی ہے۔

جو سکھی ہیں جانتی کہ پیت[2] کرے دکھ ہوئے
نگر ڈھنڈورا پیٹتی کہ پیت کرے نا کوئے

لیکن عشق شہوانی اور حب انسانی کے شدائد کو جب تولا جائے تو عشق کا پلا آسمان سے باتیں کرنے لگتا ہے۔ اور حب کا پلہ زمین سے جنبش نہیں کرتا۔ عشق ایک آنی تشنج ہے جسم کا۔ اور حب ایک ابدی اضطراب ہے روح کا..... عشق کا تعلق ہوتا ہے صرف ایک ذات یعنی محبوب سے اور حب کا تعلق ہوتا ہے۔

---

[1] شہوانی کے علاوہ عشق اور کچھ ہوتا ہی نہیں ہے۔ اور جسے ''پاک عشق کہا جاتا ہے وہ بھی جذبہ شہوانی کا ایک ایسا شدید تموج ہوتا ہے کہ آدمی سن ہو کر رہ جاتا ہے۔ اور کچھ کر ہی نہیں سکتا۔ [2] اے سکھی اگر پہلے سے یہ معلوم ہوتا کہ عشق کرنے سے دکھ ہوتا ہے تو میں سارے شہر میں یہ ڈھنڈورا پیٹ دیتی کہ کوئی عشق نہ کرے (میرا بائی)۔

روئے زمین کے اربوں انسانوں سے..... عاشق اپنی جنسی تسکین چاہتا ہے۔ اور محبّ انسان، تمام دنیا کے افراد کی تسکین کا طلب گار بھی ہوتا ہے۔ عاشق پر جب معشوق مہربان ہو جاتا ہے تو اس کے دل کی آگ بجھ جاتی ہے لیکن محبّ انسانیت کو روزگار مہربان ہو کر جب کسی نعمت خاص سے نوازتا ہے تو وہ چاروں طرف گھبرا کر

دیکھتا ہے کہ دوسروں تک بھی وہ نعمت پہنچی کہ نہیں اور جب اوروں کو اس سے محروم دیکھتا ہے تو عین محل شکر میں وہ شکایت کرتا ہے اور چیخ اٹھتا ہے:

صد رفیق و صد ہمدم پر شکستہ و دل تنگ
داورا نہ می زیبد ' بال و پر بمن تنہا

اور خوب کان کھول کر یہ بھی سن لیجیے کہ عشق کا عقاب اڑتا ہے قیس وفرہاد کے سروں پر' اور حب انسانی کا قرآن نازل ہوتا ہے رحمۃ اللعالمین کے دھڑکتے ہوئے دل پر بہیں تفاوت رہ' از کجا ست تا بکجا۔ پہلے میں عشق کے موذی مرض میں گرفتار تھا اب حب انسانی کے مہلک مرض کا صید زبوں ہوں کل محبوب کی مفارقت میں تکیے بھگویا کرتا تھا۔ اب انسان کے مصائب پر رویا کرتا ہوں۔

ہر چند مستقبل انسانی بے حد روشن ہے۔ اور مجھ کو یقین کامل ہے کہ یہ دوزخ زمین ایک دن جنت بن جائے گی۔ یہ درندہ آدمی انسان کے مرتبے پر فائز ہو کر دم لے گا' نہ عدالتیں ہی رہیں گی۔ نہ فوجیں نہ پولیس نہ اسلحہ سازی کے کارخانے پیری' مستقل جوانی بن جائے گی۔ اور موت کا گلا گھونٹ دیا جائے گا زندگی کی پیشانی پر حیات ابدی کا تاج رکھ دیا جائے گا شمس وقمر ہمارے پاؤں چومیں گے۔ ہم مشتری میں اگر ناشتہ کریں گے تو زہرا میں رات کا کھانا کھائیں گے۔ اور قوائے کائنات خدمت گاروں کے مانند ہمارے برآمدوں میں کھڑے رہا کریں گے لیکن اس میں لگیں گے بھی لاکھوں سال جب کہ میری ہڈیاں تک باقی نہیں رہیں گی۔

اس تصور سے جو ایک دن ایک ٹھوس حقیقت بننے والا ہے۔ ہر چند میرے دل کو بڑی تسکین ہوتی ہے پھر بھی یہ خلش رہ جاتی ہے کہ:

م نے مانا کہ کل وہ آئیں گے
عقل حیراں ہے' آج کیا کیجیے

آج تو انسان اس قدر آفات میں گھرا ہوا ہے کہ دل چٹکیوں میں ملا کرتا ہے۔

چھوٹے کنبے والے کے مصائب بھی چھوٹے ہوتے ہیں۔ اور کنبہ جس قدر بڑا ہوتا جاتا ہے‘اس کے مصائب میں بھی اضافہ ہوتا رہتا ہے‘اور مجھ نامراد کا کنبہ تو ساری دنیا کا احاطہ کیے ہوئے ہے غور فرمائیے کہ میرے مصائب کیا ہوں گے۔

جب کسی مفلس کے گھر کے چولہے میں آگ روشن نہیں ہوتی میرے سینے سے دھواں اٹھنے لگتا ہے۔ جب کسی یتیم کی پسلیاں نکلی نظر آتی ہیں۔میرے بدن میں خود اپنی ہڈیاں چبھنے لگتی ہیں‘ جب کسی گوشے سے رونے کی آواز آتی ہے میری کم بخت آنکھیں آنسو برسانے لگتی ہیں‘ اور جب کسی گھر سے بھی جنازہ نکلتا ہے تو ایسا محسوس ہونے لگتا ہے کہ وہ جنازہ خود میرے ہی گھر سے نکل رہا ہے۔

ہر چند امریکہ ظالم ہے‘اور ویٹ نام مظلوم‘لیکن ویٹ نام کے مظلوم شہیدوں پر ہی نہیں امریکہ کے ظالم مقتولوں پر بھی ماتم کرنے پر مجبور ہو جاتا ہوں۔اللہ نہ کرے کہ کسی بد بخت کے سینے میں ابوالانسان کا دل دھڑکنے لگے۔

خنجر چلے کسی پہ تڑپتے ہیں ہم امیر
سارے جہاں کا درد‘ ہمارے جگر میں ہے

(ب)اس دردمندی کا دوسرا پہلو بھی ملاحظہ فرمائیے۔

یہ ایک ناقابل ابطال حقیقت ہے کہ انفس و آفاق یعنی تمام ذی حیات وغیر ذی حیات واحد العناصر‘واحد الخمیر‘واحد القوام‘واحد العلت‘واحد النسل‘اور واحد الاصل ہیں۔اور اس طرح واحد النسل ہیں جس طرح پلاسٹک کے کھلونے اور پلاسٹک کے پھول ہر چند اسماء اشکال اور اجسام کے اعتبار سے تمام کھلونے اور تمام پھول‘ ایک دوسرے سے قطعی طور پر مختلف و متضاد نظر آتے ہیں لیکن اگر انہیں پگھلا دیں گے تو پلاسٹک کے سوا اور کچھ باقی ہی نہیں رہ جائے گا۔

اور سب سے بڑی قیامت تو یہ ہے کہ جاہل ہوس پرور اور لئیم سیاست نے اپنے شیطانی جذبات کی آسودگی کی خاطر انفس و آفاق کی اس وحدت کو ایک دوسرے سے

نفرت کرنے والی کثرت میں تبدیل کر کے رکھ دیا ہے۔

فوجی درندگی کے بل بوتے پر فتنے برپا کرنے والے ارباب سیاست کا یہ خیال ہے کہ دانائی اسی میں ہے کہ نادانوں کو' ثقافت' لسان' اوطان اور ادیان میں الجھا کر چھوٹی چھوٹی برسر جنگ ٹولیوں میں تقسیم کر دیا جائے۔ اور پھر بڑے اطمینان کے ساتھ ان پر فرماں روائی کی جائے۔

انہوں نے انتہائی بددیانتی کے ساتھ بین الاقوام کی ترکیب تراشی ہے اور نوع انسانی کو جو مشرق سے لے کر مغرب تک صرف ایک قوم ہے۔ زبانوں' وطنوں' دینوں اور رنگوں کی آویزشوں میں مبتلا کر کے پوری دنیا کو جہنم بنا رکھا ہے۔ ان ظالم مسخروں کو معلوم ہونا چاہیے کہ:

لفظ اقوام میں کوئی جان نہیں
اک نوع میں ہود وئی یہ امکان نہیں
جو مشرک یزداں ہے وہ ناداں ہے فقط
جو مشرک انساں ہے وہ انسان نہیں

لطف تو یہ ہے کہ وہ بانیان فساد' خود تو سلامتی کے گوشوں میں دبکے بیٹھے ہیں۔ اور روٹی کی خاطر اپنے بھائیوں کی جانیں لینے والی فوجوں کو للکار دیا ہے کہ وہ خون کی ہولی کھیلتے پھریں۔

منہ پیٹنے کی بات تو یہ ہے کہ ان روٹی کے مارے ہوئے اور حب وطن کے فریب کھائے ہوئے سپاہیوں کو جن کی کہنیوں سے ان کے بھائیوں کا تازہ خون ٹپک رہا ہے فیلڈ مارشل قومی ہیرو اور غازی اعظم جیسے خطابات مرحمت فرمائے جا رہے ہیں۔ جہالت کی لے اس قدر بڑھ چکی ہے کہ خود بڑے بڑے تعلیم یافتہ افراد بھی اس دھوکے میں آ چکے ہیں کہ ہم پاکستانی' ہندوستانی' افغانستانی' ترکستانی اور انگلستانی ہیں' اور اسی کے ساتھ ساتھ ہر فرد یہ سمجھتا ہے کہ میں ہندو ہوں' مسلمان ہوں' عیسائی ہوں زرتشتی

ہوں' یہودی ہوں لیکن ان سادہ لوحوں کے ذہنوں میں یہ تصور اجاگر ہی نہیں ہوتا کہ میں انسان ہوں سب سے پہلے انسان ہوں اور اس کے بعد کچھ اور۔

پروپیگنڈے کی طاقت تو دیکھیے کہ دین و ملک کے چکر میں آ کر ہم اپنی انسانیت کو قطعاً فراموش کر چکے ہیں' اور یہ دیکھ کر بڑی بے پایاں حیرت ہوتی ہے کہ انسانیت کی اس اکائی میں سے' اعداد کا یہ جرار لشکر کہاں سے نکل پڑا' عینیت کے اس چشمہ شیریں میں یہ غیریت کا زہر کس نے ملا دیا' اور اس کعبہ وحدت میں' یہ خنزیر شرک کیوں کر داخل ہو گیا..... بسوخت عقل زحیرت' کہ ایں چہ بوالعجبی!

(ج) اب دیکھیے تیسرا رخ..... سرمایہ داری کا نظام' ایک زبردست تن وتوش کی جونک کے مانند' عامۃ الناس کی گردن میں منہ گارے بڑے مزے لے لے کر ان کا خون چوس رہا ہے۔

اس منحوس نظام نے آنکھوں سے مروت لہجے سے نرمی خیالات سے ہمدردی اور دلوں کی دھڑکنیں چھین لی ہیں' اور ہوس کاروں کو ٹھوس چٹانوں میں تبدیل کر کے رکھ دیا ہے۔

یقین فرمائیے کہ جب تک آدمی حجاج' ہلاکو' چنگیز' نادر' نیرو' ابن زیاد اور یزید کے ہاتھ پر بیعت نہیں کر لیتا سرمایہ دار صنعت کار بن ہی نہیں سکتا۔

اس فریب میں نہ آ جائیے گا کہ مزدوروں' کسانوں' مفلسوں اور اس قبیل کے کروڑوں انسانوں پر جو بیت رہی ہے اس سے وہ بے خبر ہیں۔ جی نہیں ان کو سب کی دردمندیوں کا علم ہے' اور یہ بھی سن لیجیے کہ وہ اس علم سے' ترس کھانے کے بدلے' الٹے لطف اندوز ہو رہے ہیں۔

جب ان کے دسترخوان پر مرغ و ماہی کی قابیں چنی جاتی ہیں تو وہ اس تصور کی چٹنی چاٹ چاٹ کر اپنے کھانوں کی لذت اور بھی بڑھا لیتے ہیں کہ اس وقت لاکھوں آدمی روکھے سوکھے ٹکڑے کھا رہے ہوں گے اور راتوں کو جب وہ اپنے گرم ریشمی لحافوں میں دبک کر یہ سوچتے ہیں کہ اس وقت اللہ کے لاکھوں بندے' فٹ پاتھوں پر سردی

سے اکڑ رہے ہوں گے، تو ان کے لحافوں کی گرمی میں اضافہ ہو جاتا ہے اور اس وقت وہ ناداروں کو موٹے جھوٹے کپڑے پہنے دیکھتے ہیں، تو ان کے حریر و پرنیاں کے لباس کی نرمی ہزار چند بڑھ جاتی ہے لیکن روزگار کی ستم ظریفی دیکھیے کہ اس سے ان کی نیندیں بھی حرام ہو کر رہ گئی ہیں وہ اپنے بینکوں میں رکھے ہوئے سکوں اور اپنے کارخانوں کی چلتی ہوئی مشینوں کے ناقابل برداشت وزن کے نیچے دبے پڑے ہوتے ہیں بری طرح کراہ رہے ہیں۔ ایک بار دہلی کے ایک بہت بڑے سرمایہ دار و صنعت کار نے اپنے چاندی کے سے سفید بالوں کو نوچ نوچ کر مجھ سے کہا تھا جوش صاحب آپ کوئی (شاعر) ہیں کویوں کے سر پر بھگوان کا ہاتھ ہوتا ہے آپ میرے مر جانے کی دعا کریں، اور جب میں نے ان سے یہ کہا تھا کہ اس ہندوستان کے کروڑوں آدمی اس آرزو میں گھلے جا رہے ہیں کہ آپ کی دولت کا دسواں حصہ ہی ان کو مل جائے تو انہوں نے کہا تھا کہ ان لوگوں کو میری بپتا نہیں معلوم، نہیں تو وہ میرا سا بننے کا کبھی خواب بھی نہ دیکھتے۔ اور جب میں نے ان سے یہ پوچھا تھا کہ آپ کی بپتا کیا ہے تو آنکھوں میں آنسو بھر کے انہوں نے جواب دیا تھا کہ جوش صاحب آپ دیکھتے ہیں کہ میرے چاروں طرف سونے چاندی کے پہاڑ کھڑے ہوئے ہیں، مگر من کو چین نہیں ہر روز جب صبح کو جاگتا ہوں تو میرا دل گڑگڑا گڑگڑا کر مجھ سے کہتا ہے کہ لالہ جی آج دو پیسے اور کما لو.....!!

دیکھا آپ نے اس فراوانی دولت کا انجام۔ اور افراط زر کی ناداری؟

زر دار کا خناس نہیں جاتا ہے
ہر آن کا وسواس نہیں جاتا ہے
ہوتا ہے جو شدت ہوس پر مبنی
تا مرگ وہ افلاس نہیں جاتا ہے

ہاں بہت جلد وہ ساعت آنے والی ہے کہ سوشلزم کے تند جھونکے ان کے چراغوں

کو بجھا کر آوازہ بلند کریں گے:

دیدی؟ کہ خون ناحق پروانہ ..... شمع را
چنداں اماں نہ داد کہ شب را ' سحر کند!

(د) اب چوتھا رخ بھی ملاحظہ فرمائیے..... اور وہ ہے موت کا یقین کامل۔

چو ' پردہ دار' بشمشیری زند ہمہ را
کسے مقیم حریم حرم نہ خواہد ماند

گدا سے لے کر شاہ تک اور خرابات سے لے کا خانقاہ تک دنیا کے ہر سر اور ہر در پر موت کا خونی گدھ منڈلا رہا ہے۔ اور مہر کوچے سے رام رام ست ہے اور انا للہ وانا الیہ راجعون کی صدائیں چلی آ رہی ہیں۔ انسان بنفس مطمینہ کا طلب گار ہے، تسکین خاطر پر جان دیتا ہے۔ لیکن اس کو یہ دولت کہیں بھی نہیں ملتی اور جب اس سے کہا جاتا ہے کہ:

بقدر ہر سکوں' راحت بود' بنگر مرانب را
دویدن' رفتن' استادن' نشستن' خفتن و مردن

تو اس کی سانس رکنے لگتی ہے۔ اور نبضیں ڈوبنے کے قریب ہو جاتی ہیں۔ اور جب اس کے کانوں میں یہ آواز بھی گونج اٹھتی ہے:

اب تو گھبرا کے یہ کہتے ہیں کہ مر جائیں گے
مر کے بھی چین نہ پایا تو کدھر جائیں گے؟

تو وہ زندہ درگور ہو جاتا ہے۔

ایسی زندگی کس کام کی جس کے ایک سیکنڈ کے کروڑویں حصے میں بھی یہ اطمینان نہیں ہوتا کہ ابھی ہم کو موت نہیں آئے گی۔

موت ایسی حیات سے اچھی۔

(س) اور ان تمام بے شمار آفات کے ساتھ ساتھ..... اللہ اللہ یہ نوجوان بیواؤں کی ٹوٹتی چوڑیاں یتیم بچوں کی یہ کچھ ڈھونڈنے والی آنکھیں' نادار بیماروں کی یہ ابھری

ہوئی پسلیاں' دولھاؤں کے زانوں پر یہ چوتھی کہ دلھنوں کی آخری ہچکیاں..... براتوں کی یہ بھری ہوئی ڈوبتی کشتیاں عاشقوں کے سامنے معشوقوں کی یہ الٹتی پتلیاں ..... ماؤں کے آغوش میں یہ پھول سے بچوں کے ڈھلتے ہوئے منکے..... اور بوڑھے باپوں کے کاندھوں پر یہ جوانا مرگ بیٹوں کے مچلتے جنازے.....۔

اور اس کے دوش بدوش یہ جراثیم یہ بچھو یہ سانپ' یہ بستیوں کو بھسم کر دینے والی آتش زدگیاں یہ قحط' یہ کال' یہ سیلاب' یہ طوفان' یہ وبائیں۔ یہ زمہریری و جہنمی ہوائیں۔ یہ آتش فشاں پہاڑ اور شہروں کو الٹ پلٹ کر کے رکھ دینے والے یہ بھیانک زلزلے' الامان والحفیظ..... فطری طور پر' دل میں یہ سوال بار بار مچلتا ہے کہ باوا ان آفات ارضی و سماوی کی پشت پر کوئی معقول برہان اور کوئی حکیم نہ عادل اور رحمٰن کارفرما ہے کہ نہیں؟ ارے اس زمین اور اس آسمان پر ہے کوئی جو دکھیا انسان قدرت کے سوتیلے بیٹے' انسان کو اپنی پناہ میں لے لے؟ یہ گڑگڑاتی آواز' لاکھوں برس سے اس بوڑھے آسمان کی بوسیدہ ڈاٹ کے نیچے گونج رہی ہے لیکن ایک ابدی سناٹا چھایا ہوا ہے کسی طرف سے بھی کوئی آواز نہیں آتی۔

میر درد نے تڑپ کر بادصبا سے کہا تھا۔

یہی احوال درد کا کہیو
گر صبا کوئے یار میں گزرے
کون سی رات آن ملیے گا
دن بہت انتظار میں گزرے

میرا بھی یہی عالم ہے مدت سے کسی مددگار کا انتظار کر رہا ہوں لیکن کسی مددگار کی چاپ سنائی نہیں دے رہی ہے قدموں کی چاپ تو بڑی چیز ہے کوئی آواز پر آواز بھی نہیں دے رہا ہوں اے اتھاہ سناٹے ہاں تو ضرور کچھ بول رہا ہے اور میں سن رہا ہوں۔ لیکن اسے زبان تک لانے کی جرات نہیں کر سکتا..... احمقانہ شہادت پر میں تیار نہیں۔

اور گلا پھاڑ پھاڑ کر یہ چیخ رہا ہوں کہ

ایں مپرس سید کہ ہر غالب ناکام چہ رفت
می نواں گفت کہ ایں بندہ خداوند نداشت

ارے میں نامراد اپنا دردِ دل کس سے کہوں؟

داوری دارم بسے ، یارب کراد اور کنم!

☆☆☆

www.IqbalCyberLibrary.Net
All rights reserved.
©2002-2006

بنام قوت وحیات!

میرا حاشیہ ولادت

میں اس بوند بھر زندگی کو بھوگنے اور اس بظاہر رنگین و بباطن خون آلودہ زندان کون و فساد میں اوبھنے کے واسطے کب لایا گیا ہوں اس امر کو صحت کے ساتھ بیان نہیں کر سکتا ۔اس لیے کہ میرے خاندان میں بچوں کی تاریخ ولادت کے درج کرنے کا رواج ہی نہیں تھا

البتہ میری دادی جان نے جو خاندان کی مورخ تھیں مجھ سے میری ولادت کا جو سن بتایا تھا وہ سن عیسوی کے حساب سے سنہ ۱۸۹۶ء تھا یا سنہ ۱۸۹۸ء یہ بھی یاد نہیں رہا۔

بہر حال اپنی عمر کو دو برس بڑھا دینے میں نقصان ہی کیا ہے ۔اس لیے آپ یہ سمجھ لیں کہ میں سنہ ۱۸۹۶ء میں پیدا ہوا تھا..... (دو برس اور بوڑھا ہو گیا ہو جانے دیجیے' جوتی کی نوک سے)۔

البتہ یہ بخوبی یاد ہے کہ دادی نے فرمایا تھا کہ بیٹا تو صبح چار بجے پیدا ہوا تھا۔

میرا وطن

آم کے باغوں کی رومانی اور گھنیری چھاؤں میں جھومتا بور کی بوئے مستانہ سے مہکتا کوئلوں کی کوکو اور پپیہوں کی پی ہو پی ہو سے چہکتا ملیح آباد ہندوستان کی تہذیبی جنت یعنی لکھنو سے فقط تیرہ میل کی مسافت پر واقع ہے۔

اشاید یہی علت ہو میری سحر پرستی کی۔

یہ خالص پٹھانوں کی بستی ہے' جس کے ایک گوشے میں ہم لوگ یعنی درہ خیبر سے آئے ہوئے آفریدی اور دوسرے گوشے میں قندھار سے آئے ہوئے قندھاری آباد ہیں۔

ہندوستان میں آ کر بھی اور جوار لکھنو میں رہنے کے باوصف ہم نے اپنی جنگ جوئی کی عادت نہیں چھوڑی اور آفریدیوں اور قندھاریوں کے مابین' ایک مدت دراز

تک تلوار چلتی رہی۔ اور فرنگیوں نے آ کر جب تلوار چھین لی تو لٹھ پونگا ہونے لگا۔

ہندوستان آ کر اور خصوصاً لکھنو کی تہذیب سے متاثر ہو کر ہم لوگ ایک عجیب گنگا جمنی قوم بن گئے۔

ہمارے خون میں درہ خیبر کی شعلہ بار دوپہر مچلتی رہی اور ہمارے سروں پر اودھ کی سلونی شام گل باریاں کرنے لگی..... اور ملیح آباد لکھنو کی شائستگی و تہذیب اور قبائلی علاقوں کی بربریت و وحشت کا ایک عجیب نقطۂ اتصال بن گیا۔

ہمارے یہاں ایک طرف تو لکھنو کی دپلی ٹوپیاں ململ اور ریشم کے کڑھے ہوتے شربتی انگرکھے، سلمیٰ ستاری کی رضائیاں مخمل کے لحاف چوک کا عطر قنوج کا تیل چھلیل اور مشروئے کے پایجامے راہ پا گئے۔ اور پتنگ بازیاں مرغ بازیاں بٹیر بازیاں اور ان کی پالیاں ہونے لگیں..... اور ہم نے اسلام علیکم کے بجائے آداب تسلیمات کورنش، اور بندگی کو اختیار کر لیا۔ اور اس کے ساتھ ساتھ بہت بازیاں اور مشاعرے بھی ہونے لگے۔ اور صحت زبان کے تصور نے بھی آنکھیں کھول دیں.....

اور دوسری طرف اللہ دے اور بندہ لے قسم کے ہنگامے بھی جارے رہے اور آئے دن فوج داریاں اور خوں خواریاں بھی برابر ہوتی رہیں۔

---

۱ ہم لوگ آفریدی آدم خیل اور آدم خیلوں کی ایک شاخ ''علی خیل'' سے تعلق رکھتے ہیں۔

مدتوں تک ہمارا یہ عالم رہا کہ اگر کسی راہ رو کو اتفاقاً کھانسی آ جاتی تھی اور وہ کسی کے دروازے کے سامنے تھوک دیتا تھا تو صاحب خانہ صاحب لٹھ لے کر گلی میں آ جاتے تھے کہ خان صاحب آپ ہمارے دروازے پر تھوک رہے ہیں اور تھوکنے والے خان صاحب اکڑ کر یہ جواب دیتے تھے کہ جب نہیں تھوکا تھا تو اب تھوک رہے ہیں آخ تھو آخ تھو اور دونوں کے درمیان بڑے زور شور سے لٹھ چلنے لگتا۔ اور اگر کسی کی شادی بیاہ میں حریف گروہ آمنے سامنے کھٹوں[1] پر بیٹھے حقہ پیتے تھے۔ تو ان میں سے جب ایک

گروہ کا آدمی کڑ کڑ کڑ کڑ کڑ اک کی آواز نکال کر حقہ پیتا تھا تو دوسرے گروہ کے تمام آدمی اس کو اعلان جنگ سمجھ کر اسسے بھی کہیں زیادہ زور سے کڑ کڑ کڑ کڑ کڑ کڑ اک کراک کڑاک کی آوازیں نکال کر اس قدر زور سے حقے پیتے تھے کہ چلموں سے آنچیں نکل آتی تھیں اور اس ضدم ضدا کا نتیجہ یہ برآمد ہوتا تھا کہ پل بھر میں فریقین کے سر لہولہان ہو کر رہ جاتے تھے۔

لکھنو کے کمشنر یا گورنر نے ملیح آباد کے باب میں یہ جملہ نہایت ہی خوب لکھا تھا کہ ملیح آباد درہ خیبر کا ایک ایسا جزو ہے جس کا ہندوستان سے ابھی تک الحاق نہیں ہو سکا ہے۔

میرے خاندان کے انحطاط کے بعد ملیح آباد کی کمر ٹوٹ کر رہ گئی ہے تینوں ڈیوڑھیوں[۲] میں سے اب ایک ڈیوڑھی بھی باقی نہیں رہی ہے.....اور ملیح آبادی کی دھاک دم توڑ چکی ہے۔

پھر بھی میرے ملیح آباد کے تیور ابھی تک کلیۃً بجھنے نہیں پا رہے ہیں۔ ہر چند زمینداری اور تعلقہ داری کی تمسیخ فضا پر ایک عبرت ناک سناٹے کی طرح چھائی ہوئی ہے۔ مگر لوگوں میں پھٹھولی کا دم خم اور سپہ گری کا طنطنہ آج تک باقی ہے۔

اب ملیح آباد کی حالت لکھنو کے ان میر صاحب کی سی ہے جو شباب میں اس قدر خوبرو اور گھبرو تھے کہ بڑی بڑی نک چڑھی پری جمالوں تک کے غرور جمال کی پنڈلیاں ان کے روبرو کانپنے لگتی تھیں۔

---

[۱] اونچی اور چوڑی چارپائی [۲] میرے باپ اور میرے دونوں چچاؤں کی ڈیوڑھیاں۔

لیکن شباب ڈھلنے کے بعد جب وہ کسی شہر کی سرائے میں جا کر ٹھہرے اور برآمدے میں بیٹھ کر حقہ پینے لگے اور بھٹیاری کی لڑکیاں ان کے حقہ پینے کے انداز اور ہر کش پر ان کے گالوں کے نشیب و فراز پر ہنسنے لگیں تو انہوں نے جھلا کر کہا کہ ہنس لو

کالی کلوٹی چھوکریو، جی بھر کے ہنس لو اگر جوانی میں تم مجھے دیکھ لیتیں تو ہائے مرے اللہ ہائے مرے اللہ کہہ کر زمین پر بیٹھ جاتیں اور چھلچھلا نے لگتیں۔

اس طرح میر ملیح آبادی بھی زبان حال سے کہہ رہا ہے۔

یاراں کہ سرکشند زنخوت بر آسماں
بر آستان مے کدہ، شانم، نہ دیدہ اند
آں ہا کہ آؤ رند سبک در نظر مرا
بے چارگاں بکوئے مغانم نہ دیدہ اند!

میری حویلی کی اندرونی فضا

ہر طرف روشنی تھی رنگینی تھی چہل پہل تھی.....لونڈیاں، باندیاں، مامائیں اصیلیں مغلانیاں انائیں ردائیں کھلائیاں.....استانیاں، پنکھوں کی ڈوریاں کھینچنے اور راتوں کو کہانیاں سنانے والیاں چاروں طرف چلتی پھرتی اور ہنستی بولتی نظر آتی تھیں۔

اس مستقل آبادی کے علاوہ شریف گھرانوں کی غریب عورتیں بھی چندے اچھے دن گزارنے کے لیے آئے دن بطور مہمان آتیں ایک ایک دو دو مہینے رہتیں اور جب چلی جاتیں تو نئی مہمان عورتیں اُن کی جگہ آکر پر کر لیتی تھیں۔

بیرونی فضا

خدمت گاروں، رکاب داروں فراشوں سپاہیوں مولویوں، ماسٹروں مصاحبوں داستان گویوں منشیوں ضلع داروں، اور کارندوں کا ہر طرف ایک ہنگامہ سا برپا رہتا تھا۔

ان کے علاوہ بیرونی ولکھنوی شاعروں میں سے دو چار ہمیشہ بطور مہمان رہتے اور آئے دن مشاعرے ہوا کرتے تھے۔

اور ہم بچے مزا لیا کرتے تھے اپنے گھر کی تہنی سے جس کو ہم گنے کھلاتے تو وہ جھومتی اور جب ہم اس کو نوری انڈا کہہ کہہ کر چڑھاتے تھے تو وہ غصے کے مارے زنجیریں تڑانے لگتی تھی۔

میرا مجموعہ اضداد مزاج

کچھ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ بچپن میں تھا کیا؟ شعلہ تھا کہ شبنم حدید تھا کہ حریر نوک خار دار تھا کہ برگ گل خنجر تھا کہ ہلال، چنگیز خان کا علم بردار تھا کہ رحمۃ اللعالمین کا پرستار؟

ایک رخ سے تو میں اس بلا کا سریع الاشتعال تھا کہ ذرا ذرا سی بات میں جامے سے باہر ہو جاتا اور جو بھی سامنے آتا اس کو پھاڑ کھایا کرتا تھا۔

اور ایک رخ سے اس قدر بے پناہ صاحب مہر و وفا اور اس حد کا سرچشمہ لطف و عطا تھا کہ دوسروں کے واسطے بڑی سے بڑی قربانی پر آمادہ رہا کرتا تھا۔

میرے غیظ و غضب کا یہ عالم تھا کہ ساتھ کھیلنے والے بچوں سے اگر کسی بات پر بگڑ جاتا تو بید مار مار کر ان بے چاروں کی کھال کھینچ لیا کرتا تھا.....

اور جب ماسٹر بن کر اپنا پڑھا ہوا سبق ساتھ کے بچوں کو پڑھاتا اور دوسرے دن ان سے آموختہ دہراتا اور وہ دہرا نہ سکتے تو ان کو ڈنڈوں سے پیٹتا اور ان کے کاندھوں پر سوار ہو کر ان کو خچروں کی طرح اس قدر سرپٹ دوڑایا کرتا تھا کہ ان کی جانوں پر بن جایا کرتی تھی.....

اپنی چھوٹی بہن انیس جہاں سے تو میرے ایسے ایسے زبردست ہنگامے ہوا کرتے تھے کہ اللہ کی پناہ، وہ بھی بچپن میں میری طرح اس قدر بدمزاج زود غضب اور چڑچڑی تھی کہ ہنگام جنگ میں وہ میرا گریبان پکڑ کر چاک کر دیتی اور میں اس کے جھونٹے نوچ کر پھینک دیا کرتا تھا۔

---

[1] اور اب وہی انیس مجھے سب سے زیادہ چاہتی ہے۔ اور جب لکھنو جا کر اس سے ملتا ہوں تو وہ میرے گلے لگ کر جل تھل بھر دیتی ہے اور ٹکٹکی باندھ کر مجھ کو اس طرح دیر تک دیکھتی رہتی ہے کہ گویا اپنے دل کے زخموں میں ٹانکے لگا رہی ہے۔

ہر تیسرے چوتھے روز انیس[1] سے میری مہابھارت ہوا کرتی تھی اور انگنائی میں

کنویں کے گرد و پیش کا حصہ ہمارا اپنی پت کا میدان تھا۔ اور ایسا میدان کہ اگر مامائیں، اصیلیں آ کر ہمیں چھیڑا نہ دیتیں تو ہم ایک دوسرے کو ہلاک کر کے رکھ دیتے۔

میری ماں اپنے تمام بچوں میں سب سے زیادہ مجھ کو چاہتی تھیں، اور دودھ اور شہد کا پیالہ روز صبح کو مجھے اپنے ہات سے پلایا کرتی تھیں اور اگر کسی دن دودھ کے پیالے میں کوئی ذرہ نظر آ جاتا تھا تو میں کم بخت پیالے کو تڑ سے زمین پر پٹک دیا کرتا تھا اور وہ رونے لگتی تھی۔

میں اپنے باپ سے بے حد ڈرتا تھا اور اس قدر کہ جب ان کے سامنے جاتا تھا تو میری چال بدل جایا کرتی تھی۔ لیکن اس کے باوجود جب ایک روز میں خربرے کی قاشیں چوکو کی نوک سے اٹھا اٹھا کر کھا رہا تھا اور انہوں نے ڈانٹ کر یہ کہا تھا کہ یہ کیا کر رہا ہے گدھے چاکو کی نوک اگر تالو میں چبھ گئی تو ناچتا پھرے گا سارے گھر میں..... تو مجھے اس قدر غصہ آ گیا تھا کہ میں نے باپ کی طرف چاقو اس طرح نشانہ باندھ کر پھینک مارا تھا کہ اگر وہ ان کے سینے میں چبھ جاتا تو لہولہان ہو جاتے۔

اسی طرح میں نے ایک بار اور بھی اپنے باپ کے ساتھ گستاخی کی تھی۔

میرے باپ کا سختی کے ساتھ یہ حکم تھا کہ بچوں میں سے کوئی بھی ان کی اجازت کے بغیر پھاٹک سے باہر قدم نہ رکھے۔ اور جب وہ ہمیں باہر جانے کی اجازت دے دیتے، تو چار پانچ سپاہی ہمارے ساتھ کر دیا کرتے تھے۔ ایک روز وہ باغ تشریف لے جا چکے تھے ان کی غیبت سے فائدہ اٹھا کر میں مشیر احمد خاں رام پوری کے گھر، جو بالکل ہمارے پھاٹک کے سامنے تھا چلا گیا مشیر خاں کی ماں، اپنے پوتے یعنی میرے دوست مختار کو کھانا کھلا رہی تھیں مجھے بھی انہوں نے دستر خوان پر بٹھا لیا۔ اور اپنے ہاتھ سے لقمے بنا بنا کر مجھے بھنڈی کھلائی[1]۔

---

[1] اس بھنڈی کا مزا اب تک زبان پر تازہ اور حافظے میں محفوظ ہے اور اب جب کبھی بھنڈی کھاتا ہوں تو میرے منہ سے نکل جاتا ہے بے ساختہ "ہائے مشیر خاں کی ماں"۔

جب مزے کی بھنڈی کھلا کر گھر آیا دیکھا کہ میرے باپ باغ سے آگے اور آرام کرسی پر لیٹے ہوئے ہیں۔ مجھے دیکھتے ہی انہوں نے بڑی خشونت کے ساتھ پوچھا کہاں گئے تھے میں نے کہا مشیر خاں کے گھر انہوں نے پوچھا اور میری اجازت کے بغیر میں نے کہا آپ یہاں تھے کہاں انہوں نے فرمایا میرے آنے کا انتظار کرتے' اور گئے بھی تھے تو سپاہیوں کو ساتھ کیوں نہیں لیا۔ میں نے کہا میاں دو قدم کے لیے سپاہی لے کر جا کر کیا کرتا انہوں نے برافروختہ ہو کر مجھے فرمایا مجھ سے منطق بگھار رہا ہے۔ یہ کہہ کر وہ اٹھے اور ہروتی کی پتلی سی جریب' اس زور سے میری پیٹ میں ماری کہ میں بلبلا گیا۔ اور انتہائی تیہے کے عالم میں مجھ نالائق کی زبان سے بے ارادہ نکل گیا کہ اللہ کرے مر جائیں میاں۔

یہ سنتے ہی میرے باپ غصے کے مارے دیوانے ہو گئے کھر کھراتے مجھے اندر لے گئے اور جریبوں پر جریبیں مارنے لگے۔ وہ تو کہیے میری دادی جان آ گئیں اور انہوں نے میرے اپ کی پشت پر لکڑی مار کر کہا کیا مار ڈالے گا بچے کو۔ اور میرے باپ نے فوراً ہاتھ روک لیا۔

معلوم نہیں کیوں مگر میاں بسنت میری چڑھ گئی.....

ایک روز میرے باپ ے کمرے میں ایک بڑی خوفناک ڈاڑھی والے مولانا اونچا سا عمامہ باندھے اور موٹے تال کی عینک لگائے کسی مسئلے پر گفتگو کر رہے تھے کہ میں ادھر آ نکلا۔ مجھے دیکھتے ہی مشیر خاں نے ان مولانا کے کان میں کچھ کہہ کر میری جانب اشارہ کیا مولانا نے جھپٹ کر مجھے گود میں بٹھالیا۔ اور میرے سر پر بڑی شفقت کے ساتھ یہ بات پھیر کر کہا'' کہو میاں بسنت کیا کھاؤ گے'' یہ سنتے ہی میں نے ان کی داڑھی پکڑ لی اور اے ماڑالوں گا کا نعرہ لگا کر اس زور سے ان کی داڑھی کو جھٹکا دیا کہ ان کا عمامہ عینک سمیت فرش پر گر پڑا۔ ان کے منہ سے ایک دردناک چیخ نکل گ ء۔ مشیر خاں ہنستے ہنستے بے دم ہو گئے اور میرے باپ نے زور لگا کر ان کی داڑھی میری

گرفت سے چھڑا دی اور میں اوف اوف کرتا باہر نکل گیا۔

ایک روز میں اپنے پھاٹک پر بڑی سی ہوائی بندوق بھر کے کھڑا ہا تھا کہ ایک دائی کا لڑکا میرے سامنے سے گزرا لیکن مجھے سلام نہیں کیا اس کی اس گستاخی پر مجھے تاؤ آ گیا۔ میں نے اس پر دن سے فائر کر دیا۔ بڑا سا چھرا اس بیچارے کے پیٹ میں پیوست ہو گیا۔ اور وہ گر کر تڑپنے لگا۔ اور مجھ شقی نے اس کے تڑپنے پر رحم کھانے کے عوض اس کی پسلی پر زور سے ٹھوکر مار کر کہا ابے دوکوری کے نائی اتھ اور سلام کر اور جب وہ غریب کراہتا اٹھا اور جھک کر مجھے سلام کیا تو میرا غصہ ٹھنڈا ہو گیا۔

ایک روز یا دنہیں کسی خطا پر میں نے اپنے غلام حسین بخشا کو زنا نے مکان کے صحن میں کھڑا مار رہا تھا کہ چھڑیوں سے تڑا تڑ تڑا تڑ کہ ڈیوڑھی میں دادامیاں تشریف لے آئے۔ دم نکل گیا ان کو دیکھ کر کہ اب وہ مجھے ماریں گے۔ یا ڈانٹیں گے۔ لیکن یہ دیکھ کر بڑی مسرت آمیز حیرت ہوئی کہ دادامیاں مسکراتے آئے اور میرا ہاتھ پکڑا مجھے باپ کے کمرے میں لے گئے ارمیرے باپ سے کہا بشیر میں تمہیں مبارک باد دیتا ہوں کہ تمہارا یہ منجھلا بیٹا بڑا سورما نکلے گا۔ اور بادشاہوں تک سے ٹکر لے گا۔ اور جب میرے باپ نے پوچھا باوا یہ اندازہ کیسے ہوا تو انہوں نے فرمایا کہ یہ غلام کو مار رہا تھا۔ اور ایسے تیوروں سے ہو رہا تھا کہ سورماؤں کے سوا ایسے تیور کسی کو میسر ہی نہیں ہو سکتے۔

بشیر ہم پٹھان ہیں سورماؤں اور بزدلوں کے تیوروں کو ہم سے زیادہ اور کون سمجھ سکتا ہے۔ اس لیے کہ سوپشت سے ہے پیشہ آبا سپہ گری

ارپھر مجھ سے ارشاد فرمایا کہ برب کعبہ میں گو گاؤں اور وہ باغ تیرے نام براہ راست لکھ دوں گا۔ اور لے یہ دوگنیاں اس کی مٹھائی کھانا اور اس میں سے پانچ روپے اس غلام زادے کو دے دینا جس کو تو ابھی مار رہا تھا۔

آپ نے میرا غیظ و غضب دیکھ لیا۔ اب میری مہر و وفا اور جود و سخا کا رخ بھی دیکھ لیجیے۔

میرے بچپن تک میرے گھر میں چائے کا رواج نہیں تھا۔ ناشتے میں ہم نہایت خستہ روغنی روٹیاں بالائی اور انڈے کھاتے اور شہد آمیز خالص دودھ پیا کرتے تھے اور جاڑوں کے زمانے میں ناشتے کے بعد جب ہماری جیبوں میں چھلے چلغوزے اخروٹ کی گری کشمش باداموں کا مغز اور صاف کیے ہوئے پستے بھر دیے جاتے تھے تو میں باہر آ کر آواز دیا کرتا تھا کہ برف کے چھڑو یو چلو..... پہلے اس نعرے کو سمجھ لیجیے۔

---

[1] ان کی یہ مخصوص قسم تھی [2] موت نے ان کو ایفائے عہد کی فرصت نہیں دی۔

میرے دادا کے برف خانے کی چھت پر مٹی کے کورے ظروف کا مسالا لگا کر رکھ دیے جاتے تھے جن میں پچھلے پہر تک برف جم جاتی تھی اور منہ اندھیرے برف خانے کے آدمی پکارتے تھے مزدوروں کو اے برف کے چھڑو یو چلو (اے برف کے چھڑانے والو آؤ) اور وہ مزدور آ کر برتنوں سے برف کھرچ کھرچ کر چھڑاتے وار کھتوں میں کوٹ کوٹ کر بھر دیا کرتے تھے۔ اور ان کھنوں میں جست کی صراحیاں دبا دی جاتی تھیں..... اور یہ سمجھلینے کے بعد اب یہ سنیے کہ جیسے ہی میں برف کے چھڑو یو چلو کا نعرہ لگاتا تھا لونڈوں اور ماماؤں کے تمام بچے دوڑ دوڑ کر میرے پاس آ جایا کرتے تھے اور میں یہ کہہ کہہ کر اے میرے تانگھو چنے چباؤ اپنا سارا میوہ انہیں کھلا دیا کرتا تھا۔ اور جب کبھی سمدا تالاب کی جوگی منہ اندھیرے

قفس کاٹا چمن ہویا تیری رحمت کا ہوں جویا محمد یا رسول اللہؐ
جوانی میں بہت سویا بڑھاپا دیکھ کر رویا محمد یا رسول اللہؐ
دھواں پایا دیا کھویا..... محمد یا رسول اللہؐ

گائے ہوئے میرے دروازے پر آتے تھے میں چکارے کے سے تر ارے بھرتا تھا گھر جاتا اور ہانپتی ہوئی آواز میں کہتا کہ اماں ہمارے دروازے پر جوگی کھڑے ہوئے ہیں۔ انہیں بھیک دے دو۔ میری اماں کو میری اس ادا پر بہت پیار آتا تھا اور وہ بٹوے سے نکال کر دو روپے میرے حوالے کر دیا کرتی تھیں۔

ایک تھے ہمارے سپاہیوں میں ساٹھ پینسٹھ سال کے بوڑھے حیدر خاں..... ایک روز میں نے دیکھا کہ ان کے چولھے پر دودھ کی پتیلی کڑ کڑا رہی ہے۔ اور وہ کوئی کالی کالی گولی پیالی میں گھول رہے ہیں میں نے پوچھا حیدر خاں یہ کیا چیز ہے انہوں نے کہا افیم گھول رہا ہوں میں نے پوچھا افیم کیا چیز ہوتی ہے انہوں نے کہا یہ دوا ہے۔

مگر منجھلے بھیا یہ چیز امیروں کی ہے یہ روز پاؤ بھر ملائی بالائی مانگتی ہے۔ میں غریب آدمی ہوں بھلا ملائی کہاں سے لاؤں..... حیدر خاں کی اس بے کسی پر مجھے بڑا ترس آیا ان سے کچھ نہیں کہا سیدھا گھر کے اندر گیا اور گل زار ابوا کی نظر بچا کر پیالہ بھر بالائی چرا کر باہر لے آیا۔ بالائی کا پیالہ بھرا دیکھ کر حیدر خان افسردہ لیکن سرخ و سفید چہرے کی جھریوں کے اندر شگفتگی و تشکر کی جولہریں دوڑنے لگیں تھیں۔ وہ میرے حافظے کے افق سے آج تک رنگ برسا رہی ہیں۔ اس روز سے یہ میرا یہ معمول ہو گیا کہ میں ہر صبح حیدر خاں کو بالائی دے کر گھر پہنچا تو دیکھا گل زار بوا میری ماں سے کہہ رہی ہیں کہ بی بی مین دیکھ رہی ہوں کہ روز ملائی کم ہو جایا کرتی ہے۔ میرا دل گواہی دیتا ہے کہ ی ظہورن کے سوا اور کسی کی ہت پھیری نہیں ہو سکتی۔ وہمر دار بڑی چٹوری ہے بی بی کل میں نے اپنی آنکھوں سے خود دیکھا ہے کہ وہ اپنا کھیر کا تھلوا چٹ کر کے نصیبن کا تھلوا بھی ہبک ہبک کر زہر مار کر رہی تھی.....

میری ماں نے ظہورن کو بلایا وہ دوڑی آئی اور میری ماں کے بگرے ہوئے تیور دیکھ کر سہم گئی۔

اب مجھ سے ضبط نہ ہو سکا میں نے کہا اماں ظہورن نہیں میں بالائی اڑا کر لے جاتا ہوں۔ یہ کہہ کر میں نے سارا ماجرا بیان کر دیا گل زار بوا نے سنا تو بگڑ کر کہا کہ بھاڑ میں جائیں حیدر خاں بچے کو پھسلا کر روز ملائی چاٹتے ہیں۔ خاک کھائیں' انگارے کھائیں حیدر خاں علی کی تیغ ٹوٹے ان پر۔

میری ماں نے فرمایا اے ہے گل زاراتی سی ملائی کے چلّوں اس قدر کٹے کٹے کو سنے دے رہی ہو ایک پیالہ ملائی کی حقیقت ہی کیا ہے تم ہی نہیں سوچتیں کہ اتی سی ملائی دے کر تھوڑے کا دل ہات بھر کا ہوا جاتا ہے۔

ماں کی یہ بات سن کر میں بشاش ہو گیا۔ اور اب کھلے بندوں بالائی لے جانے لگا۔ ابا ورچی خانے کی نگراں تھیں۔

حیدر خاں اب تم اس ترسانے والی دنیا میں نہیں ہو مگر تمہاری دعاؤں کی چاندنی آج تک میرے دل میں چھٹکی ہوئی ہے)۔

جب میرا چھوٹا بھائی پیدا ہوا تھا تو میں اسے کو دیکھتے ہی میرے دل میں اس کی محبت پیدا ہو گئی تھی۔ اور میں نے اس کا نام للو رکھ دیا تھا.....

ایک روز میں بڑے باغ میں ٹہل رہا تھا کہ دیکھا آب رسانی کی نالی کی کیچڑ میں ایک جوتہ دھنسا پڑا ہے اسے اپنے مالی براجی سے دھلوا کر میں نے اپنے مخملی کوٹ کی جیب میں رکھ لیا۔ براجی نے کہا ''ارے بھیا یو کا گرت ہو جیب کھراب ہو جیہے (ارے بھیا یہ کیا کر رہے ہو جیب خراب ہو جائے گی) میں نے کہا میں یہ جوتا اپنے للو کو پہناؤں گا.....وہ ہنسنے لگا۔

اور جب میں اپنی ماں کے زچہ خانے میں پہنچ گیا۔ میں نے وہ جوتا جیب سے نکالا اور چاہا کہ اسے للو کے پاؤں میں پہنا دوں ت و میری پھپّی زاد بہن امی نھے چیخ مار کر کہا اری ممانی غضب خدا کا یہ مخمل کا کوٹ اور اس کی جیب میں یہ چمڑ ودھا جوتہ اور پھر اس کو منجھلا بھائی اپنے بھائی کے پاؤں میں پہنانا چاہ رہا ہے یہ سن کر میری ماں ہنسنے لگیں۔ ساری عورتوں نے مجھ کو گھیر لیا۔ سب ے مجھ پر قہقہے مارے.....لیکن کسی نے میرے اس درد دل کی داد نہیں دی جو میں اس جوتے کو للو کے پاؤں میں نہ پہنا سکا۔

میرے دل میں اس قدر گداختگی اور اتنی زورا شنائی تھی کہ جب گھر سے کوئی مہمان رخصت ہونے لگتا تھا میری آنکھیں آنسو برسانے لگتی تھیں۔

مجھے آج کی تاریخ تک وہ بے انتہا قلق یاد ہے کہ میرے نانا جان جب میری بڑی بہن کی شادی میں شرکت کے بعد آگرے جا رہے تھے تو میں ان کے ریزرو کمپارٹمنٹ میں گھس کر بیٹھ گیا تھا۔ اور جس وقت' ایک زنبوری بات نے مجھ کو وہاں سے دیوار میں ٹھنکی ہوئی کیل کے مانند جھٹکا دے کر باہر کھینچا تھا تو مجھ پر غشی طاری ہوگئی تھی۔

ادریس احمد

ایک روز ہماری ڈیوڑھی میں ایک بٹیر پالنے پر مامور سپاہی بندہ علی خاں اپنے بٹیرے کے دوسرے سپاہی' سے یہ کہہ رہے تھے بھائی صالح محمد خاں' میری لڑکی کے بیاہ کے واسطے صاحب (یعنی میرے باپ) نے جو چھ سو روپے مجھ کو دیے تھے۔ وہ میں جوئے میں ہار گیا۔ اور اب میرے واسطے سرف یہی ایک بات رہ گئی ہے کہ اس شرمندگی میں کچھ کھا کر سو جاؤں۔

بندے علی خاں کی زبان سے جب میں نے یہ بات سنی تو میرا دل دھڑکنے لگا۔ ان میں سے ایک حرف بھی نہیں کہا منہ لٹکائے زنان خانے میں چلا گیا۔ اور بستر پر دراز ہو کر سوچنے لگا کہ ان کی جان کیوں کر بچاؤں دیر تک سوچتا رہا کچھ بھی کچھ میں نہیں آیا کہ اتنے میں ایک چھپکلی میری ماں کے تکیے پر سپٹ سے آگری میں نے اس کو مارنے کے لیے تکیے پر جوتا کھینچ مارا تکیہ نیچے گر گیا۔ چھپکلی بھاگ گئی اور یہ دیکھ کر میری نبضیں تیز ہوگئیں کہ ماں کے سرہانے سونے کی جڑاؤ چمپا کلی جگمگ جگمگ ہو رہی ہے۔ میں نے چھپکلی کی دکھائی ہوئی چمپا کھلی جھٹ سے اٹھا کر نیفے میں ٹوم لی۔ اور ارادہ کر ہی رہا تھا کہ اسے بندے علی خاں کو دے آؤں کہ یکا یک سہ دری سے میری ماں آگئیں اپنا تکیہ زمین پر اور چمپا کلی غائب دیکھکر انہوں نے مجھ سے پوچھا ننھے تو یہاں کب سے ہے۔ میں نے کہا بڑی دیر سے انہوں نے دریافت فرمایا ادھر کوئی لونڈی تو نہیں آئی تھی۔ میری چمپا کلی غائب ہوگئی ہے میں نے کہا کوئی نہیں وہ سر جھکا کر بیٹھ گئیں ماں کا یوں سر جھکا کر بیٹھ جانا مجھ سے برداشت نہیں ہو سکا۔ میں نے اپنے

نیفے مین سے نکال کر چمپا کلی ان کے حوالے کر دی اور انہوں نے کہا تو نے اچھا کیا جو چمپا کلی اپنے پاس رکھ لی نہیں تو کوئی لونڈی باندی اڑا کر لے جاتی۔

میں نے بندے علی خان کی ساری داستان سنا کر کہا کہ اس لیے اٹھائی تھی کہ بندے علی خاں کو دے دوں گا۔ میری ماں نے کہا کہ ان کو تو صرف چھ سو روپے کی ضرورت ہے اور یہ چمپا کلی تو تین سو اتین ہزار کی ہے..... یہ کہہ کر میری ماں سوچنے لگیں اور پھر بڑے ولولے کے ساتھ سر اٹھا کر کہا کوئی بات نہیں یہ چمپا کلی انہیں کی تقدیر کی تھی جا دے آ۔ اور جب میں کوشی سے بھرا ہوا دوڑتا باہر جانے لگا تو میری ماں نے کہا مجھے آدھے راستے سے بلا کر کہا کہ ننھے تو نے میری چمپا کلی مجھ سے مانگے بغیر اپنے پاس رکھ لی اسی کا نام ہے چوری۔ شریف بچے کبھی چوری نہیں کرتے۔ میرے سر پر ہات رکھ کر قسم کھا کہ اب کبھی ایسی گھٹیا بات نہیں کرے گا۔ میں نے ماں کے سر پر ہات رکھکر قسم کھالی اور یہ سوچ کر کہ میں چور ہوں میرا دل دھک دھک کرنے لگا۔

جب باہر جا کر سب کی نظر بچا کر میں نے وہ چمپا کلی بندے علی خاں کے حوالے کی تو ان کے دل کی کلی کھل گئی۔ ان کے مرجھائے ہوئے چہرے پر سرخی دوڑ گئی اور دونوں ہاتھ اٹھا کر انہوں نے مجھے دعائیں دینا شروع کر دیں کہ الٰہی منجھلے بھیا کی عمر دراز ہو یہ دردربار میں سرخرو ہوں۔ اور ان کے دروازے پر ہاتھی جھومیں۔ یہ سچ ہے کہ بندے علی خاں کی خدمت کر کے مجھے بے حد خوشی ہوئی تھی۔ لیکن اگر دل میں یہ کانٹا نہ کھٹکتا کہ میں چور ہوں تو میری خوشی کی کوئی انتہا نہ رہتی۔

میری انا لکھنو کی سیدانی تھیں اور مجھ کو ان سے بے حد محبت تھی کہ میری دودھ بڑھائی کے بعد جب وہ لکھنو چلی گئی تھیں۔ تو میری آنکھوں میں دنیا ویران ہو گئی تھی اور میں مکان کے گوشے پر انا جان انا جان کہتا پھرنے لگا۔ اور آخر کار اتنا ہرک گیا کہ مجھے بخار آنے لگا..... میرے باپ نے لکھنو آدمی بھیج کر کئی بار انا کو ڈھنڈوایا لیکن ان کا پتا کہیں چلا ہی نہیں۔

میری پچاسی برسکی کھلائی ہوئی عباسی خانم جو مجھ سے بے پناہ محبت کرتی تھیں روئی کی ایک بڑی سی گڑیا بنا کر میرے پہلو میں لٹا دیتی کہ لے بیٹا تیری انا آ گئی اور میں اس گڑیا سے چمٹ کر سو جایا کرتا تھا.....

نہ جانے مجھ میں یہ بات کیوں تھی کہ جو لوگ' ریل میں میرے ہم سفر یا گانے بجانے کی محفلوں میں میرے ندیم یا موسلا دھار پانی برسنے کے وقت میرے ہم نشین ہوتے تھے مجھے ان تمام لوگوں سے محبت ہو جایا کرتی تھی۔

چنانچہ ایک روز جب کہ بڑے دھوم دھڑکے سے رگڑم جھوم پانی برس رہا تھا اولتیاں ٹپک رہی تھیں۔ پرنالے دھڑا دھڑ چل رہے تھے انگنائی کے بھرے ہوئے پانی میں جا بجا بھنور پڑ رہے تھے شیر خاں سپاہی نے لہک لہک کر ملھار گانا شروع کر دیا۔ مدنا موہن بن کل نا پرے گا ری او سکھی اری او سکھی''۔

ہائے بھیگے درودیار مستانہ بوچھاڑ جھڑی کا ستار پی ہو کی پکار' برہا کی جھنکار' اور محمد شیر خاں کا ملھار..... خدا ہی جانے کیا چوٹ لگ گئی میرے معصوم دل پر کہ میں رونے لگا زار و قطار۔

ابھی میں برکھا کی جھڑی اور ملھار کے جھولے میں جھول رہی تھی کہ سارا مزہ خاک میں ملا کر رکھ دیا ظہور علی خاں نے یہ کہہ کہ کہ محمد شیر خاں تم کو خاں صاحب بہادر (میرے باپ) یاد فرما رہے ہیں میں ہائے کر کے رہ گیا۔ کھن سے چکنا چور ہو گیا ہیرا سا غرسر شار اور چٹ سے ٹوٹ گیا میرا اجھما جھم کا تار۔

اور جب میں نے یہ سنا کہ میرے باپ محمد شیر خاں وک زور زور سے ڈانٹ رہے ہیں کہ میں نے کہا تھا ربلا لاؤ اور تم ابھی تک نہیں گئے تو چھتریلگا کر میں اپنے باپ کے کمرے میں جا کر بے اختیار رونے لگا۔ میرے باپ میرے اس گریہ بے اختیار سے بے چین ہو گئے اور بڑی حیرت سے پوچھا بیٹے کس بات پر رو رہے ہو۔ میں نے رک رک کر کہا میاں یہ محمد شیر خاں یہ کہتے ہی میری آواز رندھ گئی میرے باپ نے

چارپائی سے اٹھ کر مجھے زانو پر بٹھالیا۔ اربہت چمکار کر پوچھا بیٹا جلدی بتاؤ کیا بات ہے۔

میں نے روہانسی آواز میں کہ امیاں پیٹے کا پانی برس رہا ہے۔ یہ ابھی مجھ کو ملہار سنا رہے تھے کہ اب ان پر ڈانٹ پھٹکار ہورہی ہے۔

یہ سنتے ہی میاں نے مجھ کو چھاتی سے لگالیا اور کہا بیٹا تو آگے چل کر شاعر ہو جائے گا اور ہمارے خاندان کا نام تجھ سے روشن ہو گا..... محمد شیر جاؤ اس کو ملہار سناؤ اور ظہور علی خاں کو بھیج دو کہار بلانے کے لیے۔

اِملن موہن کے بغیر اے سکھی مجھے قرار نہیں ہے۔

آپنے میرے دل کی سختی اور نرمی یعنی میری حدیدیت اور حریریت اور میری شعلہ افشانی و شبنم چکانی یہ دونوں چیزیں دیکھ لیں..... اب میرے محبت و غضب کے مرکب جذبے کو بھی دیکھ لیجیے۔ جو ایک بڑی انوکھی سی بات ہے۔ آب و آتش ہم آمیختہ از لب لعل۔

میں اپنی پچاسی برس کی کھلائی عباسی خانم کا ذکر کر چکا ہوں جنکو میں بڑی بی کہا کرتا تھا۔ ہم دونوں ایک دوسرے پر جان نچھاور کرتے تھے مجھ کو برفی بے حد پسند تھی۔ اور کنجا یا للند حلوائی کی دکان سے ہر صبح کو برفی کا ایک دونا اجایا کرتا تھا یہ کیوں کر ہو سکتا ہے کہ میں برفی کھاؤں اور بڑی بی کو نہ کھلاؤں..... اور یہی نہیں میری یہ تمنا ہوتی تھی کہ آدھا دونا مُس کھاؤں اور آدھا دونا اپنی بڑی بی کو کھلاؤں لیکن میری الٹی کھوپری میں یہ بات نہیں آتی تھی کہ بڑی بی کی سی پھونس بوڑھی عورت آدھا دونا کیوں کر کھا سکتی ہیں اور جب برفی کی دو چار ڈلیاں کھا چکنے کے بعد وہ مزید کھانے سے یہ کہہ کر انکار کر دیتیں کہ ننھے اب مٹھائی نہیں کھائی جا رہی ہے تو فرط محبت کے باعث مجھ کو ان پر اس قدر غصہ آجاتا کہ ان بے چاری کے روئی کے سے بال پکڑ کر ان کا سر زمین سے ملا دیا کرتا تھا۔ اور وہ چیخیں مار مار کر کہتی تھیں کہ ارخدا کا واسطہ کوئی اللہ کا بندہ مجھ کو بچالے

ارے ننھا مجھ کو مارے ڈال رہا ہے۔ اور مامائیں اصیلیں دوڑ کر میرے پنجے سے ان کو چھڑا لیتیں..... غزا رسانی کے سلسلے میں اللہ کے متعلق فقط سنا ہی تھا کہ ورنہ ستانی بسم می دہد اور ننھے کو اس پر عمل کرتے دیکھ لیا۔ واہ رے ننھے اخلاق الٰہی کا پورا اتباع کر کے دکھا دیا۔ ایں کار از تو آید و مرداں چنیں کنند!

میرے کھیل

کوئی ایک کھیل بھی جم کر میں نے کبھی نہیں کھیلا یوں تو دوسروں سے چھڑیا دلا کر پتنگ بازی بھی کی۔ بھدے طور سے گوئیاں بھی کھیلیں آنکھ مچولی میں بھی حصہ لیا۔ فٹ بال اور ٹینس بھی برا بھلا کھیلا اور ست گھڑے کے خانوں میں بھی اچھلا کودا مگر دو چار بار کھیل کر ہر کھیل ترک کر دیا۔ اپنا پڑھا ہوا سبق اپنے ہم عمروں کو پڑھانا داغ و امیر کے دیوان پڑھنا اور اپنے کمرے کو سجانا۔

اے بڑی بی تم مٹی کے نیچے دبی پڑی ہو اور تمہارا ننھا ابھی تک زندگی کو بھوگ رہا ہے زندگی کے بوجھ تمہارے ننھے کے شانے ٹوٹے جا رہے ہیں میری اچھی بڑی بی اپنے بوڑھے ننھے کو بلا لو اب تو بلا لو اپنے پاس۔

یہ تھے میرے محبوب کھیل..... پڑھاتا تھا میز کرس پر بیٹھ کر میز پر بید رکھا۔ اور میز کے سامنے دادا میاں کی عدالت کا کٹھہرا لگا رہتا تھا..... داغ و امیر کے دیوان لچکا ٹکے ہوئے مخمل کے جزدان میں رکھتا تھا اور میرے کمرے کی سجاوٹ ایسی تھی کہ اسے بھی ملاحظہ فرمائیے..... میرے خاصے چورے لیکن چوڑے سے زیادہ لانبے کمرے میں ایک جانب تو تختوں کا چوکا تھا چوکے پر گدا گدے پر سفید چاندنی چاندنی پر زرین قالین مخمل کے گاؤ تکیے سنگ مرمر کے مری فرش داہنے بائیں سیاہ پالش اور سنہری دھاریوں کی پتلی پتلی کرسیاں کرسیوں کے سامنے چھوٹی چھوٹی میزیں میزوں پر گل دان ادھر ادھر چاندی کے اگال دان پختہ فرش پر گراموفون دوسرے پر آگے کے سنگ تراشوں کا بنایا ہوا تاج محل ایک ایسی نہایت خوب صورت زریں و مخملی کرسی جس

پر بیٹھے ہی باجہ بجنے لگتا تھا۔ دروازوں پر چکیں سامنے چاندی کے فریم میں جڑا قدم آدم آئینہ آئینے کے تختے پر ارگن بجانے والی ٹائم پیس۔ پیتل کا عود دان لکھنے کی میز پر بلوریں دوات قلم ایک بڑا خوبصورت لیمپ جس کے گلوب میں جھاڑوں کے سے رنگین قلم، دیواروں پر بڑی بھڑکیلی دیوار گیریاں الماری میں شعرا کے دیوان الماری کے دروازے پر گوند سے چپکائی اور کپڑوں کے تھانوں سے چھڑائی ہوئی سنہری ۲؎ چٹھیاں..... یہ تھی میرے کمرے کی آرائش۔

۱؎ دادا میاں آنریری مجسٹریٹ بھی تھے۔ ۲؎ ایک چٹھی کا آدھا حصہ الماری کے دروازے پر آج تک چسپاں ہے اب اس کمرے میں میرا چھوٹا بھائی رئیس احمد رہتا ہے جس نے اپنی بے پروائی کے ہاتھوں اسے اجاڑ کر رکھ دیا ہے..... اب جب کبھی ملیح آباد جا کر اس کمرے میں قدم رکھتا ہوں تو اس کے ذرات چیخ اٹھتے ہیں۔ میں ارے ہمارے منجھلے بھیا آ گئے۔ اور جب الماری کے پٹ پر جھجکی ہوئی دھندلی سی چٹھی کے آدھے ٹکڑے کو دیکھتا ہوں تو اس چٹھی کے اندر سے بالکل میری صورت کا ایک لڑکا جرنیلی ٹوپی پہنے برآمد ہو جاتا ہے اور اس لڑکے کو دیکھ کر میری ہچکیاں بندھ جاتی ہیں۔ اور اس عالم میں رئیس کا خوب صورت کوکا نا درحسین روتا ہوا میرے سامنے آ کھڑا ہو جاتا ہے۔ جس کے رخسار میرے لبوں نے اس کمرے میں بوسے کا اولین تجربہ حاصل کیا تھا اور کھڑکی سے بڑی بی کی تھرتھراتی آواز آنے لگتی ہے کہ ننھے آؤ اماں دودھ کا پیالہ بھرے بیٹھی ہیں"..... ہائے ہائے ہائے ہائے۔

میرے زمانے کے اوہام

میرے خاندان کی خواتین پر خوف ناک تصورات منڈلایا کرتے تھے۔ یوں تو ہر محل میں ارواح خبیثہ کی عمل داری تھی۔ لیکن وہ محل جس میں دادا میاں رہتے تھے جس کا نام تھا بڑا محل وہ تو خصوصیت کے ساتھ..... دنیا بھر کے شہید مردوں ہنگامہ سنہ ۱۸۵۷ء کے تمام مقتول گوروں..... بھوتوں پریتوں پلیدوں دیوؤں چڑیلوں بھتنیوں پچھلی

پائیوں بڑسروں خبیثوں اور جنوں کی راج دھانی سمجھا جاتا تھا..... ارتمام خواتین کو اس امر کا یقین تھا کہ آدھی رات کے اندھیارے میں اس محل کے تمام گوشوں کونوں' کھتروں' کوٹھریوں' مچانوں' طاقوں' ٹھنجیوں' سہ دریو' زینوں' کلیوں' نالیوں اور ناغولوں سے نکل نکل کر خبیث روحیں دھما چوکڑی کیا کرتی ہیں مہیب آوازیں نکال نکال کر سونے والیوں کی چارپائیاں الٹتی ہیں ان کے گلے گھونٹتی' دانت کٹکٹاتی اور جبڑے ہلاتی پھرا کرتی ہیں..... اور لطف یہ کہ یہ تمام باتیں سنی سنائی اور قیاسی نہیں بلکہ بڑی بوڑھیاں بڑے خوفناک تیوروں سے اس کا دعویٰ کرتی تھیں کہ وہ ان تمام کرشموں کی عینی شاہد بھی ہیں..... اور ایک دفعہ ہی نہیں وہ بارہا ان خبیث روحوں سے دوچار اور رنگا رہو چکی ہیں۔

رات کے کھانے کے بعد اکثر بھوتوں اور چڑیلوں کے تذکرے ہوا کرتے تھے۔ اور خواتین کے ساتھ ساتھ تمام لونڈیاں باندیاں اور مامائیں اصیلیں بھی' اپنے اپنے ذاتی تجربات بیان کیا کرتی تھیں۔

ایک دن بہت تڑکے جب کہ دادی جان اپنے کھٹے پر بیٹھی حقہ پی رہی تھیں کہ ایک نوخیز چھوکری ہانپتی کانپتی ان کے پاس آئی اور سہمی آواز میں کہنے لگی بری بی بی آدھی رات کو جب گھنٹہ بارہ بجا رہا تھا تو ٹھن ٹھن ٹھن ٹھن کیا دیکھتی ہوں کہ انگاروں کے سے دیدوں اور بڑے بڑے دانتوں والی ایک کالی کلوٹی بینگن لوٹی دھم دھوسڑ چڑیل انگنائی میں کھڑی اپنے جھونٹے نوچ رہی ہے چرچر..... اور پھر جھونٹے نوچتی ہوئی مرمرے بھرے تھیلے کی طرح ہائے اللہ میری طرف مسمساتی اور منمناتی چلی آرہی ہے اے بڑی بی بی میری چھاتی دھک دھک کرنے لگی اور جیسے ہی وہ ہتنپو لے پولے قدم رکھتی ہوئی میرے پلنگ کے قریب آکر کھڑی ہوئی۔ میری اوپر کی سانس اوپر اور نیچے ہو کر رہ گئی جی میں آیا کہ چیخ مار کر گھر بھر کو جگا دوں مگر ڈر کے مارے گلے میں گونجے سے اٹک گئے کتا کتا زور لگایا مدا آواز نہیں نکلی۔ دانت بیٹھ گئے گھگھی بندھ گئی۔ اور میرا دم نکل جانے میں بس ذرا ہی سی کسر باقی تھی کہ اللہ کا کرنا یہ ہوا کہ جو

جو سہ دری کے سبز عمامے اور لال جریب والے شہید مرد ہیں۔ وہ سہ دری سے نکل کر کھڑاویں کھٹ کھٹ کرتے آ گئے اور آتے ہی انہوں نے اس مردار کی کھوپڑی پر ایسی کس کے جریب ماری کہ بہ بھتنی بلبلا اٹھی۔ اور اچھا آج نہیں تو کل کھا جاؤں گی آج نہیں تو کل کھا جاؤں گی۔ کہتی ہوئی بھاگی اور دھواں بن کر پائے خانے کی نالی کے اندر غائب ہوگئی۔ ددی جان نے یہ ماجرا سن کر چھوکری سے کہا سہ دری والے شہید مرد محل میں بہت سی جانیں بچا چکے ہین دیکھ آج ان کی نیاز دلا کر ان کا طاق بھر دینا..... اری تو تو کل کی چھوکری ہے میں تو اس محل کے سینکڑوں کرشمے دیکھ چکی ہوں جب میں یہاں نئی نئی بیاہ کر آئی تھی تو اس محل کے کوٹھے سے کبھی کبھی رات گئے لف رائی لف رائی (لفٹ رائٹ) کی آوازیں بڑے زور سے آتی تھیں اور جب سپاہی بندوق بھر کر ادھر ادھر جاتے تھے تو وہاں کوئی بھی نہ ہوتا تھا۔ وران کے اترتے ہی پھر وہی ادھم ہونے لگتا تھا۔ ایک عامل کہتے تھے کہ غدر کے زمانے میں جن گوروں کو یہاں مارا گیا تھا کبھی کبھی ان کی روحیں لف رائی لف رائی کیا کرتی ہیں۔

ایک رات کو جب کہ محرم کی نویں تاریخ کو ہمارے امام باڑے میں چراغاں ہو رہا تھا کہ ہمارے گھر کی لونڈی سکونت نے انگنائی میں چھت کی طرف دیکھ کر چیخیں مار مار کر کہنا شروع کر دیا اری تو تو کون ہے اری تو کون ہے اری تو کون ہے؟

گھر بھر میں ہلچل مچ گئی تمام عورتیں آنگن میں جمع ہوگئیں۔ اور پوچھنے لگیں اری سکونت یہ تو کس سے باتیں کر رہی تھی اس نے کہا بیبیو میں نے دیکھا ایک بڑے برے دانتوں والی بھتنی اوپر کی منڈیر سے جھک جھک کر تعزیہ دیکھ رہی ہے۔ اور جب میں نے اس سے پوچھا اری تو کون ہے تو اس نے منمنا کر کہا دور ہوا ے شنتل ہم زیارت کرنے آئے ہیں اور یہ کہتے ہی وہ غائب ہوگئی۔

یہ سننے کے بعد ہر عورت کے چہرے پر سے خوف ٹپکنے لگا۔ اور گھر بھر میں سناٹا چھا گیا.....

میرا ڈریوک پن

یہ باتیں سن سن کر میں اس قدر سہم گیا تھا کہ رات کو گھر سے باہر قدم رکھنا تو درکنار، جب شام کا وقت، مردانے مکان میں جاتا تھا تو ڈیوڑھی کے اس دروازے سے لے کر اس دروازے تک کوئی نہ کوئی ماما مجھ کو پہنچانے جایا کرتی اور غسل خانے جاتا تھا تو ماما دروازے پر سے بار بار آواز دیا کرتی تھی کہ بھیا ہم دروازے پر کھڑے ہیں ڈرنا مت۔

تقریباً دس گیارہ سال کی عمر تک میری بزدلی کا یہ عالم رہا کہ جب تک بری بی گڑ مڑا کر میری پائنتی لیٹ نہیں جاتی تھیں۔ میں سو ہی نہیں سکتا تھا۔ اور جب کبھی رات کے وقت چڑیل والی کلیا کی طرف آنکھ اٹھ جاتی تھی وت میں تھرا جاتا تھا اور لچکچا کر فوراً آنکھیں بند کر لیتا تھا۔

دادی جان کا یہ ایک بندھا ٹکا اصول تھا کہ وہ ہر رات کو سوتے وقت بلا ناغہ کچھ پڑھ کر اور دور دور حصار کھینچ کر تین بار تالی بجایا کرتی تھیں۔ اور جب کبھی اس تالی کی آواز میرے کانوں میں پڑ جاتی تھی تو میرا دل دھڑکنے لگتا تھا۔ اور چڑیلوں کی صورتیں آنکھوں کے سامنے پھرنے لگتی تھیں۔

اور اب بھی جب کہ میں بوڑھا ہو چکا ہوں اور ارواح خبیثہ کو وہم کی خلاقی کے سوا اور کچھ بھی نہیں سمجھتا۔ پھر بھی میرا یہ عالم ہے کہ ابھی سال گزشتہ جب ملیح آباد میں دادا میاں کا محل دیکھنے کو گیا تو ہر چند دن کا وقت تھا لیکن دو چار آدمیوں کو ساتھ لیے بغیر میں اندر قدم ہی نہ رکھ سکا..... اللہ اکبر کس قدر ان مٹ ہوتے ہیں بچپن[۲] کے اثرات۔

---

[۱] ہمارے گھر کے ایک گوشے میں ایک کلیا (پتلی سی جگہ) تھی کہا جاتا تھا کہ اس میں چڑیل رہتی ہے۔ [۲] میرے نزدیک یہ بچپن کے کبھی نہ مٹ سکنے والے اثرات ہی ہیں جو نوع انسانی کو ہندو مسلم عیسائی بدھ زرتشتی یہودی جینی اور سکھ بنائے ہوئے ہیں۔ اسی وجہ سے میں یہ سمجھتا ہوں کہ دادا میاں کے محل سے نکلنا آدمی کا نہیں دیو کا کام ہے۔

☆☆☆

میری بسم اللہ

ارے میں اپنی بسم اللہ کا حال لکھنا تو بھول ہی گیا' اسے پہلے ہی آنا چاہیے تھا۔ خیر اب سن لیجیے ذرا سی تو بات ہے..... اس موقع پر کیا کیا رسمیں ہوئی تھیں بالتفصیل یاد نہیں ہیں۔ بس اسی قدر خیال ہے کہ کم عمری میں میری بسم اللہ ہوئی تھی۔ چاندی کی تھالی میں سونے کی دوات۔ سونے کے خول کا قلم اور قرآن مجید میرے سامنے رکھا گیا تھا اور میرے اولین معلم مولوی نیاز علی خاں نے مجھ سے کہا تھا میاں صاحب زادے کہیے بسم اللہ کے بعد حاضرین کے گلوں میں ہار ڈالے گئے تھے۔ اور مٹھائی تقسیم کی گئی تھی..... دادا میاں بھی موجود تھے جنہوں نے با آواز بلند یہ مصرع پڑھا تھا۔ قلم گوید کہ من شاہ جہانم..... اسی رات کو زنانے میں ڈومنیوں کا گانا اور مردانے میں طوائفوں کا مجرا ہوا تھا..... اور میں دولھا بنا کر بیچ میں بٹھا دیا گیا تھا۔

میرے معلم

میرے فارسی کے معلم تھے مولوی نیاز علی خاں اردو کے معلم تھے مولانا طاہر عربی کے معلم تھے مولوی قدرت اللہ بیگ اور انگریزی کے معلم تھے ماسٹر گومتی پرشاد۔

مولوی نیاز علی خاں ایک روکھے سے خشک مزاج آدمی تھے۔ مولانا طاہر بڑے ہی شگفتہ مزاج تھے اور شاعر بھی ان کا ایک شعر اب تک یاد ہے۔

شہرہ جو سنا حسن کا طاہر کی زبانی
نادیدہ میں عاشق ہوا تجھ پر مری جانی

مولوی قدرت اللہ بیگ فارسی اور عربی کے زبردست عالم تھے۔ میرے پاس ان کی ایک مثنوی موجود ہے جو غالباً پانچ ہزار اشعار پر مشتمل ہے۔ اور حیرت ناک بات یہ ہے کہ اس مثنوی کے تمام اشعار ایسے ہیں کہ ان میں ایک لفظ بھی نقطہ دار موجود نہیں ہے جس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ ان کے بے پایاں ذخیرہ الفاظ اور فرماں روائی لغات کا

اب رہے ماسٹر گومتی پرشاد سو وہ برے ہی مسکین اور خاموش طبع آدمی تھے۔ لیکن اس اسلوب سے پڑھاتے تھے کہ حرف حرف دل نشین ہو جاتا تھا۔ اس کے بہت دن کے بعد میرے باپ نے حضرت مانی جائیسی کو میرا ٹیوٹر مقرر فرمایا تھا۔

طلوع صبح کا اولین دیدار

ہمارے گھر کے اندر لطیفوں[1] نقلوں اور کہانیوں کی بنا پر دن رہتا تھا۔ رات کے گیارہ بجے تک اور رات رہتی تھی دن کے بارہ بجے تک ایک بجے تک..... اس لیے اس غیر فطری ماحول میں پلا ہوا بچہ واقف ہی کیوں ہو سکتا ہے صبح کی رنگینیوں سے۔

کیوں کر مالا مال ہوا میں اس دولت بیدار سے اور کیوں کر یہ قرآن اترا میری آنکھوں پر اس کی روداد بھی سن لیجیے۔ میرے باپ ربیع وخریف کے زمانے میں دربار اپنے علاقے کے دورے پر تشریف لے جایا کرتے تھے۔ اور ان مواقع پر وہ سو رہتے تھے آٹھ نو بجے رات کو اور جاگ اٹھتے تھے صبح تین چار بجے۔[1]

ایک بار جب وہ دورے پر جانے لگے تو میں نے ان سے درخواست کی تھی کہ میاں ہمیں بھی اپنے ساتھ لیتے چلیے گا۔ تو انہوں نے میری یہ درخواست منظور کر کے بوالحاظن کو مامور فرما دیا تھا کہ مجھ کو بہت تڑکے جگا دیں۔

---

[1] ایک مدت دراز سے میں سو رہت ہوں رات کے آٹھ نو بجے اور جاگ اٹھتا ہوں صبح کو تین چار بجے جس کے یہ معنی ہیں کہ میرے گھر میں ربیع وخریف کی فصل ہمیشہ رہتی ہے اور میں ہر روز اپنے علاقے کے دورے پر جاتا رہتا ہوں بات کا علاقہ ختم ہونے کا نام ہی نہیں لیتا۔ دریائے سخن سدا ہے جاری۔

اب سنیے اللہ کا کرنا کیا ہوتا ہے..... جب لحاظن بوا نے بہت تڑکے مجھ کو جھنجھوڑ کر جگایا کہ بھیا اٹھ بیٹھو میاں کے ساتھ گاؤں میں جانا ہے تو میں اٹھ بیٹھا..... اور آنکھیں مل کر، نگاہ اٹھائی تو بڑی حیرت کے ساتھ جب یہ دیکھا کہ دھندلے سنگ مرمر کی تراشیدہ اور دھوپ چھاؤں کی پروردہ نیم پیدا و نیم پنہاں گنگا جمنی پریاں نقابوں

کے سہروں کو چٹکیوں میں تولے رسمساتے آسمانی سے کسمساتی زمین کی طرف اڑتی چلی آرہی تھیں تو میرے دلے پوچھا ارے یہ کیا ہو رہا ہے اور یہ سب کچھ ہوا کیا جا رہا ہے؟..... دن ہے نہ رات اندھیرا ہے نہ اجالا اندھیرے میں اجالا..... اجالے میں اندھیرا..... صباحت میں ملاحت ملاحت میں صباحت سرمئی نقاب کی کندنی مکھڑا..... سرخی میں گدرائی فضا کی انگڑائیاں آدھے جلوے آدھی جھائیاں..... ظلمات میں آب حیات کا آب ارآب نوس کے شہر میں، مصر کا بازار..... ایک طرف مخمل کم خواب، سرمہ، کاجل، گیسو، ململ، کریب، اور ریسم اور ایک طرف افشاں] سلما، ستارہ، قشقہ، غازہ، گوٹا، کناری، سونا، چاندی، مرمر، لچکا، پٹھا، ابیرا اور گلال فضا پر سنہرے تاروں کا جال اور بڑی آہستگی کے ساتھ ابھرتا ہوا کندن کا تھال۔

شلنگیں بھرتا ہوا نیم کے نیچے گیا۔ شاخ پر چہچہاتی چڑیاں بھرا مار کر اڑ گئیں ہات پھیلا کر نیم کو چھاتی سے لگا لیا۔ ڈالی کو جھکا کر اس کی پتیوں کو چوم لیا۔ مرغان سحری کی بانگ لے خون کو گرما دیا..... دیوانہ وار مردانے میں پہنچا۔ دیکھا کہ میاں صحن میں رکھا ہوا ہے میانہ مجمل نظر آیا کہار چلمیں پی پی کر کھانس رہے ہیں ان کی کھانسی بھی اچھی لگی سپاہی لا الہ الا اللہ کہہ کہہ کر منہ دھو رہے ہیں ان کے چھپکوں کی آواز نے دل موہ لیا۔ پھاٹک کے قریب گھوڑے دمیں مار رہے ہیں کنویں کے پاس کھڑی ہوئی ہتھنی جھوم ہری ہے۔ الاؤ کے گرد پاسی بیٹھے تاپ رہے ہیں الاؤ کی اچھلتی آنچ میں زہرا کی کمر لچک رہی ہے۔ اور یہ سارا آسماں اندر کے اکھارے میں تبدیل ہو گیا ہے..... میں وحشی چکاورے کے مانند دوڑ کر سامنے کے کمرے میں داخل ہو گیا۔ کمرے کی سموئی ہوئی گرمی سردی سے جی خوش ہو گیا۔ میں ذرا سا مڑ کر ایک اور قد آدم آئینے کے سامنے جا کر اپنا منہ دیکھنے لگا۔ گالوں پر سرخی کے ہلکورے آنکھوں میں گلابی ڈورے..... چھریرا بدن پتلی کمر گھنیرے بال، پتلے پتلے ہونٹ لانبی لانبی پلکیں..... بر میں ریشمی کرتہ پر روئی بھری مخملی صدری سر پر آڑی جرنیلی ٹوپی ٹوپی کے گرد آگرے کا

سنہرا فیتہ اور داہنے کان میں ہلتا ہوا سونے کا جھلا جھل دراف میں کس قدر حسین ہوں زندگی میں پہلی بار اس کا پتا چلا اللہ بھلا کرے طلوع آفتاب کی رنگینی کا جس نے میرا پوشیدہ جمال مجھ پر آشکارا کر دیا۔

۱؎ ایک ادنی قوم جس سے زمیندار پولیس کا کام لیتا ہے۔

وہ جمال جو آگے چل کر زمین پر پاؤں نہ رکھنے والے مغرور حسینوں کو اپنے سروں میں جھکا لینے اور ایک دن پریاں حاضر ناز اٹھانے ہائے جوانی ہائے زمانے"۔ کا نعرہ لگانے والا تھا اور کو وہ آنی و فانی جمال کہ اب اس ارزل عمر میں جب کبھی وہ یاد آتا ہے تو ہر چند میرے مفکر شبیر حسن خاں پر قطعی ملال طاری نہیں ہوتا۔ لیکن میرے شاعر جوش ملیح آبادی کے دل سے خون کی بوندیں ٹپکنے لگتی ہیں۔ اور وہ چیخ اٹھتا ہے کہ:

ہم پر بھی حسینوں کا کرم تھا اک روز
اس قوم میں اپنا بھی بھرم تھا اک روز
بے زار نگاہوں کی گزر گاہ ہے اب
وہ چہرہ کہ نظروں کا حرم تھا اک روز

کردگارا پھول سے چہروں کو بتوؤں کی شکل میں تبدیل کر دینے سے آخر تجھے کیا مزا آتا ہے؟

گاؤں کا پہلا نظارہ.....

کرن پھوٹتے ہی ہمارا قافلہ چل کھڑا ہوا۔ میرے باپ آٹھ کہاروں والے میانے میں ضلع دار اور اقربا گھوروں پر میرے بڑے بھائی مشیر احمد خاں رام پوری، اور میں ہتنی پر اور باقی تمام خدمت گار سپاہی اور گڑیے ۲؎ پیدل۔

پانچ چھ میل کی مسافت طے کر کے جب ہمارا قافلہ حدود سید اپور ۳؎ میں داخل ہوا تو چوں کہ اس سے پیش تر میں نے کبھی گاؤں دیکھا ہی نہیں تھا۔ میری آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔

۱ زمیندار کا مقرر کردہ تحصیلدار ۲ وہ پاسی جو گاؤں میں پولیس کے فرائض انجام دیتے تھے ۳ ہمارے علاقے کا سب سے بڑا تخت گاؤں جس کا منصب تھا چاندی کا پرخالہ۔

اللہ اللہ تا حدِ نظر جھومتے لہلہاتے اور گنگناتے کھیت کھیتوں میں دھرتی ماتا۔ کی اگی ہوئی تمنائیں اور مستجاب دعائیں بیچ بیچ میں مانند زلف بتاں پیچ و خم کھاتی ہوئی پگڈنڈیاں چلتی بیڑیوں اور پرابیوں کی بدولت گہری گہری نالیوں میں شہر کے چولہوں کو آگ بخشنے والے بہتے پانی کی کڑ بڑ کڑ برسنہری اور ملائم کرنوں سے جھیل کی موجوں کی جھلمل جھلمل ساحل پر خوب صورت مرغابیوں کی قطاریں فرفشاں اور موجوں میں ان کی رہ رہ کر ڈبکیاں اور ملائم دوش پر کھیتوں کی تراوٹ اور بالیوں کی خوش بو اٹھائے ہوئے ٹھنڈے جھونکوں کی پاکیزگی و لطافت..... اور کھیتوں سے دور کچے کچے لپے تپے مکانوں کے چھپر اونچے اونچے کھلیان نکائیر نے والی جوان جوان عورتیں، اور لدر گدر چھوکریاں ادھر طوفان ادھر اٹھان۔ ان کے لال پیلے لہنگے اودی اودی چندریاں ان کے خالص ہا اور مسلسل محنت کے پروردہ چھلکتے شاداب چہرے اور گٹھے گٹھے چٹکتے بدن ایسے بدن کی پوری کسمسا کر انگڑائی آئے تو جلد مسک کر رہ جائے اور دیکھنے والے کے دل میں یہ آرزو دھومیں مچائے کہ انہیں چھوکر بھ دیکھا جائے کہ یہ بنی ہیں کن عناصر سے یہ سماں دیکھ کر میرے سینے کی تمام کھڑکیاں کھل گئیں رگ رگ میں بشاشت کے فوارے چھوٹنے لگے۔ نچلے پپوٹوں کے نیچے خنکی دوڑ گئی آنکھیں جیسے ایک دم سے بری ہو گئیں نگاہیں جھکیں تو اپنے چہرے کی سرخی نظر آ گئی۔ پور پور میں تازگی انگلیاں چٹخانے لگی۔ سانس لینے کا غیر محسوس عمل ایک محسو عیاشی بن گیا۔ اور میرے جسم کے اندر پو پھٹنے لگی سویرا ہو گیا۔

اسی عالم میں ہمارا قافلہ کھیتوں کے پیچ و خم سے گزرتا..... صدا ہاز میں بوس سلاموں کا صرف ایک سر کی جنبش سے جواب دیتا..... تنی کی بار بار بڑھتی ہوئی سونڈ

میں ٹوٹتے گنوں کی چٹاخ چٹاخ سنتا کورے پنڈوں کی کچی کچی لپٹوں میں جھومتا.....
اور پیتل کی جھلکتی چھلکتی گاگروں کے نیچے صراحی دار گردنوں اور پتلی پتلی کمروں کی لچک دیکھتا ہوا بالآخر تھانے پہنچ گیا۔

۱تعلقہ داروں اور زمین داروں کی قیام گاہ

ہمارے تھانے پہنچتے ہی رعایا جوق در جوق آنے اور ہم دونوں بھائیوں کے پاؤں چھو چھو کر نذرانے دینے لگی۔ اور ہم نذر کے روپوں کو سامنے کے کھرے تخت پر بری بے پروائی کے ساتھ کھنا کھن اور چھنا چھن ۱پھینکتے جاتے۔..... اور تھوڑی دیر میں پیاز کے قتلوں کے سے چمکتے سکوں کا تخت پر انبار لگ گیا پہاڑی سی بن گئی۔

رعایا جب روپیہ برسا چکی تو سیدالپور کے پستہ قد مہاجن بھلو شاہ ہاتوں میں سونے کی انگوٹھیاں پہنے اور چاندی کی شام اور لوہے کے گولے کی ہروتی باندھے جھکے جھکے آئے..... اپنے خادم کے سر سے روپوں کا بھرا ہوا چوٹی دار تھال اتارا..... اسے ہم دونوں بھائیوں کے سر پر تین بار بطور صدقہ گھمایا گیا اور پھر ایک برے کھنا کے سے تھال کا تمام روپیہ فرش پر گرا دیا خالص چاندی کے کھنکتے روپے فرش پر ادھر ادھر ناچنے اور دوڑنے لگے..... اور ہمارے خدام نے حسب دستور وہ تمام روپے لوٹ لیے۔ اس ہنگامہ رقص طلا کے بعد داب دوپہر کے کھانے کا وقت ہو گیا۔..... ۲جبر علی فقیر دسترخوان پر اپنے ہات کا پکایا کھانا چننے لگا۔ اور دم بھر میں ہمارے مراد ابیر اور برہمن کاشت کار اپنے اپنے سروں پر پکوان اٹھائے ہوئے آئے اور دیکھتے ہی دیکھتے ہمارے سامنے پوریوں کچوریوں بھانت بھانت ترکاریوں تلی مچھلی کے ٹکروں گلگلوں پھلکیوں دودھ دہی کی ہانڈیوں مٹھائیوں اور رساول کی بڑی بڑی لٹیوں کا ایک انبار لگ گیا۔

خاصہ تناول فرما کر میرے باپ نے حسب معمول اندر کے کمرے میں جا کر سو گئے..... میں بھی تکان محسوس کرنے کی بنا پر چاہ رہا تھا کہ تھوڑی دیر کے واسطے لیٹ جاؤں کہ باہر سے علام گیر پھپھا ۳کی گرجتی ااواز سنائی دی۔ باہر گیا تو دیکھا کہ ایک سر

سے پاؤں تک جھریوں میں لپٹا ہوا کاشت کار اپنے بیٹے کے شانے پر ہاتھ رکھے ہوئے پھپھا سے اپنی زبان میں یہ کہہ رہا ہے کہ خان بہادر صاحب آپ خود میری سامنے کھڑی ہوئی بیوی کو دیکھ لیں اس کو سوکھے کا روگ لگ گیا تھا۔ اس کی دادارو نے مجھ کو کھک کر دیا ہے آدھا لگان اب لے لیجیے آدھا دوسری فصل پر ادا کر دوں گا۔

---

[1] لکشمی دیوی اپنی اس اہانت کا مجھ سے اب انتقام لے رہی ہے۔ لیکن یاد رکھو دیوی جی میری پیشانی تمہاری چوکھٹ پر کبھی جھکی ہے نہ جھک سکے گی۔ [2] وہ ہمارے دس پانچ معلم کاشت کاروں میں سے ایک تھا جو بہت اچھا کھانا پکانا جانتا تھا۔ [3] پھپھا ہمارے پورے علاقے کے صدر ضلع دار بے حد شعلہ خو دشنام کار انسان تھے۔

اس کا یہ عذر سن کر پھپا نے اس کو ایک موٹی سی گالی دے کر کہا ابے ایک آنہ بھی کم نہیں لوں گا پورا لگان ادا کرو پورا..... اس بوڑھے پھوس نے تھرتھراتی ہوئی آواز میں کہا بھگوان کی قسم آدھے لگان سے زیادہ یرے پاس ایک جھنجی کوڑی بھی نہیں ہے۔ یہ سنتے ہی پھپا اٹھے اور ایک تھپڑ اس کے منہ پر اس زناٹے کا مارا کہ وہ دھڑام سے زمین پر گر پڑا اور اس کی مرجھائی ہوئی بیوی کی آنکھوں سے دھل دھل انسو بہنے لگے۔ اس کے بیٹے نے شرم سے آنکھیں جھکا لیں۔ گرے ہوئے بوڑھے نے اپنی روتی ہوئی بیوی اور اپنے جھینپے ہوئے بیٹے کو ایسی نظر سے دیکھا کہ میری سانس میرے گلے میں الجھ گئی اور پھر ایک دردناک چیخ مار کر میں تھانے میں داخل ہو کر اپنے سوتے ہوئے باپ کے سرہانے جا کھڑا ہوا۔ اور ہچکیاں لے لے کر رونے لگا..... میری ہچکیوں سے ان کی آنکھ کھل گئی اور انتہائی گھبراہٹ کے ساتھ انہوں نے مجھ سے پوچھا ارے کیا ہوا ارے کیا ہوا۔

میں نے اس بوڑھے کسان کی حالت اور پھپا کی شہادت کا سارا ماجرا بیان کر دیا..... میرے باپ کی آنکھیں نم ناک ہو گئیں صالح محمد خاں کو حکم دیا کہ اس بوڑھے کسان کو میرے پاس بلا لاؤ وہ بوڑھا میرے باپ کے قدموں میں گر کر کہنے لگا دہائی

خاں صاحب بہادر کی۔ اتنے میں اس کی بیوی بھی اپنے فرزند کے ساتھ آ گئی۔ اور وہ دونوں بھی زار قطار رونے لگے۔ میرے باپ نے انہیں تسلی دے کر گڑ بیتے کو حکم دیا کہ ماتا دین پٹواری کو بلا لاؤ پٹواری آ گیا تو انہوں نے فرمایا ماتان دین سیاہے میں اس مراد کے لگان کی پوری بیباقی درج کرلو اور اسی وقت رسید اس کے حوالے کر دو.....

میرے باپ کے ترحم آمیز برتاؤ کو دیکھ کر بوڑھے کسان اس کی اغر بیوی اور اس کے بیٹے کی آنکھیں شکریے کے آنسوؤں کی جھڑی برسانے لگیں۔ اور مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے کسی نے میرے دل کے زخم پر مرہ رکھا دیا ہے اور جب وہ تینوں آدمی جے کھان صاحب بہادر کی اے بھگوان کھان صاحب بہادر کا راج گنگا دھار تک رہے کہتے چلے گئے میرے تمام رونگٹے کھڑے ہو گئے مجھے اپنے باپ کی صورت اور بھی اچھی لگنے لگی اور عالم گیر پھپا سے ایسی نفرت ہوئی کہ جب میرا زمانہ آیا تو بڑے لطیف حیلے کے ساتھ میں نے ان سے ضلع داری نکال کر اپنی پھپی زاد بہن کے فرزند خواجہ احسن خاں کے سپرد کر دی لیکن خواجہ احسن خاں بھی برے ثابت ہوئے پھپا ننگی تلوار تھے تو وہ ٹھی چھری نکلے۔ غرض کہ..... رعایا کو آرام نہیں مل سکا۔

خیر یہ تو ایک جملہ معترضہ تھا..... جب رات کا وقت آیا تو میں کھانا کھا کر چارپائی پر دراز ہو گیا اور کہانیاں سنانے والے کہانیاں سنانے لگے۔

میرزا ایوب بیگ اور بنو خاں کے بعد جب رجب علی ظہور علی خاں کی باری آئی و انہوں نے ایسی دلچسپ کہانی سناء جس کے بعض حصے اب تک یاد ہیں۔ آپ بھی سن لیں:

''ایک بار اللہ کا کرنا کیا ہوا کہ ایک خوبصورت گبھرو جوان تاروں کی چھاؤں میں' نوکری کی تلاش کرنے کے واسطے اپنے گاؤں سے ایک شہر کی طرف روانہ ہوا.....

لق و دق میدانوں گہری ندیوں اور گھنے جنگلوں کو طے کرتا وہ اس وقت شہر کے کنارے پہنچا جب کی چیل انڈا چھوڑ دیتی ہے۔ تو دیکھا کہ حاشیہ شہر کے ایک چھوٹے

سے مکان کی دیوار پر ایک کبوتر بیٹھا دم ہلا رہا تھا بھوکا پیاسا تو تھا ہی جی میں آیا کہ کبوتر کو مار کر بھونوں اور کھا جاؤں۔ اس تمنا میں دن سے فیر کر دیا..... مقدر کی بات ہے کہ گولی کھا کر کبوتر ادھر نہیں ادھر مکان کے اندر گر گیا۔ سپاہی نے آؤ دیکھا نہ تاؤ بندوق کا کندہ لگا کر دیوار پر چڑھ گیا دیوار سے ادھر ادھر نگاہ دوڑائی کوئی نظر نہیں آیا دھم سے کود پڑا۔ کودتے ہی دیکھا کہ ایک خوب صورت جوان پٹھانی عورت' دالان سے نکل کر بال بکھرائے اس کی طرف چلی آ رہی ہے سپاہی سٹی بھول گیا۔

دراصل وہ تمام نظام ہی اس قدر ظالمانہ تھا کہ اس سے کسی نوع کی شرافت کا تصور ہی وابستہ نہیں کیا جا سکتا تھا۔ خدا بھلا کرے حکومت ہندو کا کہ اس نے ہر پٹی دار ہر نمبردار اور ہر تعلقہ دار ہر جاگیردار اور دیسی ریاستوں کے ہر تاج دار کو دار پر چڑھا کر اللہ کے کروروں بندوں کی گلی خلاصی کر دی۔ ہر چند تنسیخ جاگیرداری سے تباہی مجھ پر بھی آئی۔ لیکن کوئی پروا نہیں ایک میری بربادی سے نئے بے شمار انسانوں کو آباد کیا۔ جی ہاں آنکھ گئی پیر گئی نہ رہے بانس نہ بجے بانسری۔

زمین نے قدم پکڑ لیے۔ بھاگنے کی طاقت سلب ہو گئی کبوتر کو بھول گیا اور اس مورتی کو دیکھنے لگا..... عورت ڈھیٹ تھی ڈری نہیں اور بانکے سپاہیا کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہنے لگی ''پرائے گھر میں کود پڑے دھم سے یہ کون سی بھلمنسی ہے ت کوئی چور ہوا ٹھائی گیرے ہو ہت پھیریے ہو ڈاکو ہو' اچھا چھکا ہوا یا دیوانے؟''..... سپاہی نے سر جھکا کر سارا ماجرا بیان کر دیا۔ اور کہا جو چاہو سزا دے لو۔ بھوک میں مجھ سے بڑی بھول ہو گئی..... عورت نے کہا میں نے تمہاری سزا سوچ لی ہے ادھر آؤ میرے پیچھے پیچھے دالان میں سپاہی نے دل میں کہا کہ اس کی مار میں بھی مزا آئے گا۔ اسکے پیچھے گردن ڈال کر روانہ ہو گیا..... دالان میں پہنچ کر عورت نے کہا چٹائی پر بیٹھ جاؤ۔ سپاہی چٹائی پر بیٹھ گیا تو اس نے یہ کہہ کر اس کے سامنے کھانا رکھ دیا کہ پہلے کھانا کھلاؤں گی پھر تمہیں اس گھر میں کودنے کا مزا چکھاؤں گی۔ جب سپاہی کھانا کھا کر

ہاتھ دھو چکا تو عورت نے کہا اب میں تمہاری ناک چھیدوں گی اور اس میں نکیل ڈال دوں گی سپاہی اس کا منہ دیکھنے لگا اس نے گردن جھکا دی..... پھر خدا کا کرنا یہ ہوا کہ اس عورت نے اس کے گلے میں بانہیں ڈال کر پوچھا تم کون ہو گبھرو کی سانس تیز تیز چلنے لگی اس نے اپنا نام بتایا عورت نے پوچھا کہ کس کام کے لیے یہاں آئے ہو اس نے کہا میں سپاہی ہوں کسی رئیس کی ڈیوڑھی میں نوکری کروں گا۔عورت اس سے الگ ہو کر بیٹھ گئی۔اس نے منہ سے نکل گیا ارے عورت نے مسکرا کر کہا تمہاری سزا یہ ہے کہ تم آج سے میرے نوکر ہو گئے ہو کھانا پینا کپڑا التا میرے ذمے رہے گا..... تنخواہ تمہاری ایک روپیہ روز ہو گی تم کو منظور ہے سپاہی نے ریشہ خطمی ہو کر کہا جان و دل سے منظور..... عورت نے کہا لیکن ایک شرط یہ ہے کہ جب میرے میاں کے آنے کا وقت ہو گا اس سے آدھے گھنٹے سے پیش تر ہی تم میری سہیلی کے گھر جا کر ایک کوٹھری میں سو جانا جب وہ چلا جائے گا تو میں تمہیں بلا لیا کروں گی..... یہ دیکھو کونے میں سہیلی کے گھر کی کھڑکی ہے..... یہ کہہ کر وہ اٹھی اور اپنی سہیلی کو بلا لائی اور ساری بات اس کو سمجھا دی..... اور پھر اسنے سپاہی سے کہا کہ شام ہوتے ہی نہا دھو کر میری سہیلی کے ساتھ ایک تنبولی کی دکان پر جانا اور ایک روپ کی گلوری مانگنا..... اور گھوم پھر کر پھر گھر چلے آنا..... چناں چہ شام ہوتے ہی سپاہی نہایا دھویا عورت نے اس کو ایک ریشمی لنگی اور ململ کا دھلا ہوا ایک کرتا دیا اور ایک حریب اس کے سر میں تیل ڈالا کنگھی کرنے میں عطر ملا اور اپنی سہیلی کے ساتھ بازار روانہ کر دیا۔سہیلی نے دور اشارہ کر کے تنبولی کی دکان بتا دی سپاہی عطر کی مہک میں ڈوبا گیا اور ایک تو پیہ اس کے تھال میں پھینک کر کہا اے تنبولی ایک روپے کی گلوری۔

اس زمانے میں ایک پیسے کی گلوری ملا کرتی تھی اس لیے تنبولی ایک روپی کی ایک گلوری سن کر بھونچکا رہ گیا دل میں سوچنے لگا ہو نہ ہو یہ کوئی بھولا بھالا رئیس زادہ ہے۔ لیکن اس نے سوچا رئیس زادے بازاروں میں لنگی باندھے کہاں پھرتے ہیں۔سپاہی

نے تنبولی کو سوچتے دیکھا تو گرج کر کہا اے تنبولی ایک روپے کی ایک گلوری جلدی کر..... تنبولی نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر پوچھا میاں تم کون ہو اور اس نے کہا ہم سپاہی ہیں سپاہی' تنبولی نے دریافت کیا میاں کس ڈیوڑھی پر نوکر ہو؟ سپاہی نے کہا پورب کی طرف سے آتے ہوئے جو سب سے پہلا لال اینٹوں کا مکان ہے اس مکان کی مالکن کا سپاہی ہوں..... تنبولی نے گلوری تو اس کو دے دی مگر دل میں سوچنے لگا کہ یہ سپاہی جو مکان بتا رہا ہے وہ تو میرا ہی مکان ہے کیا میری عورت بگڑ گئی ہے لوگوں نے سچ کہا تھا کہ تم ادھیڑ ہو کر جوان عورت سے شادی نہ کرو نہیں تو دھوکا کھاؤ گے۔ ان تمام باتوں پر غور کر کے تنبولی نے وقت سے پہلے ہی اپنی دکان بند کر دی اور افتاں وخیزاں جا کر اپنا دروازہ کھٹکھٹانا شروع کر دیا۔

میاں کے قبل از وقت آنے پر تنبولن گھبرا گئی۔ سپاہی نے بندوق اٹھالی تنبولن نے بندوق چھین لی اور کہا جلدی سے بندوق سمیت اس سامنے والی کھٹیا میں جا کر کود پڑو..... سپاہی کھٹیا میں کود پڑا تنبولن نے سر میں پٹی باندھی اور دروازہ کھول کر کراہنے لگی تنبولی نے پوچھا دروازہ کھولنے میں دیر کیوں کی تنبولن نے کہا ارے دیکھ میرے سر کی پٹی درد کے مارے سر پھٹا جا رہا ہے۔ گڑمڑائی پڑی تھی کھٹ کھٹ سن کر بڑے جتن کر کے اٹھی ہوں تنبولی چپ منہ گھر میں گھسا اور چراغ ہاتھ میں لے کر ادھر ادھر گھومنے لگا۔ تنبولن نے کہا یہ آج تجھے کیا ہو گیا ہے کہ سارے گھر میں چراغ چھو چھو کرتا پھر رہا ہے تنبولی نے بگڑ کر کہا تیرے یار کو ڈھونڈ رہا ہوں..... یہ سنتے ہی تنبولن نے آنکھیں پھاڑ کر اور چھاتی پر گھونسا مار کر کہا یا اللہ یہ بھی سننا تھا مجھ کرموں جلی کو۔ ارے میں اور یار اگر میں ایسی ہوں تو بجلی گر پڑے مجھ پر۔ علی کی تیغ ٹوٹے مجھ نگوری پر..... تنبولی نے کڑک کر کہا اگر تیرا کوئی یار نہیں تو پھر میری دکان پر ایک روپے کی گلوری کھانے والا کون آیا تھا۔ اور میرے مکان کا پتہ یہ کس نے بتایا تھا؟ تنبولن نے سر پیٹ کر کہا ارے مورکھ اب میں بات کی تہہ کو پہنچ گئی تو یہ سارا سوانگ س مورے ابھرا ہوا ہے جو چاہتا

ہے مجھ سے تجھ سے چھٹم چھٹا ہو جائے تو مجھے فارخطی دے دے اور تھو تھو سات سمندر پار پھر وہ مجھ سے بیاہ رچا لے۔ ارے اس موئے کے منہ کو لو کا۔ اگر تو کدا نہ کرے شیطان کے کان بہرے مجھے چھوڑ بھی دے گا تو پھر بھی اس اٹھائی گیر کے منہ پر نہیں تھوکوں گی۔ وہ تو دو کوڑی کا بچوڑا ہے میں تو کان پکڑ کے اور توبہ توبہ کر کے کہتی ہوں کہ تیرا منہ دیکھ کر اب کسی ہفت اقلیم کے بادشاہ کا منہ بھی نہیں دیکھوں گی۔

تنبولی نے کہا بتاوہ ہے کون بدمعاش؟ تنبولی نے منہ پر انگلی مار کر کہا میرے قریب کان لا۔ اور پڑوس کے گھر کی طرف اشارہ کر کے کہا یہ سارا بس اسی بدمعاش کا بویا ہوا ہے۔ اس کے گھر والی تو جانتا ہے کہ میری بڑی اچھی سہیلی ہے۔ خود اس نے میرے کان میں کہا تھا کہ میرے خصم کا جھ پر دانت ہے ہشیار رہنا۔ سدا تو ابھی چپ رہنا میں اپنے چاروں بھائیوں کو بلا کر اس کی ایسی مرمت کروادوں گی کہ اس کا سارا نشہ ہرن ہو جائے گا۔

تنبولی کو یقین آ گیا کہ بس یہی بات ہے۔ اور اسی بددذات نے یہ شوشہ چھوڑا ہے اس نے پشیمان ہو کر سر جھکا لیا اور جب تنبولن نے دیکھ لیا کہ اس کا جادو چل گیا ہے تو وہ امٹھ ڈھانپ کر رونے لگی۔ اور تنبولی کہنے لگا کہ اری مجھ سے بڑی چوک ہو گئی کہ اول فول بکنے لگا۔ ماف کر دے مجھے تنبولن نے ڈھیلے ہاتھ سے اس کے منہ پر تھپڑ مار کر کہا جا برے پیر کی نیاز دلاؤں گی بزاز سے لڈو لے آ..... یہ انہیں کی برکت ہے کہ میری بات تجھ مورکھ کی سمجھ میں آ گئی۔

تنبولی جب باہر چلا گیا تو لڈو لانے تنبولن نے کھٹیا میں منہ ڈال کر کہا ہوڑی دیر سسیجا بیٹھا رہ ابھی تجھے تازے تازے لدو کھلاؤں گی اور جب موا بڈھا چلا جائے گا تو تجھے باہر نکالوں گی۔ اسکے بعد کھڑکی میں منہ ڈال کر اپنی رازدار سہیلی کو بھی اس نے اپنے پاس بلا لیا۔ اور یہ سارا ماجرا اس کو سنا دیا سب سے پہلے اس کی سہیلی نے اس پر بڑے پیر صاحب کی نیاز دی پھر تینوں نے مل کر لڈو کھائے۔ اور جب آدھے سے کچھ

کم لڈو رہ گئے تو اس نے اپنے میاں سے کہا کہ تو بڑا نشانہ باز بنتا ہے۔ تو سہی کھٹیا کے اندر لڈو پھینک' اگر ایک لڈو بھی نیچے گر گیا تو ہار جائے گا۔ اور سانولیا اتے ہی لڈو تو پھر لائے گا۔

تنبولی نے ایک ایک کر کے تمام لڈو کھٹیا کے اندر اتار دیے اور قہقہہ مار کر کہا دیکھا میرا نشانہ تنولن نے اٹھ کر تنبولی کی پیٹھ ٹھونکی اور پڑوسن کی طرف دیکھ کر آنکھ ماری۔

جب دوسری شام آئی تو سپاہی نہا دھو کر پھر تنبولی کی دکان پر پہنچا سپاہی کو دیکھ کر تنبولی کی آنکھوں میں خون اتر آیا مگر وہ غصہ پی گیا..... سپاہی نے دو روپے جیب سے نکال کر اس کے تختے پر پھینک دیے اور کہا اے تنبولی دو روپے کی ایک گلوری..... تنبولی نے رندھے ہوئے گلے کے ساتھ کہا دو روپے کی ایک گلوری!..... سپاہی نے کہا ہاں ہاں دو روپے کی ایک گلوری..... تنبولی نے گلوری دے کر کہا میاں سپاہی یہ تم کو یہاں روپے دے کر کون بھیجتا ہے سپاہی نے کہا ارے وہی لال اینٹوں کے مکان والی جس نے ہم کو نوکر رکھا ہے تنبولی نے پوچھا میاں سپاہی کل بھی وہاں گئے تھے؟ اس نے کہا گئے کیوں نہیں تھے ہم تو نوکر ہی اس بات کے ہیں اور یہ کہہ کر اس نے گزشتہ رات کا سارا ماجرا اس کو سنایا اور پھر قہقہہ مار کر کہا عورت ہو تو ایسی ہو اس نے اس سالے کے ہاتھوں سے مجھے کھٹیا میں لڈو بھی کھلوا دیے..... تنبولی کا خون کھولنے لگا اور سپاہی جانے لگا تو اسنے دانت پیس کر کہا میاں سپاہی آج بھی وہاں جاؤ گے؟ سپاہی نے بگڑ کر کہا یہ بیر بیر (بار بار) کا پوچھنا کیا ابے کہہ تو دیا کہ ہم تو نوکر ہی اسی بات کے ہیں۔

تنبولی کے تن بدن میں آگ لگ گئی جلدی جلدی دوکان بند کی راستے میں مٹی کے تیل کا پھیا لیا۔ دیا سلائی جیب میں رکھ لی گھر آتے ہی دروازہ پیٹنا شروع کر دیا تنبولن نے یار کو صندوق میں چھپا کر دروازہ کھول دیا اسنے گھر میں قدم رکھتے ہی تنبولن کو گالیوں پر دھر لیا۔ تنبولن نے کہا ارے کیا آج چرس پی کر آیا ہے۔ تنبولی نے کہا تیرا خون پینے آیا ہوں۔ کل تو نے اپنے دھگڑے کو کھٹیا میں چھپا کر میرے ہات سے اس

حرامی کو لڈو کھلوائے۔ لے چھنال آج میں دربار ہی پھونکے دیتا ہوں ی کہہ کر اس نے ہر طرف تیل چھڑک کر مکان کو آگ لگا دی۔ اور گھر دھڑ دھڑ جلنے لگا پڑوسن بھی آ گئی دو ایک پڑوسی بھی دوڑ کر آ گئے تنبولن نے ان سب سے کہا کہ ارے لوگو یہ تو دوانا ہو گیا ہے ارے جس صندوق میں اس موئے کے باپ دادا کے کاغذات گھر کا سارا زیور اور مال تال رکھا ہوا ہے اس تو ہاتھ لگا کر نکال لاؤ ابھی ادھر آگ نہیں گئی اگر وہ صندوق بھی جل گیا تو غضب ہو جائے گا۔ پڑوسیوں نے مل کر وہ صندوق باہر نکال کر انگنائی میں رکھ دیا۔ اور جب صندوق باہر آ گیا تو بی تنبولن نے اپنے بال نوچ نوچ کر اپنی چھاتی کوٹ کوٹ کہنے لگی ارے خدائی خوار سنے پورے ہو گئے اس بدمعاش کے ارے میری سہیلی سے پوچھ کر اس کی تہہ میں کیا بات تھی تنبولی دوڑا ہوا سہیلی کے پاس گیا۔ اس نے اس کے کان میں کہا کہ جب تو کھٹیا میں لڈو پھینک رہا تھا تو میرا پاپی خصم موکھے سے جھانک رہا تھا۔ اس نے اپنی آنکھوں سے یہ سارا تماشا دیکھا۔ اور اپنے گھر گے کو تیرے پاس بھیج دیا کہ وہ تیرے سامنے رات کی ساری بات دہرا دے اور تجھ کو یقین آ جائے کہ تیری بیوی بگڑ چکی ہے اور دھگرا پالے ہوئے ہے اور آخر کو تو اس کو فارخطی دے دے اور وہ گل چھڑے اڑانے لگے۔ وہ جو کہتے ہیں کہ بات پاچھ پتا مار کے تو نے ٹھنڈے دل سے بات نہیں سنی' اور تیسے میں آ کر لاکھ کا گھر' خاک میں ملا دیا..... تنبولی سر پکڑ کر خاک پر بیٹھ گیا۔ اور ندامت کے مارے پسینے پسینے ہو گیا۔ اتنے میں تنبولن آئی اور کہا اب پچھتائے کیا ہوت ہے جب چڑیاں چگ گئیں کھیت دیکھ یا تو نے اگر میرا دھگرا یہاں ہوتا تو اس کی جلی ہوئی لاش تو تیرے سامنے آ جاتی۔

سہیلی نے آ کر کہا کہ ارے دیر نہ کر یہ سامنے موڑ پر ٹیٹوں اور ٹھاٹھروں کی دکان ہے جا کر کچھ ٹٹیاں اور تھاٹھر لے آ جسے مکان کے چاروں طرف لگا دیں اور جو ایک کوٹھری جلنے سے رہ گئی ہے اس کو بھی رہنے کے لیے اچھی طرح گھیر لیں..... نہیں تو رہے گا کہاں۔

تنبولی ٹٹیاں اور ٹھاٹھر لینے کے لیے جب چلا تنبولن نے جھٹ صندوق کھول کر پسینے سے تر بتر سپاہی کو باہر نکالا اور گوپھے میں لے کر سہیلی کے گھر پہنچا دیا

بھیا ایسی ہوتی ہیں چلتر باز عورتیں یہ کہہ کر ظہور علی خاں نے کہانی ختم کر دی۔

چوتھی کی دلہن یعنی طلوع سحر کا دوسرا دیدار

چوکی دار کی آواز سے جب منہ اندھیرے آنکھ کھلی تو دیر تک یہ بات سمجھ میں ہی نہیں آئی کہ آ کر میں ہوں کہاں..... آنکھیں مل مل کر بڑی حیرانی کے ساتھ بدلے ہوئے ماحول کو دیکھنے لگا۔ اور دس پندرہ منٹ کی حیرت کے بعد حافظے کا مطلع صاف ہو گیا تو یاد آ گیا کہ میاں کے ساتھ سیدا پور آیا ہوں..... طلوع سحر کا مزا تو منہ کو لگ ہی چکا تھا۔ میں بستر سے اٹھا اور تھانے کی چھت پر چڑھ گیا۔ تھانہ سطح مرتفع پر بنا ہوا تھا جس کی چھت سے تمام گاؤں نظر آ رہا تھا.....

چھت پر گیا تو نسیم صبح میری رضائی میں آ کر مچلنے لگی۔ رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ سردی زیادہ تھی نہ کم ایک طرب انگیز جھرجھری سے غنچہ خاطر چٹک گیا..... دل میں وہ راگنی چھڑ گئی جس کو انسانوں کے گلے یا ساز کے تار گرفت میں نہیں لا سکتے۔ دھندلکے نے اپنے گھونگھٹ کے پٹ کھول دیے۔ آسمان نے زمین پر موتی رول دیے..... ولولہ نشاط نے مور کی طرح ناچنا شروع کر دیا..... آسمان کی طرف نگاہ اٹھائی۔ دیکھا کہ فضا کی محل سرا کے سیاہ پردے ایک ایک کر کے اٹھ رہے ہیں۔ لیلائے شب مستی کی دھڑی اور افشاں چھڑا کر اور رنگین آنچل سے کاجل پونچھ کر سرخ شلوکا پہن رہی ہے۔

سرمی وادیوں میں مقیش کے خیمے نصب ہو رہے ہیں۔ تارے کانپ کانپ کر کجلائے جا رہے ہیں۔ افق کے ملگجے پردوں کے پیچھے ایک نیم روشن نور کا دائرہ گھوم رہا ہے۔ اور اس کے گرد ایک سنہرا حالہ بنتا چلا جا رہا ہے۔ اور چند لمحوں کے بعد پھر یہ دیکھا کہ مشرق کا گریبان مسکنے لگا ہے۔ اور مسکتے مسکتے چر سے پھٹ گیا..... ھر وہ دائرہ نور سونے کا تھال بننے لگا۔ تھال کا ایک سرا کسی غرفے سے جھانکنے والی پیشانی کے مانند

دور سے دمکنے لگا۔ پھر اس کو ایک سیاہ جونا صاف کرنے لگا..... پھر وہ جانا غائب ہو گیا..... آدھا تھال سامنے آ گیا..... اور ایسا نظر آیا کہ ماہ کنعاں کا ماتھا کنویں سے نکل کر جگمگا رہا ہے پھر کیا تھا چڑیاں چہکنے ڈالیاں کچلنے اور مرغان سحر بانگ دینے لگے۔ کعبہ نور میں اذاں ہونے لگی آسمان دائرہ بجانے لگا۔ زمین چوڑیاں کھنکانے لگی۔ جھیل نے انگڑائی لی پانی میں سونا پہنے لگا دولھا گھوڑے پر سوار ہو گیا براتی دھومیں مچانے لگے اور کڑم دھم کڑم دھم کی زمین پر شہنائیوں کی پھوار پڑنے لگی..... اری آج آئے سیاں..... مرے آج آئے سیاں سکھی سوئے بھاگ جاگے..... مرے تن میں راگ جاگے..... مری تھامنے کو بہیاں مرے آج آئے سیاں مرے آج ائے سیاں!!

میرا ختنہ

لیجیے اپنی بسم اللہ کی طرح اپنے ختنے کا ذکر کرنا بھی بھول گیا۔ آگے بہت آگے نکل گیا کیا کروں اب سنائے دیتا ہوں کوئی پنواڑ تو ہے نہیں..... میرا ختنہ کم سنی میں ہوا تھا۔ اور خوب یاد ہے کہ دادا میاں نے فرمایا تھا کہ دیکھ بیٹا رونے کی آواز منہ سے نہ نکلنے پائے..... لیکن لال داڑھی کے جاں علی حجام نے گھوڑی چڑھا کر جب گھٹ سے میرا ختنہ کر دیا..... میری چیخ نکل گئی۔ دادا میاں کے ماتھے پر بل پڑ گئے تھے..... اور میں فرط شرمندگی سے گڑ کر رہ گیا..... اور آج بھی دادا میاں کی پیشانی کے بل جب یاد آتے ہیں تو دل پر کٹاریاں سی چلنے لگتی ہیں۔

ہر چند میرے ختنے کی رسم بڑی دھوم دھام سے منائی گئی تھی..... دیگیں چڑھی تھیں طوائفوں کے مجرے ہوئے تھے کشمیریوں نے نقلیں کی تھیں مگر میرے دل کی کلی مرجھائی سی رہی تھی۔ اسی مرجھاؤ کے دو اسباب تھے پہلا سبب تو وہی میری ختنے کے وقت کی چیخ تھی اور دوسرا سبب یہ تھا کہ میرے ختنے کی خوشی میں جس بوقت ملیح آباد کے ایک لہار نے ایک بڑی خوبصورت اور جھلجھلاتی کرچ بطور نذر پیش کی تھی تو اس کرچ کو ہات میں لیتے ہی مجھ پر ایسا جنون طاری ہو گیا تھا کہ میں نے اپنے غلام

زادے حسین بخش کے ننگے سر پر وہ کرچ کھینچ سے ماردی تھی اور اس بے چارے کے سر سے دھل دھل خون بہنے لگا تھا خیر اس کی تو فوراً مرہم پٹی اور اس کے باپ کی منہ بھرائی کردی گئی تھی۔ لیکن میرے دل کا زخم بھر نہیں سکا تھا۔ اور مجھے خوب یاد ہے کاشمیریوں کی ہنسانے والی نقلیں بھی مجھ کو ہنسا نہ سکیں تھیں۔ دل ہی تو ہے۔

☆☆☆

www.IqbalCyberLibrary.Net
All rights reserved.
©2002-2006

موسموں کے تاثرات اور میرے زمانے کے تہوار

موسم گرما

ارے چھٹے سے منہ کا موسم گرما..... دھوپیا دندکیا' دہکاریا..... پسینیا نچوڑیا' بھاڑیا' بھنبھوڑیا' تنوریا' چنگیزیا' چنگاریا..... اکل کھرا جل ککڑا گھننا..... دورھا' بردتا' سبرا' ہبڑا' بھینگا' بڑدتا' شیاطین کی آنکھ کا تارا لوکا راج دلارا الاؤ کا گھوارہ' اور شعلوں کا فوارہ..... خونی ریچھ' لاگو بھیڑیا اور بندیل سور۔

نفرت ہے مجھ کو اس محرور المزاج مغضوب' معتوب اور مردود شہدے سے..... اس کی صحبتیں بھی چنگاریاں اس کی شامیں بھی کٹاریاں..... اس ک شعلہ خو آفتاب دریچہ افق سے ایک بدتمیز گنور کے مانند بھق سے نکلتا ہے اور نکل کر فوراً آگ برسانے لگتا ہے..... اس کی بے مہر کرنیں عیاذ اللہ..... گویا جلمی پاپی اور بوڑھے سود خوار لالہ رام لال کی نگاہ۔

اس کٹنے چمار موسم میں جس حرام زادی لو کے جھکڑ غاؤں غاؤں' اور ہو ہو ہو ہو کرتے چلتے ہیں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گویا ساتویں جہنم کے گنڈے فرشتے آتشیں گرز مار مار کر زمین کو ماں بہن کی گالیاں دے رہے ہیں۔

جب یہ خبیث موسم آجاتا ہے تو دوپہر سے تپش تر ہی ہم سب بچوں کو مرغیوں کی طرح کڑی کڑی کر کے خس خانے میں بند کر دیا جاتا تھا.....

سقفی پنکھے کی سریلی چوچوں کارٹیٹوں پر پانی چھڑکے جانے کی جھنکار ننھی ننھی بوندیوں کی پٹکار..... خس کی سوندھی سوندھی' اور عطر خس کی بھینی بھینی مہکار..... ان سحر کاریوں کے آغوش میں ایسی ٹھنڈی میٹھی مہکتی اور گہری نیند آجاتی تھی کہ شام سے پہلے ہم میں سے کسی کی آنکھ نہیں کھلتی تھی۔

اور جب شام کو ہم خس خانے سے نکلتے تھے تو انگنائی کے چھڑکاؤ کی سوندھی سوندھی خوش بو ہمارا استقبال کرتی تھی۔ ہم سب بھائی بہن تختوں کے چوکوں اور آرام کرسیوں

پر آ کر بیٹھ جاتے اور تاڑ کے بڑے بڑے پنکھے حرکت کرنے لگتے تھے..... تربوزوں اور خربزوں کی قاشوں بالائی کی قفلیوں اور آب خوروں نمش کے تھلوں اور فالودے کے برف میں جھلے گلاسوں سے ہم سب کی ضیافت کی جاتی تھی۔ اور رات کو بڑے سے آنگن میں ہم سب کے پلنگ اونچے اونچے کھمبوں پر لٹکے ہوئے جھالردار پنکھوں کے نیچے بچھا دیے جاتے اور علاقے سے باری باری آنے والی عورتیں صبح تک پنکھوں کی ڈوریاں کھینچا کرتی تھیں۔

موسم سرما

آیا میرا کنور اجاڑے کا دوار!

آہا..... جاڑا..... چمپئی شربتی گلابی جاڑا..... کندن سی دہکتی انگیٹھیوں کا گل زار

یہ بات مجھے آج تک یاد ہے کہ ایک بار پچھلے پہر دھماکوں سے میری آنکھ کھل گی تھی اور یہ دیکھ کر میرے دل پر سانپ لوٹ گیا تھا کہ ہمارے گھر کی مغلانی حیدری خانم نوخیز پنکھا جھلنے والی کی پیٹ پر یہ کہہ کر گھونسے مار رہی ہے کہ مردار پسنیا پنکھا جھلکے آئی ہے کہ پاؤں پسار کے خراٹے لینے کے لیے بوڑھی حیدری خانم کی بے مہری اور نوخیز پاسن کی بے کسی دیکھکر میرے دل پر اسی چوٹ لگی تھی کہ پھر میں سو ہی نہیں سکا تھا۔ اس واقعے کے بہت دن بعد ہمارے گھر کی کسی تقریب میں جب ایک طوائف نے یہ ٹھمری شروع کی تاری جیہو ڈلائے جا گہ بنیا ڈلائے جاؤ بنیا ماری جمبو ڈلائے جاؤ بنیا (پنکھا جھلتی رہو ورنہ ماری جاؤ گی) تو اس گدبدی نوخیز پاسن کی پیٹ پر حیدری خانم کے دھما دھم گھونسوں کی یاد نے میرے دل کو ہلا کر رکھ دیا تھا۔ ہائے پرانی یادیں ہائے پرانی چوٹیں۔

دل کی چوٹوں نے کبھی چین سے رہنے نہ دیا
جب چلی سرد ہوا میں نے تجھے یاد کیا!

لچکے پٹھے کی رضائیوں میں لپٹا ہوا دل دار..... دل کا سرور آنکھوں کا

نور..... دھندلکے کا راگ..... جھٹپٹے کا سہاگ..... زلیخا کا خواب یوسف کا شباب ..... خدیو بربط و چنگ شاہ زادہ رامش و رنگ روئی دوئی کا بیتا۔ مسلم کا قرآن ہندو کی گیتا..... اور صبح کو سونے کا جال۔ رات کو چاندی کا تھال.....

قصیر النہار طویل الیل..... تنگ آستین دراز گیسو..... موتی کی آب موتیے کی اوس ..... رگوں میں چٹکیاں لیتی سردی چہروں پر انگڑائیاں لیتی سرخی..... مہکتے لحافوں کی نیند چٹکتے انگاروں کا ناچ..... شمس در آستیں قمر جبیں..... ٹھڈی تارا ماتھے چاند..... ماہ روسوسن خوبھرو لچکیلا چھوہرا چٹکتا' مدھ بھرا' بانکا ترچھا' نکیلا' لپیٹا' رسیلا' چھبیلا' سجیلا' سانولا' سلونا' اور سہانا جاڑا۔

ہائے وہ ماہ پوس کی کالی کالی زلفوں والی یخ میں جھلی انگیٹھیوں کی سموئی ہوئی جادو بھری خاموش لمبی لمبی راتیں..... وہ اونچے اونچے دروں کے بھاری بھاری پردے مسہریوں کے سامنے وہ تختوں کے چوکیچوکوں پر وہ مخمل کے گدے اور گاؤ تکیے اور تکیوں پر ٹیک لگائے اور پاؤں پر دوشالے ڈالے وہ گھر کی بڑی بوڑھیاں..... دائیں بائیں چاندی کے اونچے اونچے اگال دان۔ رہ رہ کر کھلتے اور بند ہوتے پاندان اور وہ ڈلی کے کٹنے کی کٹاکٹ آوازیں دوسرے تخت پر وہ رضائیاں اوڑھے ہوئے کہانی کہنے والیاں۔ ان کے پیچھے اونچے اونچے موبافوں کی مامائیں اصیلیں' اور لونڈیاں باندیاں پشت پر اگردان بیچوں بیچ انگیٹھی انگیٹھی میں چٹکتے کوئلوں کی چٹکار اور سنہری آنچ کا ناچ۔

اور ہائے مواقع و مناظر کا بیان کرتے وقت کہانیاں کہنے والیوں کے وہ بار بار' نئے نئے روپوں میں ڈھلتے چہرے' آنکھوں کے بار بار بدلتے اشاروں' اور حسب حال بڑھتے گھٹتے ابھرتے ڈوبتے لہجوں کے کٹاؤ اور ٹھہراؤ کے ساتھ وہ کہانیوں کا ان الفاظ میں آغاز۔

''کہانی سی جھوتی کوئی بات نہیں کہانی سی میٹھی کوئی چیز نہیں۔ جھوٹ سچ کہانی

بنانے والے کی گردن پر کہانی بنانے والے پر عذاب سننے والوں کو ثواب..... آدھی رات ادھر آدھی رات ادھر سوئے سنسار جاگے پاک پروردگار..... ایک تھا بادشاہ..... ہمارا تمہارا خدا بادشاہ۔ اس بادشاہ کی ایک چاندسی بیٹی۔ سو اللہ کا کیا کرنا ہوتا ہے کہ وہ شاہزادی ایک دن سہیلیوں کے ساتھ باغ میں ٹہل رہی تھی کہ.....''۔

ہر چند اب وہ دن ہیں نہ وہ راتیں لد چکے ہیں وہ زمانے بیت چکی ہیں وہ گھڑیاں' اور روت کی نیند سو چکی ہیں وہ کہانی کہنے والیاں۔ اور قبر کی جانب مڑ چکی ہیں میری عمر لیکن ان کہانیوں کے بھوتوں کے غل غپارے۔ ان کے اندر کے اکھاڑے۔ ان کی پریوں کے غول' ان کے گل فاموں کی ٹھول ان کے آ گیا بیتالوں کے اشارے' ان کی راگنیوں کے مڑتے دھارے۔ ان کے طوفان میں پھنسے بیڑے ان کی برساتوں کے دریڑے ان کے موتی برساتے سویرے ان کے ہونکتے جنگلوں کے اندھیرے۔ ان کے شاہوں کا جلال' ان کی شاہ زادیوں کا جمال ان کا فراق و وصال ان کی آہیں اور کراہیں' ان کے گانے اور شادیانے۔ میرے دل میں ٹوٹتے ہوئے شیشوں کے نکیلے ٹکڑوں کے مانند آج بھی چبھتے اور کھٹکتے رہتے ہیں۔ یا اللہ کیا کروں اے میرے بچپن کی اداس انگیٹھی!۔

جن کو بھلا چکی ہیں ہماری جوانیاں
اب ان میں تجھ کو یاد ہیں کتنی کہانیاں؟

موسم برشگال

روم جھوم بدرو ابر سے پی درشن کو جی ترسے

رو م جھوم، بدرو ابر سے

امیری نظم انگیٹھی ملاحظہ فرمائیے۔ جو میرے کسی مجموعے میں چھپ چکی ہے۔

اوہو جھومتی جمکتی، جھولتی، جھر جھراتی، جھم جھماتی، جھم جھم برستی، جوبن والی، جونتی برسات۔ گھپ اندھیروں اور گھنگھور گھٹاؤں کی چھاؤں میں گھرتی گھومتی گھمرتی گنگناتی گمکتی، گاتی، گونجتی، گھڑ گھڑاتی، گھونگرو والی برکھا۔

آسمان کو گھماتی زمین کو نچاتی، فضا کو چلاتی، شمس وقمر کو گہناتی، چوبای کو تھپتھپاتی، طوفان پر طوفان اٹھاتی زلفیں چھٹکاتی، کجریاں سناتی، کھیتیاں لہلہاتی، زمین کی پوریں چٹخاتی، اور چھڑے کو کڑے سے لجاتی برکھا۔ ابر سیاہ بیاباں در بیاباں گلستاں در گلستاں، گل چکاں، گوہر فشاں، رقصاں، پراں، غلطاں، رواں، رواں دواں، آسماں پا بجولاں، زمین کشاں کشاں لکے بال کشا و نعرہ زناں، اور سر سے پاؤں تک دھواں ہی دھواں۔

اف وہ بجلیوں کی کڑک وہ بدلیوں کی لٹک اور وہ بانکی دھنک۔ وہ مینڈکوں کا شور اور وہ پروا کا زور اور وہ گھٹائیں گھنگھور..... وہ جھینگروں کی جھنکار، وہ موروں کی پکار، اور نہروں پر وہ مرغابیوں کی قطار اندر قطار..... وہ شاخ شاروں کی گلگپ وہ انبیوں کی ٹپاٹپ..... وہ امیروں کے جھومتے جھولے، وہ الھڑوں کے گھومتے کولے..... وہ برستے گیت پر گیت، وہ مچلتی پیت کی ریت۔ وہ یاروں کے چہچہے وہ نگاروں کے قہقہے..... وہ آڑی ترچھی پھواریں وہ ستاروں کی آریں آریں..... وہ ہوا کی گھوم وہ بوچھاڑ کی چھوم..... وہ متوالی پی ہو..... وہ نشیلی کوکو..... وہ جگنوؤں کے غول وہ بارہ ماسوں کے بول..... وہ دوب کا مخمل وہ بیر بہوٹیوں کی ہلچل..... وہ جل تھل میدان وہ پرنالوں کا ہیجان۔ وہ موجوں کی روانی وہ دھرتی بورانی..... وہ ماچھا جوں پانی وہ چھوکریوں سے چھیڑ خانی اور وہ ہائے زمانے ہائے جوانی۔

اللہ اللہ وہ مچلتی گھٹائیں وہ چڑھتے دریا وہ گرجتے نالے وہ تھرکتے ولولے وہ کوکتی ترنگیں، وہ ابلتی امنگیں، وہ چہکتے رنگ.....اور وہ زبردست و پرشور دونگڑے، اور ایسی گرجتی پروائی کی دھرتی بولے رام دھائی ! جب موسلا دھار پانی برستنے لگتا تھا میں رسیاں تڑا کر انگنائی میں آ جاتا تھا عورتیں چیختی تھیں کہ ارے نہ بھیگ بخار آ جائے گا۔ میں کسی کی پروا نہیں کرتا تھا۔ صحن کے گوشے گوشے میں قلقاریاں مارتا، دھومیں مچاتا اچھلتا کودتا، دندناتا تالیاں بجا بجا کر، برسو رام دھڑاکے سے اور کوڑی گئی ریت میں پانی گیا کھیت میں کے نعرے لگاتا پھرتا تھا۔

جب پانی برس کر کھل جاتا تو، باورچی خانے سے برآمدے میں کڑھائیاں چڑھ جاتیں اور برساتی پکوان یعنی پوریاں کچوریاں، اردیاں، پھلکیاں وہی بڑے برہیاں چنے کا بھرتا، اندرسے گلگلے چل دندان مصری اور مولی کے پتے پکنے لگتے تھے۔ اور انگنائی کی نہاء ہوئی کڑوی کڑوی خوشبو والی نیم کی بھیگی شاخوں میں جھولے ڈال دیے جاتے تھے۔ اور ہم سب لوڈیتی شوخیوں کے ساتھ جھولنے لگتے تھے۔ جن میں کچھ منہ بند کلیوں کے مانند کچی کچھ گدر اور کچھ ایسی جوالا مکھی کی سی جوانیوں والی ہوتی تھیں کہ اگر بھرپور انگڑائی لے لیں تو انگیا کے بند ٹوٹ جائیں اور وہ مسک کر پارہ پارہ ہو جائے۔

ہائے وہ پانی برکھا کے نکھیلے کافر گیت..... جو ٹھنڈی ہوا اور رنگین فضا سے تیرتے میرے کانوں تک آتے اور ریرے ملائم سینے میں کھچ سے چبھ جایا کرتے تھے۔ اور جب ان بولوں کے کٹاؤ ان دیکھے منظروں اور اجنبی مکھڑوں میں تبدیل ہو کر میری نظروں کے سامنے بڑی تیزی کے ساتھ، گزرنے لگتے تھے تو حیرت اس بات پر ہوتی تھی کہ یہ ان دیکھے پربت، یہ کھیت، یہ جل تھل میدان اور یہ اجنبی جگر جگر مکھڑے کس دیس کے ہیں۔ اور آخر اس وقت مجھ کو یہ رونا کیوں آ رہا ہے۔

ایسی برکھارت میں ہماری انگنائی کے بیچوں بیچ ایک روز آنسوؤں اور ہچکیوں کا ایسا

موسلا دھار پانی برسا تھا کہ ہمارا گھر اس میں ڈوب گیا تھا۔

سنیے اس کی داستان۔

ایک دن جس وقت کہ ہم لوگ جھول جھول کر کجریاں سن رہے تھے اور باورچی خانے کے برساتی پکوانوں کا نمکین دھواں نیم کی شاخوں کے نیچے مچل رہا تھا کہ میری کھلائی ہانپتی کانپتی لکڑی تیکتی آئیں گانے والیوں سے کہا بچیو ذرا ٹھہر جاؤ آج یہ پھوس بڑھیا گائے گی۔ وہ سب کی سب پیچھے سرک سرک کر بیٹھ گئیں۔ بڑی بی نے اپنے سر کی چادر پھینک دی اور ان کے سفید بال اڑنے لگے۔ اور اپنے سینے پر ہاتھ رکھ کر بڑے درد ناک لہجے میں گانا شروع کر دیا۔ گانا نہیں یہ نوحہ شروع کر دیا ہائے تمرے پنا برکھا ما سہائے ارے مورے کلکتے اِکے جویا اللہ تمہیں لائے ہائے اللہ تمہیں لائے۔

اللہ تمہیں لائے اللہ تمہیں لائے۔ بڑی بی کو گاتے اور روتے دیکھ کر میں جھولے سے کود پڑا ان کے سینے سے جا کر لپٹ گیا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ میرے روتے ہی تمام گانے والی چھوکریاں بھی منہ پر پلو رکھ رکھ کر رونے لگیں۔ گھر کی تمام خواتین انتہائی سراسیمگی کے ساتھ دوڑ پریں اور پوچھنے لگیں۔ ارے خدا کے واسطے جلدی بتاؤ کیا ہو گیا ہے بڑی بی کوئی جواب بھی نہیں دے سکی تھیں کہ رونے کا شور سن کر میری انتہائی مغلوب الغضب پھپّی نواب بیگم بھی دوڑی ہوئی وہاں آ گئیں۔ اور بے حد غصے کے عالم میں کہنے لگیں بھاڑ میں جائے موا ایسا گیت ارے بڑی بی یہ نہیں دیکھتیں کہ منجھلا کس قدر چھکوں پھکوں رو رہا ہے۔ اے آگ لگے ایسے گیت کو۔

بڑی بی جب یہ ڈانٹ پڑی تو ان کا لنا پتا دل جو پچاسی برس سے مسلسل دھڑک رہا تھا۔ بری طرح زخمی ہو گیا۔ انہوں نے اپنی بیٹھے ہوئے کنوؤں کی سی خوں بار آنکھیں

اِ ہائے تمہارے بغیر برکھا اچھی نہیں لگتی اے میرے کلکتے جانے والے اللہ تمہیں لائے۔ یہ گیت حضرت جان عالم واجد علی شاہ کی یاد میں کہا گیا تھا۔ اور میرے بچپن

میں جب برسات آتی تھی تو اودھ کی گلی گلی میں یہ گیت گایا اور دھوم سے ماتم کیا جاتا تھا۔ کیا انسانی تاریخ پیش کرسکتی ہے۔ حضرت جان عالم کا سا کوئی محبوب بادشاہ جس پر پون صدی تک اس قدر آنسو بہائے گئے ہوں اے جان عالم فرنگی نے آ کو بھی تباہ کیا۔ اور بدنام بھی۔ آپ جتنے اچھے تھے اتنے ہی برے بنا دیے گئے۔

آسماں را حق بود گرخوں ببارد ' بر زمیں

اے میرے فرض شناس جفاکوش عدالت پناہ فقیر منش بادشاہ اے میرے شرافت سنج ہنرور نکتہ رس علم نواز ادب پرست شاعر۔ اور اے میرے صبح کے سپاہی و شہریار اور اے میرے شام کے موسیقار فن کار مالک! آپ کے سپہ سالار اور گورنر فقیر محمد خاں گویا کا یہ پرپوتا جوش ملیح آبدی آپ کے آستان عالی پر سر رکھ رہا ہے اس بندہ درگاہ کا ناچیز سلام قبول فرمائیے اے فرشتہ خصلت و مظلوم آقا شاہاں چہ عجب گر بتو از گدارا!!

۲ ہائے بڑی بی کی آواز کا درد جب وہ اللہ کہیں تو اللہ کے لام کی آواز کو بلند نہیں ہونے دیتیں اور ایسے دبے اور دردناک کھنکے کے ساتھ اللہ کہتی تھیں کہ گویا وہ اپنے کلیجے سے چبھا ہوا نیزہ نکال رہی ہیں۔

۳ ان کو ہم لوگ آپا اور مامائیں وغیرہ بنن بی بی کہتی تھی۔ بڑی بی کے اس درد دل نے پورے گھر کو ہلا کر رکھ دیا' سب کی آنکھوں میں بیران جاری ہو گئے میری ماں نے چیخ ماری میری غضب ناک پھپی کی بھی ہچکیاں بندھ گئیں دادی جان بھی منہ پر آنچل لے کر رونے لگیں اور گانے والی چھوکریوں کا تو بڑا حال ہو گیا' اور گھر کا ذرہ ذرہ چیخنے لگا۔ ''اللہ تمہیں لائے ہائے اللہ تمہیں لائے اللہ تمہیں لائے' اللہ تمہیں لائے.....''

اٹھا میں اور تھراتی آواز میں کہا بن بی بی میں سر جھکائے دیتی ہوں چاہو تو مجھ کو آج نہیں تو کل مری بڑھیا کو جی بھر کے مار لو۔ میں تو آدھی سے زیادہ قبر میں اتر چکی ہوں۔ لیکن بنن بی بی بات جوڑ کر کہتی ہوں ذرا انصاف سے کام لو اپنی چھاتی پر ہاتھ رکھ کر سوچو کہ برکھا رت مینہ برسائے ارجان عالم پیا کی یاد نہ آئے۔ ہائے قیصر باغ

میں برکھا کے جھولے میں خود دیکھے ہوئے ہوں میری آنکھوں میں پھر رہی ہیں وہ بہاریں..... ہائے میرے جان عالم پیا موئے فرنگیوں نے گلا گھونٹ کر تم کو مار ڈالا..... ہائے لکھنو کا سہاگ اجڑ گیا ہائے قیصر باغ کی بارہ دری اندھیرے میں ڈوب گئی ہائے شاہ زادیاں ٹھوکریں کھاتی پھرنے لگیں..... اتنا کہہ کر بری بی نے اپنی آنکھوں پر دوبارہ پلو رکھ لیا۔ اور رو رو کر گانے لگیں ہائے تمرے بنا ہائے تمرے بنا برکھا ناسہائے ناسہائے ارے مورے کلکتے کے جویا اللہ تمہیں لائے اللہ تمہیں لائے"۔

ہولی[1]

یادش بخیر ایک زمانہ تھا کہ ہولی دوالی فقط ہندوؤں ہی کے نہیں ہمارے بھی تہوار تھے۔ ہولی کھیلنے کا بہت پہلے سے اہتمام کیا جاتا تھا۔ ہر سال نئی پچکاریاں بنوائی جاتی تھیں بڑی بڑی دیگوں میں رنگ بھرا جاتا تھا۔ اور ایسی پچکاریاں چلتی تھیں کہ ہم سب کے کپڑے شوربور اور گھر کے تمام در و بام رنگین ہو جایا کرتے تھے۔

ہولی کھیلنے کی ابتدا یوں ہوتی تھی کہ ہماری رعایا میں سے دس بیس اونچے طبقے کی ہنو عورتیں صبح نو دس بجے ابیر گلال کے جھل جھل تھل تھال سروں پر اٹھائے ہمارے گھر میں گاتی ہوئی آتی تھیں۔ میری دادی اور میری ماں کے ماتھوں پر رنگین ٹیکا لگا کر ان دوپٹوں کے پلوؤں پر رنگ چھڑک کر ہماری انگنائی میں حلقہ باندھ کر ہوری آج جلے چاہے کال جلے مورا کنور کنھنا ءموسے آن ملے ہوری آج جل چاہے کال جلے۔ گانا شروع کر دیا کرتی تھیں۔ اور اس گانے کی گونج میں ایسی دھوم سے پچکاریاں چلنے لگتی تھیں کہ کسی کو تن بدن کا ہوش نہیں رہتا تھا۔ اور چراگ بتی پڑتے ہی ملیح آباد کے تمام ہلیارے پوریاں کچوریاں اور مٹھائیاں سروں پر اٹھائے گانے بجانے ناچنے اور ہڑک بجاتے ہمارے مردانے احاطے میں نذر کے واسطے آیا کرتے تھے۔ اور بڑی دیر تک بڑا چکلس رہا کرتا تھا۔

---

[1] ایک دور وہ بھی تھا کہ ہندو مسلم شیر و شکر تھے رام رام اور السلام علیکم نے آداب عرض کا لباس زیب تن کر لیا تھا۔ کعبہ و کاشی نے ایک دوسرے کی گردن میں بانہیں ڈال دی تھیں۔ کوثر و گنگا کو ملا کر ایک گنگا جمنی عظیم لسانی تہذیبی، اور ثقافتی سنگم تعمیر کر دیا گیا تھا مسلمان ہندوؤں کے اور ہندو مسلمانوں کے تہوار (صفحہ ۷۰ پر)

عام ہلیاروں کے بعد قرب و جوار کے ہندو زمین دار جن میں لالہ صاحب مادھو پور کی شخصیت بہت نمایاں تھی اپنی اپنی رعایا کے ساتھ آتے ان کا گانا سنوارتے اور مٹھائیوں کے تھال پیش کیا کرتے تھے۔ اور اس کے بعد ہمارے وہاں ان کی دعوت

ہوتی تھی جس میں ایک دو بجے رات تک طوائفوں کا ناچ گانا ہوتا رہتا تھا۔

دوالی

دوالی میں ہولی سے زیادہ دھوم دھڑکا ہوا کرتا تھا..... آنگن کے ایک گوشے میں برے برے رنگین گھروندے بنائے جاتے تھے۔ ان بلند وخوبصورت گھروندوں کو شیشوں اور چینی کے ٹکڑوں سے سجایا جاتا تھا۔ جن میں مرمرے چڑوے کھٹیاں گٹے اور متھائی۔ کے حسین اور باریک کھلونے بڑے سلیقے کے ساتھ ہر طرف چن دیے جاتے تھے۔ شام ہوتے ہی پہلے ان گھروندوں اور پھر پورے مکان میں چراغاں کیا جاتا تھا اور ہر گوشہ جگر جگر کرنے لگتا..... اور عین اس وقت جب کہ چراغاں کی پلکیں جھپکاتی روشنی میں خالص گھی کے چراغوں کے رقصاں دھوئیں کی خوش بو ہوا میں تیرنے لگتی۔ عین اس وقت ہمارے بڑے دالان میں ڈھولک پر تھاپ پڑتی تھی اور ڈومنیاں اور مراثنیں گانا شروع کر دیا کرتی تھیں..... آئی دوالی آئی دوالی مدھ ماتی جوبن والی آئی دوالی۔ آئی دوالی۔ آہاسر پر تھالی منہ پر لالی آئی دوالی آئی دوالی جگمگ جگمگ مگمگ کرتی دیپک والی آئی دوالی آئی دوالی آہاہاہا۔ آئی دوالی اوہو ہو ہو آئی دوالی' ڈھولک دھم دھم پایل چھم چھم بھولی بھالی آئی دوالی آہاہاہا۔ آئی دوالی اوہو ہو ہو' آئی دوالی''۔

مناتے تھے اور دونوں نے انتہائی وسعت قلب کے ساتھ اپنی اپنی زبانوں میں خیر بیونت کر کے ایک ہندوستان گیر زبان یعنی اردو کی طرح ڈال دی تھی اور آج یہ عالم ہے کہ ہندو مسلمان جب ایک دوسرے کو دیکھتے ہیں تو ان کی آنکھوں میں خون اتر آتا ہے۔ صد حیف کہ خبیث فرنگی نے جو ہندو مسلم نفرت کا پودا بویا تھا ہم آج اس کے پھل کھا کھا کر پاگل ہو چکے ہیں اور اس قدر پاگل کہ اب ہم ایک دوسرے سے یہ پوچھ بھی نہیں رہے ہیں کہ:

کبھی ہم میں تم میں بھی پیار تھا تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

ادھر ڈومنیوں کا تال سم ادھر مٹھائیوں کی چرندم خورندم..... منہ میں مٹھائی

کانوں میں گیت زبان و گوش دونوں شیرینی میں غرق.....

ایک بار جب ادھر ڈومنیاں گا رہی تھیں اور ادھر میرے دانتوں کے نیچے مٹھائی کے کھلونے ٹوٹ ٹوٹ کر کرم کرم کی آواز پیدا کر رہے تھے تو ایک بات یاد آ کر مجھے بے ساختہ ہنسی آ گئی تھی۔ اور وہ بات یہ تھی کہ ایک روز جب بڑی دھوم دھام کے ساتھ پانی برس رہا اور بڑے انداز بے پروائی سنک رہی تھی تو میرے ایک ملازم سالک رام حضرت امیر مینائی کا یہ شعر لہک لہک کر گا رہے تھے۔

سب کرشمے تھے جوانی کے جوانی کیا گئی
وہ امنگیں مٹ گئیں وہ بلبلا [2] جاتا رہا

---

[1] ہولی آج جلے یا کل جلے پروا نہیں مگر میرا کنور کنھائی مجھ سے ان ملے۔ [2] گھروں کی تعمیر کا کام ایک ہفتے پیش رشروع ہو جایا کرتا تھا۔

اس پر میں نے پوچھا تھا کہ سالک رام یہ بلبلا جاتا رہا۔ کیا کہہ رہے ہو تو انہوں نے جواب دیا تھا بھیا جب ہم بلبلا کہتے ہیں) کہتے ہیں) تو منہ کے اندر بڑا مجا آوت ہے (مزا آتا ہے)۔

سو میرا بھی اس وقت یہی عالم تھا کہ گانا سننے کے ساتھ ساتھ میں جب مٹھائی کے کھلونے میرے منہ میں ٹوٹ ٹوٹ کر گھل رہے تھے تو مجھے اپنے منہ کے اندر بڑا مجا آ رہا تھا۔

شب برات

شب برات س ایک مہنہ لیش تر ہی ملیح آباد کا سب سے بڑا آتش باز جس کو بارود سے ایک ہاتھ اڑ جانے کی بنا پر ٹنڈا آتش باز کہا جاتا تھا۔ ہمارے واا طے آتش بازی تیار کرنا شروع کر دیا کرتا تھا۔ اور شب برات سے دو روز قبل ہی تمام آتش بازی ہمارے گھر میں پہنچ جاتی تھی۔ اور اس کے سارھ ساتھ مروانے احاطے کے ایک گوشے میں ایک لمبی چوڑی اور گہری سرنگ کھود کر وہ اس میں بارود بھر دیتا تھا۔ اور سرنگ پر ایک قلعہ تعمیر کر دیتا تھا۔ اور شب رات کے دن غروب کے بعد جب تاریکیوں کا دامن ذرا بوجھل ہو جاتا تھا تو نوکروں چاکروں کی کڑی نگرانی میں کہ کہیں کوئی حادثہ نہ پیش آ جائے..... پھلجھڑیوں گھن چکروں] گولوں' اناروں' پٹاخوں' ہوائیوں ٹونٹوں اور اناروں کی رنگین اور طلسمی جگمگاہٹوں کے ساتھ ساتھ شائیں شائیں غائیں غائیں غوں غوں سرسراہٹ دھم دھم دھماک' تڑتڑتڑاق' اور شرشراق سے دور دور تک ایک قیامت خیز ہنگامہ برپا ہو جاتا تھا.....

شروع شروع میں آتش بازی کی روشنی پھیکی پھیکی سی نظر آتی تھی۔ لیکن جب اندھیر بہت زیادہ گاڑھا ہو جاتا تھا تو آتش بازی کا رنگ نکھر اور ابھر اجایا کرتا تھا۔

اامیر نے تو یوں کہا تھا وہ امنگیں مٹ گئیں وہ ولولہ جاتا رہا۔ کوسا لک رام بلبلا جاتا رہا کہہ رہے تھے! آتش بازی اور عقائد میں بلا کی مماثلت پائی جاتی ہے۔ جس طرح آتش بازی اور روشنی میں زرد اور پھیکی پھیکی نظر آتی ہے۔ اور تاریکی بڑھ جانے تو اس کا جوبن ابھر آتا ہے۔ بالکل اسی طرح عقائد علم وفکر کی روشنی میں جھینپے جھینپے اور مدھم مدھم نظر آتے ہیں اور جہل کی تیرگی میں جگمگانے اور مونچھوں پر تاؤ دیئے لگتے ہیں۔

اس کے بعد کھانا چن دیا جاتا تھا۔ کھانا وانا کون کھاتا تھا بس ذرا سا منہ جھٹال کر ہم لوگ نیاز کے حلوے پر ٹوٹ پڑتے تھے۔

رمضان

جہاں تک کہ روزہ رکھنے کا تعلق ہے۔ رمضان ہمارے گھر آتا ہی نہیں تھا۔ لیکن جہاں تک کہ افطار کا تعلق ہے رمضان ہمارے گھر میں دھوم دھام سے آتا تھا کہ اور کہیں آتا ہی نہ ہوگا۔ عقائد کے اعتبار سے میرے آباؤ اجداد اس قدر پکے مسلمان تھے کہ تمام دینی انجمنوں کو جی کھول کر ہر ماہ چندے دیا کرتے تھے اور قاسلام کے نام پر تن من دھن قربان کر دینے پر ہر وقت آمادہ رہتے تھے۔ لیکن اعمال کے اعتبار سے رئیس زیادہ اور مسلمان بہت ہی کم تھے..... اور اسی وجہ سے روزہ نہ رکھنے کے باوجود ہمارے گھر میں دس بارہ قسم کی افطاری پکائی جاتی تھی۔ اور اذان سے پیش تر مردانے صحن کے تختوں کے چوکوں پر چن دی جایا کرتی تھی اور کم وبیش سوڈیڑھ سو اقرباواحباب اور ملازمین ہمارے یہاں روزہ افطار کیا کرتے تھے۔ اقرباءواحباب میں اکثریت ہوتی تھی روزہ خوروں کی البتہ نوے فی صد ملازم روزہ رکھتے تھے۔ اور افطار کے بعد شاعری کی محفل گرم ہو جایا کرتی تھی۔

ہمارے سپاہیوں اور خدمت گاروں کے افطار کا انداز ساری دنیا سے نرالا تھا..... ایک بڑی سی چٹائی پر ان کی افطاری چن دی جاتی تھی۔ اور ان کے سامنے بچھوا متبا کو کے چالیس پچاس ڈیڑھ خمے حقے رکھ دیے جاتے تھے۔ اور ان کی پشت پر چھ سات بھشتی بھری ہوئی مشکوں کے ساتھ کھڑے کر دیے جاتے تھے..... اور جب اذان ہوتی تھی تو وہ افطاری کی جانب آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھتے اور حقوں پر ٹوٹ پڑا کرتے تھے اور اس قدر کھینچ کھینچ کر وہ کڑ کڑ کڑ کڑ اک کڑ کڑ کڑ کڑ اک حقے پیتے تھے کہ بوڑھے تو بوڑھے جوانوں تک کے گالوں میں گڑھے پڑ جایا کرتے تھے۔ چلموں سے بالشت بالشت بھر کی لویں نکلنے لگتیتھیں بسا اوقات چلمیں پھٹ کر دو ٹکڑے ہو جایا کرتی تھیں ان ے منہ سے جھاگ نکلنے لگتے اور آخر کار وہ بے ہوش ہو کر گر جایا کرتے تھے اور اس عالم میں بھشتی اپنی اپنی مشکوں کے دہانے کھول کر ان کے منہ پر پانی چھڑکنے لگتے تھے

میرے باپ رمضان بھر میں کبھی پہلا اور کبھی منجھلا روزہ رکھتے تھے۔

میرے لڑکپن میں رمضان گرمیوں میں آیا کرتا تھا اور روزے کے دن میرے باپ سہ پہر تک خس خانے میں سوتے رہتے تھے۔ جس دن ان کا روزہ ہوتا تھا خدا جانے گھر والوں کو کیا کیا تلخ تجربے ہو چکے تھے۔ کہ اس دن صبح شام تک تمام گھر پر ایک دہشت ناک سناٹا چھایا رہتا تھا..... کسی کے منہ سے بھاپ تک نہیں نکلتی تھی اشاروں اشاروں میں باتیں ہوا کرتی تھیں..... اور لونڈیاں باندیاں نیم کے نیچے لگھے لیے کھڑی رہتی تھیں کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ کوئی چڑیا اس کی شاخوں پر بیٹھ کر آواز نکالنے لگے۔

اصرف رمضان کے مہینے میں ان کو میرے باپ کے سامنے حقہ پینے کی اجازت مل جایا کرتی تھی۔

عید

آہا عید..... اللہ اللہ رمضان کی انتیسویں تا تیسویں شام..... صبح عید کا پیغام اور رویت ہلال کا اہتمام۔ ایک بلند چبوترے پر گھر کی تمام بیبیاں چاند دیکھنے کی تمنا میں جمع ہو جاتی تھیں اور چاند نظر آتے ہی سب کی سب جھٹ سے آنکھیں بند کر لیتیں اور درود پڑھتیں ہات اٹھا اٹھا کر زیر لب دعائیں مانگتیں اپنے چہروں پر ہاتھ پھیرتیں اور پھر ایکدوسرے کے منہ پر چاند دیکھا کرتی تھیں!

(اس رسم کی پشت پر یہ واہمہ تھا کہ چاند دیکھنے کے فوراً بعد جس کے چہرے پر نگاہ پڑ جائے وہ عورت بھاگوان ہو جاتی ہے اور پورا سال خوشی سے گزرے اور اس وقت اگر کوئی بھاگوان عورت موجود نہیں ہوتی تھی تو پھر کسی ہرے بھرے درخت یا پھول پر نگاہ جمالی جاتی تھی' یا آرسی میں خود اپنے ہی منہ پر چاند دیکھ لیا جاتا تھا منحوس عورتوں کی طرح بچوں کے منہ پر بھی اس واہمے کی بنا پر چاند نہیں دیکھا جاتا تھا کہ اگر ایسا کیا گیا تو وہ سارا بھر تک ٹھوکریں کھاتے اور گرتے رہیں گے۔ اگر انتیس کا چاند نظر نہ آتا تو اس خیال سے عورتیں افسردہ پڑ جاتیں کہ ہو نہ ہو چاند کسی بلا میں پھنس گیا ہے۔ اور جب تیسویں کو نظر آتا تھا تو سب کی سب بڑی سریلی آواز میں یہ کہنے لگتی تھیں کہ آج کی رات کا چاند صاحب کے گریبان میں چھپا آستین سے نکلا' آستین میں چھپا' گریبان سے نکلا۔ جیسے چاند کی بلا ٹلی ویسی ہی سب کی بلا ٹلے آمین'' (چاند دیکھنے کے فوراً بعد کسی رفیق کے چہرے کی طرف نظر اٹھانے کو (کسی کے) منہ پر چاند دیکھنا کہتے ہیں) (حضرت اکبر الہ آبادی کے اس شعر سے دائن کی مقبولیت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

اس کے بعد ''عید مبارک عید مبارک'' نے نعروں سے در و دیوار گونجتے چوڑیاں کھنکنے اور چہروں کے رنگ چمکنے لگتے تھے۔ اور مردانے میں گولے چھوٹنے اور بندوقیں دغنے لگتی تھیں اور مرد تلواروں میں اپنا منہ دیکھنے لگتے تھے۔ اور دروازے پر نوبت بجنے اور شہنائی کی آوازیں ہوا پر مچلنے لگتی تھیں۔

چاند دیکھ چکنے کے بعد میرے سرہانے کے اسٹول پر سنہری جرنیلی ٹوپی جھمکتا ریشمی جوڑا اور پائنتی کے ستول پر روئی کا سا ڈاسن کا چمکیلا جوتہ رکھ دیا جاتا تھا۔

عید کی خوشی میں نیند کسے آتی ہے۔ بس ایک ذرا سی جھپکی سی آتی اور بار بار آنکھ کھل جایا کرتی تھی..... بار بار اپنی سنہری ٹوپی کے ایک ایک پھول کو دیکھتا جی میں آتا کہ ابھی ٹوپی پہن لوں خیال آتا کہ جھوٹی ہو جائے گی۔ پھر تہ کیے جوڑے پر بری آہستگی سے بار بار ہاتھ پھیرتا اکی نرمی کا لمس تمام بدن میں جھرجھری بن کر دوڑ جاتا پھر جوتے کی نظر کو پھسلا دینے والی چکنائی پر انگلیاں دوڑاتا۔ اور اس کو سونگھ بھی لیا کرتا تھا۔

اور جب دھندلکے کا چمپئی رنگ فضا پر کروٹیں لے لے کر میرے خون گردش میں شریک ہو جاتا تھا۔ تو سینے میں نشاط کی گھنٹیاں اِٹن ٹن ٹن ٹن بجنے لگتی تھیں۔ اور میں بستر سے جست کر کے انگنائی میں اس طرح آ جاتا تھا کہ جیسے اسپرنگ دار گڈا ڈبیا کا ڈھکن کھلتے ہی شن سے کھڑا ہو جاتا ہے۔

بوٹ ڈاسن نے بتایا ہم نے ایک مضمون لکھا

ملک میں مضموں نہ پھیلا اور جوتہ چل گیا

اِ آپ نے کبھی اس مسئلے پر بھی غور کیا ہے کہ خصوصیت کے ساتھ بچوں کو عید کی خوشی کیوں ہوتی ہے۔ مریا تو ناچیز خیال ہے کہ چوں کہ بچے ماں باپ کی زبان سے تواتر کے ساتھ یہ سنتے رہتے ہیں کہ عید کا دن بڑی خوشی کا دن ہوتا ہے (صفحہ پر)

ہائے دل میں وہ صبح عید کی دھومیں انگنائی میں وہ رنگوں کی گھومیں۔ وہ سقف و بام کے قہقہے، وہ زمین و آسمان کے چہچہے..... وہ رگ و پے میں خوشی کی سرسراہٹیں وہ سینے میں کسی کی اٹھڑ سی آہٹیں وہ لبوں پر بے اختیار مسکراہٹیں..... وہ فواروں کی سی اچھلتی امنگیں، وہ ترنگوں کی غزالان رمیدہ کی سی شلنگیں..... سانس اندر کھینچتا تو جگر تک ٹھنڈ ک جاتی اور سانس باہر لاتا تو کڑم دم کڑم دھم کی صدا آتی۔

حمام سے بالیدہ روح اور بے وزن جسم کے ساتھ جب نکلتا تھا تو ایسا محسوس ہوتا

تھا کہ میں کسی مثنوی کا شاہ زادہ گل فام ہوں جس کو پریاں اڑا کر پرستان لے آئی ہیں اور تتلیوں کے پروں کی کشتی میں بٹھا کر پنکھڑیوں کے دریا کی سیر کرا رہی ہیں۔

عید گاہ جاتا تو خوشی اس حیرت ناک منزل تک پہنچ جاتی کہ عید گاہ کے ملاؤں کے ترشے لب اور جلاہوں کی کچی ڈاڑھیاں تک اچھی لگتی تھیں عید گاہ سے پلٹتا تو یہ دیکھتا کہ بڑی سریلی آواز میں میرے پھاٹک پر نوبت بج رہی ہے۔ میرے باپ کا دربار جما ہوا ہے۔ احاطے میں وہ ہجوم ہے کہ تل دھرنے کی جگہ بھی باقی نہیں ہے۔ صحن کے ایک گوشے میں گوتے چٹھے کے انکرکھے پہنے اور سروں پر گول گول قندیلیں رکھے ہوئے چھلب دار دف بجا بجا کر

برتو ایں محفل شاہانہ مبارک باشد

گا رہے ہیں۔ اور چاندی کے ورق سے ڈھکے ہوئے سوئیوں اور شیر خرمے کے تھال حاضرین کے درمیان رکھے ہوئے ہیں۔ اور خاص دان و عطر دان گردش کر رہے ہیں، چوسرے کی تنبا کو کے ہاروں میں لپٹے ہوئے حقوں اور عطر خس کی لپٹوں سے تمام احاطہ بھرا ہوا ہے..... اور سپاہی برہنہ تلواریں ہاتھ میں لیے اسلامیاں دے کر انعام لے رہے ہیں۔

تو اسی حدیث متواتر سے متاثر ہو کر کہ وہ بے سمجھے بوجھے عید کے دن خوشیاں منانے لگتے ہیں۔ اور یہ بات صرف عید ہی تک محدود نہیں ہے۔ بلکہ دنیا کی بے شمار باتیں جن کو ہم حقیقت کبریٰ سمجھے بیٹھے ہیں وہ اسی اجائی پروپیگنڈے کے بطن سے پیدا ہوتیں اور ہمارا ایمان بن جایا کرتی تھیں۔ جس کے یہ معنی ہیں کہ انسانوں کی ایک جماعت کثیر ایمان لے آئے ہوئے ہو ان باتوں پر جو کھوپڑی یعنی فکر پر نہیں فقط کانوں یعنی اقوال پر مبنی ہوتی ہے۔ اے بھولے جذباتی انسان تیرے یہ کان تیری کھوپڑی پر کب تک حکومت کرتے رہیں گے۔

بقرعید

اللہ اکبر چلتی چھریوں تڑپتے جان داروں اور بہتے خون میں ڈوبا ہوا یہ تہوار ..... جب موت کے کوف سے لرزتے اور چیختے بیکس و معصوم بکروں میمنوں، دنبوں اور بچھڑوں کو کان پکڑ پکڑ کر ایک دوسرے کے سامنے ہی بڑی سختی کے ساتھ کھینچا جاتا ہے اور پھر انہیں چت لٹا کر ان کی گردنوں پر انتہائی صالح شقاوت کے ساتھ اللہ کا نام لے لے کر چھری چلائی جاتی ہے خون کا فوارہ ان کی گردنوں سے پھوٹ نکلتا کے ان کی آنکھیں سفید ہو جاتی ہیں اور پھر وہ اپنے ہی خون میں تڑپ تڑپ کر دم توڑنے لگتے ہیں۔ میں لڑکپن میں سوچا کرتا تھا کہ یہ سارا ظلم اللہ میاں کی آنکھوں کے سامنے ہو رہا ہے اور پھر بھی وہ ان ظالموں کو کوئی سزا نہیں دے رہے ہیں..... ایک دن ڈرتے ڈرتے میں نے اپنے باپ سے پوچھا تھا میاں ہمارے گھر میں بقرعید کے دن یہ کیا ہونے لگتا ہے؟..... میاں نے آنکھیں نکال کر ارشاد فرمایا تھا کہ خاموش رہو یہ اللہ کا حکم ہے..... اور میں سوچنے لگا تھا کہ میرا اللہ ایسے حکم بھی دیتا ہے۔

ہر چند جہاں تک کہ زبان کے چٹخارے کا تعلق ہے یہ تہوار بڑا ہی لذیز ہوتا ہ اور ہم کو ان کی ماؤں کے سامنے ذبح ہونے والے حلوانوں کی چوکور بوٹیوں کا پلاؤ خوب گلے ہوئے گوشت سفوف کی حد تک پسے ہوئے بوتیوں کے تیخ کباب اور انگروں پر بھنی ہوئی رانیں کھلاتا ہے..... مگر کیا کروں جب یہ ساری چیزیں دسترخوان پر آتی تھیں تو زبان کے مزوں کے تصور پر آنکھوں دیکھی لاشوں کا منظر غالب آ جاتا تھا اور میری آنکھیں نم ناک ہو کر رہ جاتی تھیں۔

یہ عجیب ماجرا ہے کہ بروز عید قرباں
وہی ذبح بھی کرے ہے وہی لے ثواب الٹا!

محرم

اس کو تہوار نہیں مارہ عزا کہنا چاہیے..... میرا پورا خاندان سنی ہے..... ہر چند میرے پردادا ہی کے زمانے سے ہم لوگوں میں شدید قسم کی فضیلیت راہ پا چکی تھی لیکن میری دادی کے آنے سے پیش تر ہمارے گھر میں عزاداری کا مطلق رواج نہیں تھا۔ اور یہ میری شیعہ دادی تھیں جنہوں نے امام باڑہ تعمیر کرا کے ہمارے گھر میں عزاداری کی طرح ڈالی تھی۔

ہر چند وہ اپنے بچوں کو شیعہ نہیں بنا سکی تھیں پھر بھی انہوں نے ان کو اور ان کے ساتھ گھر کے تمام عورتوں کو حسینؑ کا سوگ وار ضرور بنا دیا تھا۔ یہاں تک کہ خوددار میاں بھی امام باڑے میں آن ارنوحے سن سن کر آنسو بہانے لگے..... اور انہوں نے پورے گھر کو اس قدر متاثر کر دیا تھا کہ محرم کا چاند دیکھتے ہی تمام بہو بیٹیاں اور مامائیں اصیلیں تک زیور بڑھا دیتیں پان[1] کھانا ترک کر دیتیں اور سیاہ لباس پہن لیا کرتی تھیں۔

ہمارے امام باڑے میں رات کے نو بجے دادی کی قیادت میں ماتم ہوتا تھا۔ جس میں میری ماں بہنیں وغیرہ کے علاوہ ملیح آباد کی شیعہ سیدانیاں[2] اور مغلانیاں بھی شریک ہوا کرتی تھیں۔

پہلی محرم کا ماتم اس نوحے سے شروع ہوتا تھا ''پھر چاند محرم کا نمودار ہوا ہے سر پیٹو محبو''۔

اور نویں محرم کے ماتم کا آغاز اس نوحے سے ہوتا تھا ''آج شبیر پہ کیا عالم تنہائی ہے'' اور محرم کی گیارھویں تاریخ کو ہماری ضریح تین بجے سہ پہر کو اٹھتی تھیں اور اس آخری نوحے پر بری پٹس کا ماتم ہوا کرتا تھا ''اے مومنو اٹھاؤ جنازہ حسینؑ کا''۔

---

[1] الائچی لانگ کتھا چونا اور زردہ ملا کر کھایا جاتا تھا [2] ملیح آباد میں انے گنے چنے چند شیعہ خاندان بھی تھے۔ [3] لکھنو کے مرثیہ خواں جوں کہ عشرے کے دن ملیح آباد نہیں آ

سکتے تھے اس لیے ہماری ضرح گیارھویں تاریخ کو اٹھائی جاتی تھی۔

اور جب ماتم وشیوں کی گونج میں ہم لوگ ضریح کو باہر نکالتے اور زنانے کے آخری پھاٹک کے سامنے بچھے ہوئے تخت پر لا کر رکھ دیتے تھے تو لکھنو کے ایک مانے ہوئے مرثیہ خواں ضریح کے سامنے سر کھول کر ''جب خاتمہ بخیر ہوا فوج شاہ کا'' پڑھتے تو ڈیوڑھی میں خاک نشیں و برہنہ سر خواتین پر اس قدر رقت طاری ہو جاتی تھی کہ اللہ کی پناہ۔ در و دیوار سے رونے کی صدا آتی تھی۔

اس کے بعد کوئی چار بجے ضریح اٹھتی۔ اور بازار سے گزرتی ہوئی رات کے دو یا تین بجے ڈاک بنگلے کے بالمقابل میدان میں ٹھنڈی کر دی جاتی تھی۔

ضریح کے ٹھنڈے کرتے وقت ظہور علی خاں سپاہی کی سرکردگی میں بڑے زور و شور سے حسینؑ حسینؑ حسینؑ کے دردناک نعروں کے ساتھ سینہ زنی ہوا کرتی تھی جس میں مقامی و بیرونی سینکڑوں شیعہ سنی اور ہندو شریک ہوا کرتے تھے۔

اس گیارھویں محرم کے جلوس میں ایک بار جو ایک انقلاب انگیز ہنگامہ برپا ہو گیا تھا وہ بھی سن لیجیے۔

یہ غالباً سنہ ۱۹۱۲ء کی بات ہے کہ ہماری ضریح جب بازار کے چوراہے تک پہنچی تو معلوم ہوا کہ مولوی عبدالشکور کے چند گرگے ضریح کے سامنے جھنڈا[1] پڑھنا چاہتے ہیں۔ ارو ہمارے خاندان کے کچھ افراد بھی ان کی پشت پناہی پر آمادہ ہیں میں بھی لونڈا تھا یہ سن کر میرا خون کھول گیا۔ اور میں نے بڑے طنطنے سے پکار کر کہا کس کے منہ کے اتنے دانت ہیں کہ وہ ہماری ضری کے سامنے جھنڈا پڑھے۔ اگر ایسا کوئی سورما ہے تو سامنے آئے' اور اپنے حمایتیوں کو بھی ساتھ لائے۔

[1] اس فعل کو اس بنا پر بھی جھندا کہا جاتا تھا کہ چار سو جھنڈا گڑا ہے چار یار پاک کا اس کا آغاز ہوتا تھا اور یہ شوشہ چھوڑا تھا فرنگی نے تا کہ شیعہ سنی لڑتے رہیں حکومت نے ایک طرف تو دہلی کے ایک شیعہ مولوی مقبول احمد کو تیرہ بازی اور دوسری طرف لکھنو

کے ایک سنی مولوعبدالشکور کوجھنڈا بازی پر مامور کر دیا تھا۔ وہ شیعوں کو تبرے پر اکساتے یہ سینوں کو جھنڈے پر ابھارتے اور اس غداری کے صلے میں دونوں گھر بیٹھے وظیفے کھاتے تھے۔ فرنگی فقط ہندوؤں اور مسلمانوں ہی کو نہیں لڑاتا تھا بلکہ ہندوؤں اور مسلمانوں کو مسلمانوں سے بھی ٹکراتا تھا۔ ادھر آریہ سماجیوں اور سناتن دھرمیوں ادھر سنیوں اور شیعوں کو ایک دوسرے کی خوں ریزی پر للکارا کرتا تھا۔ ارے فرنگی کا رونا کیوں روئیں اپنے ہی دام کھوٹے ہوں تو پرکھنے والے کو کیا دوش۔ یہ مان لیا کہ وہ لڑواتا تھا۔ لیکن سوال یہ ہے کہ ہم لڑتے کیوں تھے۔

میری اس للکار سے چند افراد کے شانوں میں جنبش پیدا ہوگئی۔ اور غضب کی شکنیں ماتھوں پر ابھر آئیں اور ایک کم رو سا آدمی ایک صاحب کا اشارہ پا کر جھنڈا پڑھنے کو ضریح کے سامنے آ گیا۔ میں نے ابرار کو اشارہ کیا۔ انہوں نے جھپٹ کر اس کی بوکڑ کی سی داڑھی پکڑ لی اور اس کے کالے سے منہ پر تڑاق سے ایک طمانچہ رسید کر دیا۔

اس کے حمایتیوں میں کھلبلی مچ گئی اور شور برپا ہوگیا کہ ہم اسے برداشت نہیں کر سکتے۔ کہ اتنے میں عالم گیر پھپا جن کی دور دور تک دھاک بیٹھی ہوئی تھی۔ مجمع کو چیرتے ہوئے ضریح کے سامنے آ گئے انہوں نے اپنے ڈنڈے کو زمین پر کھٹکھٹا کر کہا۔ آپ لوگ لڑکوں سے جھگڑا کر رہے ہیں بشیر احمد خاں (میرے باپ) کے پاس جائیے ضریح ان کی ہے وہ اگر اجازت دے دیں تو جھنڈا پڑھیے۔ لوگوں نے پھپا کی بات مان لی۔ اور سیدھے میرے باپ کے پاس چلے گئے۔

تھوڑی دیر میرے باپ نے سپاہی بھیج کر جب مجھے طلب فرمایا تو میں نے ضریح کے اردگرد سپاہیوں کو حکم دے دیا کہ جب تک میں نہ آ جاؤں ضریح یہاں سے جنبش نہ کرے اور کسی کو جھنڈا پڑھنے کی اجازت نہ دی جائے۔ اپنے باپ کی جناب میں سر جھکائے پہنچ گیا۔

انہوں نے مجھ سے دریافت فرمایا کہ تم نے جھنڈا روک دیا ہے۔ میں نے کہا جی ہاں میاں! انہوں نے فرمایا کیوں؟ میں نے جواب میں عرض کیا کہ میاں پہلی بات تو یہ ہے کہ میرے حسین آباد سکول کے ہم جماعت شیعہ لڑکے میرے بلانے سے یہاں شریک ہونے آرہے ہیں اگر ان کے منہ پر جھنڈا پڑھا گیا تو ان مہمانوں کی دل شکنی ہو گی۔ اور دوسری بات یہ ہے کہ دادی جان شیعہ ہیں جب وہ سنیں گی کہ ان کی ضریح کے سامنے جھنڈا بازی ہوئی ہے تو ان کے دل کو دھکا لگے گا۔ اور تیسری بات یہ ہے کہ میاں یہ بات میری سمجھ میں نہیں آتی کہ امام حسینؓ کی شہادت سے جھنڈے کا کیا تعلق ہے۔ جنازے کے ساتھ رونا پیٹنا ہوتا ہے یا لوگوں کی تعریف کے جھنڈے پڑھے جاتے ہیں؟

میاں نے سیدھے ہو کر ان لوگوں کے چہروں کی جانب نگاہ اٹھائی جو میری شکایت لے کر آئے تھے۔ اور مجھے مخاطب کر کے ارشاد فرمایا شبیر تم معقول بات کہہ رہے ہو۔ یہ فرما کر میاں اٹھ کھڑے ہوئے اور ان کے اٹھتے ہی تمام حاضرین اور سپاہی بھی اٹھ کھڑے ہوئے اور کمرے سے نکلتے ہی ارشاد فرمایا کہ میں تمہارے ساتھ چل رہا ہوں اور یہ دیکھنا ہے کہ وہ ایسا کون سامومنت ہے جو ضریح کے سامنے کھڑا ہو کر جھنڈا پڑھنے کی جسارت کر سکے۔

اس کے بعد کس کی مجال تھی کہ میرے باپ کے سامنے جھنڈا پڑھتا..... جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ جھنڈا تو نہیں پڑھا جا سکا لیکن میری رافضیت جھنڈے پر چڑھ گئی..... اور پیش خیمہ بن گئی میرے تنسیخ نکاح کے مقدمے کا جس کا ذکر آگے آئے گا۔

☆☆☆

لکھنو کا پہلا سفر

لکھنو جانے کے واسطے جب ہم سب[1] ملیح آباد اسٹیشن پر پہنچے۔ ریلوے کے عملے میں ہلچل مچ گئی۔ اسٹیشن ماسٹر دوڑا آیا میرے باپ کو جھک کر سلام کیا اور ویٹنگ روم نہیں تھا۔ پلیٹ فارم پر کرسیاں بچھیں اور سٹول رکھ دیے گئے اور ہم سب حسب مرتبہ ان پر بیٹھ کر ریل کا انتظار کرنے لگے۔

گاڑی کا انتظار الامان و الحفیظ ایک ایک دقیقے میں لاکھوں صدیوں کا فشار اعصاب میں رہ رہ کر اینٹھن سی ہو رہی تھی۔ کوئی متھے ڈال رہا تھا کلیجے کو۔ جدھر سے گاری آنے والی تھا ادھر گھبرا گھبرا کر دیکھتا۔ بار بار مشیر احمد خاں سے پوچھتا اب گاڑی کب آئے گی اور وہ مسکرا ہر بار جواب دیتے کہ بس آ ہی رہی ہے۔ میں بھی اوبھ رہا تھا کہ ریلوے سٹیشن کے ایک بنگالی ملازم نے ٹن تن ٹن ٹن گھنٹی بجا کر نعرہ مارا کہ رحیم[2] آباد سے گاری چھوڑا..... میں نے مشیر خان سے پوچھا یہ گاڑی چھوڑا کیا کہہ رہا ہے۔ انہوں نے ہنس کر کہا کہ یہ آدمی بنگالی ہے۔ بنگالی اسی طرح بولتے ہیں۔ میں نے دریافت کیا کہ اب گاڑی میں کتنی دیر ہے انہوں نے کہا کہ بس پانچ منٹ کی دیر ہے میرا دل بلیوں اچھلنے لگا۔

---

[1] میرے باپ کے ہمسفر تھے مشیر احمد خاں رام پوری عبدالغفور خاں صفدر حسین خاں بنی احمد خاں، محمد متیم خان داروغہ شیخ امید علی، سپاہیوں میں محمد شیر خاں، صالح محمد خاں میرزا ایوب بیگ ابو خاں، نجو خاں دو تین خدمت گار اور ایک باورچی[2] پرانے لوگ ریل کے وقت سے آدھ گھنٹہ بیشتر ہی سٹیشن پر آ جایا کرتے تھے[3] ملیح آباد اور سندیلے کے درمیان کوئی چار میل کے فاصلے پر ایک سٹیشن ہے۔

تھوڑی دیر میں دیکھا کہ گاڑی کمر پیچکاتی اور دھواں اڑاتی گھر گھڑ گھڑ چلی آ رہی ہے مجھے اس کے دھوئیں میں گلستاں سے ناچتے نظر آنے لگیا ور جب وہ عین پلیٹ فارم سے دھن دھن دھڑ ادھڑ دھڑ ادھڑ کرتی گزرنے لگی تو پلیٹ فارم تھرانے لگا

پلیٹ فارم کی تھرتھراہٹ میرے خون میں دورنے لگی۔ اردگرد کے ذرے اچھلنے کودنے لگے۔ اور میرا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔

جب ہم سب اطمینان کے ساتھ بیٹھ گئے گارڈ نے جھنڈی ہلائی اس کی جھنڈی کو دیکھ کر میری امنگیں کروانا چنے لگیں۔ جھنڈی ہلا کر گارڈ نے سیٹی بجائی ہائے کیا سریلی سیٹی تھی۔ اس کے جواب میں انجن نے سیٹی دی۔ چوں چوں کے ساتھ پہیوں میں حرکت ہوئی اور گاڑی بڑے ٹھسے کے ساتھ چلنے لگی۔ چھک چھک چھک..... اور دل سے آواز آنے لگی کہ بھک بھک بھک بھک..... اور جب گاری کی رفتار میں تیزی آگئی تو ہوا کے ٹھنڈے جھونکے میرے چہرے سے یوں ٹکرانے لگے کہ میرے دل میں ایک انوکھا سرور سرسرانے لگا۔ اور جب رفتار اور بھی تیز ہوگئی۔ تو پٹڑی کے کھمبے اور آموں کے باگ گھومنے جھومنے اور ناچنے لگے۔ اور پٹڑی کے نیچے کی نالی اس قدر تیزی سے دوڑنے لگی کہ گویا ریل سے ریس کر رہی ہے۔ یہ سماں دیکھ کر میرے دل پر ایک عجیب کیفیت طاری ہوگئی میں زیر لب گنگنانے لگا چھک چھک چھک چھک گانے دو گانے دو۔ چھک چھک چھک چھک جانے دو، جانے دو، بھئی جانے دو۔ آہاہاہا گانے دو اوہواوہو جانے دو"[1]

اور جب گاڑی کاکوری کے پل سے گڑم گڑم گڑم کرتی گزرنے لگی تو میرے دانتوں کے نیچے دوالی کی مٹھائی کے کھلونے ٹوٹنے لگے کرم کرم کرم..... ملیح آباد اور لکھنو کے مابین فاصلہ ہی کیا ہے لے دے کر صرف تیرہ میل اور اس قرب کی بنا پر ہماری گاڑی سینکڑوں کھڑی ہوئی گاڑیوں کی قطار کے درمیان گھڑم گھڑم شائیں شائیں کرتی اور صدہا لائن بدلنے والی اتصالی پٹریوں کو چ چ چ چا ک کھچ کھچ کھچاک اور کٹ کٹ کٹاک کاٹتی اور تراشتی ہوئی کوئی تیس منٹ کے اندر ہی چارباغ لکھنو جنکشن پہنچ گئی.....

---

[1] وہ میرے آغاز شاعری کا اولین لمحہ تھا۔

الامان الحفیظ! چار باگ کی طوفان بدوش قیامت در آغوش ہلچل گہما گہمی دھکا پیل افراتفری نفسی نفسی چیخ پکار گاؤں گہار، الا ہٹیں] گھبراہٹیں، ریل پیل، شائیں شائیں غائیں غائیں دھڑام دھڑام اور ڈھوم ڈھوم ڈھائیں ڈھائیں..... پھر اس پر دوڑتے ٹھیلوں کی جگر فراش گھڑ گھڑاہٹیں قلیوں کی قلی قلی کے نعروں کے ساتھ لنکوری جستیں بدحواس مسافروں کے ارائے خوانچے والوں کا شور وغوغا ٹکٹ چکروں پولیس والوں، ریلوے افسروں بوجھ اٹھائے قلیوں، اور بچوں کو کاندھوں پر بٹھائے بدحواس مسافروں کے مابین دھکم دھکا شٹنگ کے دھماکے ہزاروں سیٹیوں کی آوازیں دھویں کے لچھے لچھوں میں گھسے ہوئے تر بتر پرزوں اور جلے ہوئے تیل کی بدبو فرنگیوں کے چھچھورے غرور میں ڈھلے ہوئے روکھے پھیکے چنگیزی چہرے اور میموں کی سایہ شاخ گل میں پلی ہوئی چھلاسی کمریں..... میں تو دیوانہ ہو گیا پلیٹ فارم پر قدم رکھتے ہی فرنگیوں کی اکڑفوں دیکھتا تھا تو میری پٹھولی کی زبان پر موٹی سی گالی آجاتی تھی اور میموں کی طرف نگاہ اٹھاتا تھا تو میرے ننھے سے شاعر کے منہ سے ''ہائے جانی'' نکل جاتا تھا[1]۔

اور جب سٹیشن کا شور وغل حواس پر دباؤ ڈالتا تھا تو میموں کی کمریں نگاہوں سے اوجھل ہو جاتیں اور دہشت تیرا احاطہ کر لیتی تھی۔ اور میرا عالم کہ یاراں فراموش کردند عشق کا سا ہو کر رہ جاتا تھا۔ میں ابھی اس شیر افگن شور وغوغا اور اس حرارت شکن بھیڑ بھار میں گھرا ہوا کھڑا تھا کہ مشیر احمد خاں نے دوڑ کر میری انگلی پکڑ لی۔ اور ہمارا قافلہ اپنے سپاہیوں کے سنگین حلقے میں باہر جانے کے واسطے رینگنے لگا۔ ہم بھی چند قدم ہی چلے ہوں گے کہ حامد علی خاں بیرسٹر دوڑ کر میرے باپ سے ہم آغوش ہو گئے.....

---

[1] تعجب نہ فرمائیں قاری صاحب یہ سین اور ہائے جانی کا ولولہ جی ہاں خاک سار مادرزاد عاشق تھا۔

---

[2] امروہے کے باشندے ہونے کے باوجود ایک مخلص انسان تھے۔

اتنے میں ایک نہایت چمکیلے سائن بورڈ نے میری آنکھوں میں زنجیر ڈال دی۔

میں نظر جما کر اسے دیکھنے لگا۔ باپ سے کہا میاں ہم کو یہ بوتل لے دیجیے..... میاں انگریزی نہیں جانتے تھے انہوں نے حامد علی خاں سے پوچھا یہ کس چیز کا اشتہار ہے انہوں نے زوردار قہقہہ مار کر کہا ہونہار بروا کے چکنے چکنے پات۔ مبارک ہو خاں صاحب کہ صاحب زادے بفضل خدا ابھی سے شراب کی بوتل مانگ رہے ہیں۔[1]

الغرض بصد ہزار دشواری ہم باہر آئے۔ ہم لوگ متعدد گھوڑا گاڑیوں اور ملازمین اکوں میں اپنی جائے قیام کی جانب روانہ ہو گئے..... میاں کی گاڑی میں مشیر احمد خاں تھے اور میں میاں سمنے کی سیٹ پر اور ہم دونوں کوچ وان کی طرف کی سیٹ پر بیٹھ گئے۔

چلم کی آگ سے مجھے تکلیف پہنچ رہی تھی۔ مگر لکھنو آنے کی خوشی میں اس قدر فراوانی تھی کہ مجھ کو اس تکلیف میں بھی مزا آ رہا تھا۔ اور جب سڑک کے نشیب و فراز سے لوٹے پر ڈھکا ہوا کٹورا کھن کھنا اٹھتا تھا تو میرے دل میں گھنگھرو سے بجنے لگتے تھے۔

جب ہماری گاڑی عیش باغ کے موڑ سے گزرنے لگی تو سامنے کو ایک بہت بڑے تالاب کو دیکھ کر میں نے پوچھا میاں اگر ہم اس میں کود پڑیں تو کیا ڈوب جائیں گے[2] یہ سنتا تھا کہ ان کے چہرے کا رنگ ہلدی کا سا ہو گیا۔ اور فرمایا بیٹا بدشگونی کی بات کبھی زبان پر نہ لانا چاہیے۔ اللہ تمہاری عمر دراز[3] کرے۔ اب ہماری گاری اکبری دروازے کے سامنے جا کر کھڑی ہو گئی اور ہمارا سامان بانس والی سرائے[4] میں جانے لگا۔ اور باپ لکھنو ہمارے افغانی خط و خال ہمارے قد و قامت ہمارے سپاہیوں کی سج دھج ان کے بڑے بڑے پگڑ ان کے موٹے موٹے لٹھ دیکھنے کے لیے ٹھٹ لگا کر ہمارے گرد و پیش جمع ہو گئے۔

---

[1] اور کیوں نہ مانگتا مجھے دیکھ کر کہتی تھی میری دایا یہ لڑکا طرح دار پیدا ہوا ہے۔ ہائے کم بخت حافظ نے کیا خوب کہا ہے۔

دوش دیدم کہ ملایک درمے خانہی زدند

۲؎ اس بدشگونی کے باعث میرے صدقہ اتارا گیا ۳؎ میاں کاش آپ کی دعا قبول نہ ہوتی اور میں جوانی ہی میں رخصت ہو جاتا۔ آپ خوش سمت تھے کہ آپ کو جوانی ہی میں موت آ گئی میں بدنصیب ہوں کہ بوڑھا ہو کر بے شمار روح فرسا یادوں کا گاڈسا اوہ زندگی کے تپتے ریگستان میں پڑا۔ ایک مدت سے ایڑیاں رگڑ رہا ہوں اور میری ناقدر شاح سوم میرے احاطہ وجود کے گرد اسحاف فیل کے مانند گھیرا ڈالے پڑی ہوئی ہے۔ لیکن اے قوت وحیات کے مالک میرے اصحاب فیل کو حملہ ابابیل سے محفوظ رکھنا کہ یہ سراسر نادان ہیں ۳؎ چوک کے ایک دروازے کا نام۔

میں نے اکبری دروازے میں جیسے ہی قدم رکھا تو یہ دیکھا کہ اس چوڑے چکلے دراوزے کے دائیں بائیں لکڑی کے تختوں پر مٹی کے اس قدر سجل حسین سبک اور نازک کھلونے اوپر تلے رکھے ہوئے ہیں کہ باید وشاید..... انہیں دیکھکر یہ خیال ہونے لگا کہ قریب جاؤں گا تو ہر کھلونا پلکیں جھپکانے اور باتیں کرنے لگے گا۔ اور گجریا بھاؤ بتانے لگے گی۔ اور سقوں کو اگر ذرا سا بھی چھولیا تو ان کی بھری مشکوں سے دھل دھل پانی ۲؎ بہہ جائے گا۔

کھلونے خرید کر جب میں نے چوک میں قدم رکھا تو عود اگر اور لوبان کی لپٹوں نے میرا استقبال کیا۔ آگے بڑھا تو سونے چاندی کے ورق کٹنے کی نپی تلی کھٹا کٹ نے میرے پاؤں میں زنجیر ڈال دی۔ وہ مرتب ومنظم کھٹا کھٹ ایسی معلوم ہوئی کہ گویا طبلے پر بول کٹ رہے ہیں۔ پھر ہار والے کی سریلی آواز آئی ''ہار..... بیلے کے پھول چمپا کے'' وہاں سے آگے بڑھا تو کیا بتاؤں کیا کیا دیکھا۔ ہائے تنبولیوں کی وہ جھلجھلاتی تتری کلاہیں وہ دپلی ٹوپیاں وہ شربتی انگرکھے وہ گھنے گھنے پٹے..... وہ چوڑی دار پائجامے شانوں پر وہ ریشمی بڑے بڑے رومال آڑھی ترچھی مانگیں۔ کلوں میں دبی ہوئی معطر گلوریاں ساقیوں اور ساقنوں کے ہاتھوں میں وہ خوشبودار تنبا کو کے حقوں

پر

۱؎ وہ سرائے جو اب ڈھا دی جا چکی ہے لکھنو کی درجہ اول کی پختہ اور صاف ستھری سرائے تھی۔ جس کے تین بالائی کمروں کو میرے باپ نے مستقل کرایے پر لے کر ریزرو کر لیا اور وہاں ایک چوکیدار کو مامور فرما دیا تھا۔ اس وقت تک لکھنو میں برلنگٹن اور امپیریل ہوٹل کے سوا اور کوئی ہوٹل تھا ہی نہیں۔ اور چوں کہ وہ دونوں ہوٹل بدنام تھے کہ وہاں شراب پی جاتی ہے اور سور کی چربی کا کھان کھایا جاتا ہے اس بنا پر قرب جوار کی تمام شرفا کی طرح میرے باپ بھی ان ہوٹلوں کی طرف کبھی نظر اٹھا کر بھی نہیں دیکھتے تھے۔

اب رہا احباب کے وہاں قیام کا مسئلہ سو میرے باپ کے ساتھ چوں کہ ایک لاؤ لشکر لکھنو آیا کرتا تھا۔ اس لیے وہ کسی دوست پر اس قدر بار ڈالنا پسند نہیں فرماتے تھے۔

۲؎ اب نہ وہ قدر دان ہیں نہ وہ کاری گر اور نہ وہ کھلونے لٹ گئی ساری بہار۔

وہ لپٹے ہارہاروں سے پانی کے قطروں کا وہ ترشح وہ بجتے کٹورے وہ سارنگیوں کی تھرتھراہٹ کے ہواؤں میں ہلکورے وہ گمکتے ہوئے طبلے بالا خانوں کے چھجوں سے وہ مکھڑوں کی برستی ہوئی چاندنی۔ اور زلفوں کے گرتے ہوئے سیاہ آب شار کوٹھے والیوں میں کوئی گوری کوئی چمپئی اور کوئی سانولی سلونی..... خدوخال اس قدر باریک گویا کہ ہیرے کے قلم سے ترشے ہوئے کوئی کڑیل جوان کوئی نوجوان اور کوئی ان دونوں کے درمیان' گویا ہمکتی ہوئی اٹھان کوئی گٹھے جسم کی اور کوئی دھان پان..... کسی کی ناک میں نتھ' کسی کی ناک میں نیم کا تنکا..... تماشائیوں کا ہجوم شانے سے شانے چھلتے رہے۔ اور کوٹھوں پر نظر جمائے ہوئے مخالف سمتوں سے آنے جانے والوں کے سینوں کا ٹکراؤ اور ٹکراؤ پر وہ عذر خواہیاں میں ابھی اس دریائے طلسم میں غوطے کھا رہا تھا کہ مشیر خاں نے میرا ہاتھ پکڑ کر اپنی طرف کھینچا۔ میں ساحل پر آ گیا..... سارا طلسم

ٹوٹ گیا۔ اور میں سب کے ساتھ میاں کے پیچھے پیچھے سر جھکا کر سرائے پر آ گیا۔ سرائے میں قدم رکھتے ہی دم سا گھٹنے لگا۔ میں نے بڑی لجاجت سے کہا کہ میاں ہم سپاہیوں..... کو ساتھ لے کر نیچے گھوم آئیں؟ مشیر خاں مسکرائے اور میاں نے بڑی خوف آمیز سنجیدگی سے کہا چوک بچوں کے ٹہلنے کی جگہ نہیں ہے۔ میں کلیجہ مسوس کر رہ گیا۔

اتنے میں صالح محمد خاں ڈھورے[1] ساتھ لیے آ گئے۔ اس نے جست کی بڑی بڑی قفلیوں کو دونوں ہاتھوں کی ہتھیلیوں پر ماہرانہ انداز سے گھما گھما کر اور بالائی کے کاغذی آب خوروں کو مٹی کی سوندھی سوندھی رکابیوں میں کھول کھول کر پیش کیا۔ اور مٹی کے کورے کورے چمچے بھی سامنے رکھ دیے..... کیا بتاؤں ان قفلیوں اور ان آب خوروں کی لذت و ملائمیت زبان نے اس سے پیش تر کبھی کوئی ایسی چیز چکھی ہی نہیں تھی۔ ان کے مزے کو بیان کروں تو کیونکر اور تشبیہہ دوں تو کس سے..... اور ملائمیت کا تو یہ عالم تھا کہ ان کو صرف ہونٹوں اور تالو سے کھایا اور نظر کی حرارت سی پگھلایا جا سکتا تھا۔ رات ہوتے ہی ہمارے باورچی کے پکائے ہوئے کھانوں کے ساتھ ساتھ۔

---

[1] لکھنو کا سب سے بہتر قفلی والا جو لیفٹیننٹ گورنر تک کی پارٹیوں میں بلایا جاتا تھا۔

عبداللہ کی دکان کی پوریاں کچوریاں احمد کی باقر خوانیاں سعادت کی شیر مالیں شبراتی کے اٹھارہ اٹھارہ پرتوں کے پراٹھے جھمن رکاب دار کے بھنے ہوئے مرغ شاہد کابٹیروں کا پلاؤ حیدر حسین خاں کے پھاٹک کی گلی کا انناس کا مزعفر، غلام حسین خاں کے پل کے کباب، کپتان کے کنویں کے پستے بادام کی مٹھائی، اور حسین آباد کی بالائی اور نہ جانے کیا کیا نعمتیں ہمارے دسترخوان پر چن دی گئیں..... اور میں کھا پی کر سو رہا۔

بھور درشن کی چاٹ تو پڑ ہی چکی تھی۔ میں سب سے پہلے بیدار ہو کر بالا خانے کی چھت پر چڑھ گیا۔ صبح کا استقبال کرنے کو جب آسمان کی طرف نظر اٹھائی تو شہر کی

اونچی اونچی عمارتوں کے باعث طلوع کی رنگینی دور دور بھی نظر نہیں آئی۔ آنکھیں مرجھا گئیں میں نے دیکھا تو پو ضرور پھٹ رہی ہے۔ ورمرغ بھی بانگ دے رہے ہیں لیکن پو پھٹنے میں سہانا پن ہے اور نہ مرغوں کی بانگ میں توانائی..... زمین سے آسمان تک ایک پھیکا پن چھایا ہوا ہے۔ سانس لیتا ہوں تو دھانس بھری موٹی موٹی ہوا' سینے کو کھرچ اور دل رپ بوجھ ڈال رہی ہے۔ نسیم صبح چل رہی ہے مگر اس کے جھونکوں میں بالکل دھار ہی نہیں ہے۔ عروس قدرت کے پاؤں میں نہ چاندی کے گھنگھرو ہیں نہ سر پر چھپکا۔ میرے ولولے ایسی ملگجی ملگجی کھوئی کھوئی پھیکی پھیکی' اہلی اہلی' سیٹی سیٹھی' روڑھی روڑھی' اوندھی اوندھی' گونگی گونگی بھنچی بھنچی اور بجھی بجھی سی صبح کو دیکھ کر گل ہو گئے اور دھواں دینے لگے۔ اور میں اس نامراد عاشق کی طرح جس کا معشوق اس کو دغا دے کر غائب ہو گیا ہو بھاری دل کے ساتھ نیچے آیا اور منہ ہاتھ دھونے لگا..... منہ پر بار بار چھپکے مارے دل کی کلی نہیں کھلی۔

اتنے میں ناشتہ آ گیا۔ روغنی روٹی انڈوں کے ستارے بالائی شیر مال اور نمش کا ناشتہ کر کے فارغ ہوا تو میرے باپ نے دو سپاہیوں اور مشیر خاں کو ساتھ کر کے مجھے لکھنو کی سیر کرنے کے لیے روانہ کر دیا۔

میں نے لکھنو کے ہفتے عشرے کے قیام میں مندرجہ ذیل مقامات دیکھے۔ حسین آباد کی شاہی کوٹھی' اس کا کلاک تاور' حسین آباد کا امام باڑہ' اس کی بھول بھلیاں' آصف الدولہ کا امام باڑہ' رومی دروازہ' حضرت عباس کی درگاہ' نجف اشرف' تال کٹورے اور بھول کٹورے کی کربلائیں بیلی گارد[1] عجائب خانہ شاہ پیر محمد کے ٹیلے کی مسجد' شاہ مینا کا مزار' اور موتی محل' حضرت گنج' چنیا بازار' امیں آباد[2] گومتی ٹھنڈی سڑک' لوہے کا پل' لال باغ' سکندر باغ' بندریا باغ' وکٹوریہ باغ اور بنارس باغ' اور چھتر منزل[3] کا فقط وہ حصہ جو سڑکوں سے نظر آتا ہے۔ ہر چند میری لڑکپن کی نگاہوں میں یہ تمام مقامات بڑے عجیب تھے..... لیکن ان تمام عجیب مقامات سے بمراحل عجیب تر

نظر آئے لکھنو کے وہ روسا علماء ادباء اور شرفا اور شعراء جو میرے باپ کے پاس آتے جاتے تھے یا وہ ان کے وہاں تشریف لے جایا کرتے تھے۔ اللہ اللہ وہ ان کے لچکیلے سلام وہ انکی نشست و برخواست کے پاکیزہ انداز، وہ انکی تہذیب میں ڈوبی وضع و قطع وہ ان کے لباس کی انوکھی تراش خراش وہ مسائل علمی و ادبی کی توضیح کے ہنگام، ان کے الفاظ کا ٹھہراؤ وہ ان کے لہجوں کے کٹاؤ، اثنائے غزل خوانی میں وہ حسب مفہوم شعر ان کی آنکھوں کا رنگ اران کے چہروں کا اتار چڑھاؤ۔ وہ قہقہوں سے دامن کش، ان کا ہلکا ہلکا تبسم، وہ ان کا انکسار کے سانچے میں ڈھلا ہوا وقار اور باوجود کمال وہ ان کا ہاتھ جوڑ جوڑ کر اپنی ہیچ مدنی کا اعتراف یہ ساری باتیں دیکھ کر میں نقش بدیوار ہو کر رہ گیا..... وہ تمام لوگ اس قدر شائستہ، شستہ اور گداختہ تھے کہ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ اس کرہ خاک کے نہیں کسی کرہ نور کے باشندے ہیں۔

انہیں بزرگوں کی جوتیاں سیدھی کر کے میں نے شائستگی سیکھی ادب اور زبان میں نظر پیدا کی اور یہ ذرا سی شد بد جو آج مجھے ادب و زبان پر حاصل ہے یہ انہیں کی صحبت کا اثر ہے۔

اب وہ لکھنو ہے نہ لکھنو والے۔ ایک ایک کر کے چلے گئے سب خاک کے نیچے کھا گئی مٹی ان کے جوہروں کو۔ بہت دن ہوئے میں نے ایک رباعی کہی تھی۔

جلتی ہوئی شمعوں کے بجھانے والے
جیتا نہیں چھوڑیں گے زمانے والے
لاش دہلی پہ لکھنو نے یہ کہا
اب ہم بھی ہیں کچھ روز میں آنے والے

۱؎ وہ عمارت جس میں بیلی صاحب نے پناہ لی تھی اور ۱۸۵۷ء کی سپاہ نے اس کو گولیوں سے چھلنی کر دیا تھا۔

۲؎ اس وقت امین آباد کا پارک معرض وجود میں نہیں آیا تھا۔

سو جو میں نے کہا تھا وہی ہو گیا۔ گزشتہ سال جب میں لکھنو گیا تو لکھنو کی اداسی دیکھ کر دل سے خون کی بوندیں ٹپکنے لگیں..... آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر ہر طرف دیکھا۔ کوئی جانی پہچانی صورت نظر نہیں آئی۔ اور ان کی جگہ ی دیکھا کہ ناتراشیدہ کندوں کے سے کھردرے اور تکونے چہروں کے وحشی افراد بار بار اپنے الجھے ہوئے بال کھجاتے اور دائیں بائیں گھومتے چلے آ رہے ہیں..... نہ وہ شان دار فتنیں ہیں نہ عمدہ قدم کی بند گھوڑا گاڑیاں نہ اعلیٰ درجے کے تانگے..... لے دے کر چند گھٹیا قسم کے اکے اور بے رنگ و روغن کے چوں چوں کرتے تانگے ہیں جن میں گھوڑوں کے عوض چوہے جتے ہوئے ہیں اور چند کھڑکھڑ کرتی رکشائیں ہیں۔ جن کو نہ جانے کس سرزمین کے ہوش لونڈے چلا رہے ہیں۔ اور وہ تمام اس قدر ذلیل ہیں کہ ان پر اگر سکندر اعظم کو بٹھا دیا جائے تو وہ بھی کسی دیہاتی رنڈی کا بھڑوا نظر آنے لگے۔

سہ پہر کے وقت نخاس آ گیا۔ نخاس کی وہ سڑک جو لکھنوی تہذیب کا گہوارہ تھی۔ اداس اداس نظر آئی۔ حکیم صاحب عالم کے مطب کے بالا خانے کی طرف نگاہ اٹھائی جیسے دل پر کسی نے گھونسا مار دیا ایک ایک کر کے وہ تمام یاران جشن آنکھوں سے گزرنے لگے..... جنھوں نے وہاں میرے ساتھ راتیں جگائیں اور دھومیں مچائی تھیں..... اور دیکھا کہ یگانہ چنگیزی، حکیم صاحب عالم، مجاز، حکیم مخمور، اور عطا حسین قزلباش کفن اور دھے زینے سے اترے چلے آ رہے ہیں۔ آنکھوں میں آنسو آ گئے آنسو پونچھتا بانس والی سرائے کی جانب مڑا..... پرانی یادیں سر پیٹنے لگیں۔ اور جب اس نئی سڑک سے گزر کر جو سرائے کو شہید کر کے اس کی قبر پر بنائی گئی تھی چوک میں قدم رکھا تو کلیجہ تھام کر رہ گیا۔

کوتاہ اندیش معلمان اخلاق کے اجاڑے ہوئے چوک نے آنکھوں میں آنسو بھر کر مجھے سلام کیا۔ ہائے وہ چوک جو شبستان رنگ و بو تھا اب بھائیں بھائیں کر رہا

ہے۔جن کمروں میں پریاں رہتی تھیں کالے دیوؤں کو وہاں آباد کر دیا گیا ہے۔ جو فضا سارے گاما کے جھولوں میں جھولا کرتی تھی۔ اب اس پر ''اے پائی (اے بھائی) جلندھر سنگھا'' اور اے ہاپچ (حافظ) کھدائی بکس (خدا بخش) کے نعروں کو سوار کر دیا گیا ہے۔ ہائے جن چھجوں پر زلفیں لہرایا کرتی تھیں وہاں داڑھے پھٹکارے جا رہے ہیں۔ جہاں طبلے کھنکتے ہیں وہاں خارشیے کتے بھونک رہے ہیں۔ اور جہاں چاندنی رہا کرتی تھی وہاں دھوپ بسا دی گئی ہے۔

۱؎ حقیقی لکھنو نخاس تک ہے۔ امین آباد اور حضرت گنج والوں کو بیرونی سمجھا جاتا ہے۔

ایک جملہ معترضہ

اس کج اندیش دور میں ہر طرف ایک شور برپا ہے کہ نکال دو، شہر سے طوائفوں کو، مسمار کر ڈالو مے خانوں کو اور اجاڑ کر رکھ دو شبستانوں کو..... اور یہ فتنہ اٹھایا ہوا ہے مہاتما گاندھی کا بے شک گاندھی جی میں تمام خوبیاں تھیں۔ وہ ہندوستان کے عظیم محسن اور سب سے بڑے دوست تھے..... لیکن اسی کے ساتھ ساتھ اس سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ وہ انسانی شادمانی کے بدترین دشمن تھے۔

انہوں نے جب بازار حسن و خرابات مغاں کے خلاف غیر عاقلانہ آواز اٹھائی اور انسانی مسرتوں کا گلا گھونٹ دینے کی مجرمانہ تحریک چلائی تو لنگر لنگوٹ باندھ باندھ کر دوڑ پڑے۔ ان کی آواز پر وہ تمام گریدگان اخلاق مختشین کرام جو قطعی طور پر توفیق گناہ سے یکسر محروم تھے اور جن کے دلوں میں اس بات کی لگن لگی ہوئی تھی کہ وہ صالحین کا روپ بھر بھر کر گاندھی جی کو رجھائیں۔ جاہل عوام کے ووٹ اڑائیں اقتدار کی گدیوں پر براجمان ہو جائیں اور دولت کے دریا میں غوطے لگائیں۔

نیک نفس مہاتما اور ان کے ہوس پرور چیلوں کی سمجھ میں یہ بات مطلق نہیں آئی کہ مسرت کی تمنا اور حسن کی آرزو، نوع انسانی کی جبلت میں داخل ہے۔ اور فطرت نے

تولید وتناسل کا سلسلہ قائم رکھنے کے واسطے انسانی جوانی کو مست وسرشار رہنے اور بوس وکنار کی موجوں میں بہنے پر اس استحکام کے ساتھ مامور ومجبور کر دیا ہے کہ اگر تمام قوائے کائنات خم ٹھونک کر اس کے سامنے آ جائیں تو وہ لنگڑی مار کر انہیں چاروں شانے چت گرتا ہوا آگے بڑھ جائے۔

نوع انسانی کے اس جبلی میلان مسکرات ومستورات کے ہونکتے ہوئے طوفانی دریا پر بندھ باندھنے کے ارادے سے اس دنیا میں کتنے اولیا اور اوصیاء اقطاب' ابدال' امام' اوتاد اور انبیاء..... کتنے معلم' مجدد' مفسر' مجتہد' متقن' مبلغ' محتسب' مصلح اور ملا اور کتنے پادری پاپا' پوپ' پروہت پنڈت' پانڈے' پونگی' پیر اور پیغام بر..... ازل سے لے کر آج تک آ چکے ہین۔ لیک تاریخ انسانی شہادت دے رہی ہے کہ جس نے بھی انسان کے اس بے پایاں تند وشدید ولولے سے ٹکر لی ہے خود اس کا ماتھا لہولہان ہو کر رہ گیا ہے۔ آسمان کی ڈاٹ کے نیچے یہ آواز بڑے طنطنے کے ساتھ آج بھی گونج رہی ہے کہ

ہاں سلسلہ جام و سبو جاری ہے
اب تک وہی شغل ہاؤ ہو جاری ہے
کھائی ہے کچھ انسان سے ٹکر ایسی
ادیان کے ماتھے سے لہو جاری ہے

اور تمام مصلحین کرام کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر انسان آج بھی یہ نعرہ لگا رہا ہے کہ

مرا مہر سیہ چشماں زسر بیروں نہ خواہد شد
قضائے آسمان است این و دیگر گوں نہ خواہد شد

اور جب یہ بات مسلم ہو چکی ہے کہ اس جذبہ قوی کا فنا کر دینا انسانی طاقت سے باہر ہے۔ اور کیوں نہ باہر ہو جب کہ حامیان ادیان سے لے کر مسجد کے نابینا حافظ جی تک بفضلہٖ اس چوں بخلوت می روند کے کاروبار میں ازل کے دن سے آج تک

مشغول ہیں۔تو پھر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس جذبے کو بے لگام چھوڑ دیا جائے یا اس پر چند قیود عائد کر دیے جائیں؟ چوں کہ آدمی ابھی تک حیوانی سطح سے فقط ایک بالشت بلند ہوا ہے اس لیے ہم اپنے کو اس امر پر مجبور پاتے ہیں کہ جب تک نوع انسانی بالغ نہ ہو جائے۔اس جذبے پر چند قیود ضرور عائد کر دی جائیں لیکن وہ اس قدر سخت نہ ہو کہ آدمی بلبلا اٹھے۔[1]

---

[1] ہر چند اسلام نے زانی کے واسطے سنگ ساری کی سی انتہائی سزا مقرر کر دی ہے۔لیکن اس ناقابل برداشت جنسی ہیجان کے ساتھ بڑی حکیمانہ اور بڑی شریفانہ مروت سے بھی کام لیا ہے۔یعنی دیگر جرائم کا انحصار صرف دو گواہوں پر کیا گیا ہے۔لیکن اس معاملے میں چار گواہوں کی شرط لگا دی گئی ہے۔پچاس فیصد رعایت تو پہلے ہی قدم پر کر دی گئی ہے اور مجرم کو اشتباہ کا فائدہ پہنانے کی خاطر اس پچاس فی صد رعایت کے حدود کو وسیع کر کے یہ شرط بھی عائد کر دی کہ کہیں انہوں نے مرد کو اوپر اور عورت کو نیچے دیکھا تھا تو اس شہادت سے زنا ثابت نہیں ہو سکے گا۔اور اس سے بھی آگے بڑھ کر اگر وہ یہ شہادت بھی دیں گے کہ ہم نے مرد کی کمر کے متواتر حرکات کو بھی دیکھا تھا پھر بھی زنا ثابت نہیں ہو گا البتہ اگر وہ یہ شہادت دیں گے ہم نے دیکھا تھا کہ مرد و زن کے مابین سلائی اور سرمے دانی کا سا معاملہ ہو رہا تھا۔تب جا کر زنا ثابت ہو گا۔اب آپ خود ہی فیصلہ کریں گے کہ ایک ایسے مزاج کا زانی جو ایک کو نہیں چار چار آدمیوں کو اپنی طرف آتا دیکھے اور اس کے باوجود وہ عورت سے فوراً جدا ہو جانے کے بدلے' اس سے چمٹا رہے.....اور اس کے ساتھ ساتھ اپنے جسمانی حرکات کی وساطت سے اس کا بھی موقع دے کہ چاروں گواہ فریقین کی برہنگی کا تفصیلی مطالعہ کر کے اپنی آنکھوں سے یہ دیکھ لیں کہ ایک سلائی دوسرے کی سرمہ دانی میں آ جا رہی ہے۔

وہ قیود اور ان کے حدود سر دست کیا ہوں اور آگے چل کر ان کو کس رفتار کے ساتھ ختم کیا جائے۔اس سلسلے میں چند بنیادی حقائق زبان پر لے آؤں تو ہر طرف تھپڑی

بجنے لگے اور میں دیکھتے ہی دیکھے نکو بن کر رہ جاؤں۔

میں جس ماحول میں زندہ رہنے کا ارتکاب کر رہا ہوں وہاں حقائق سے دامن بچانے اور حقائق سے آنکھیں چرانے ہی میں ایمان کی خیر سمجھی جاتی ہے اور نجات کے خواب دیکھے جاتے ہیں۔ میرے معاشرے کو اج تک یہ علم ہی نہیں ہے کہ ہمارے عقائد و مسلمات ہمارے آبائی اقوال و روایات ہمارے خیرو رکے تصورات' ہمارے مرغوبات و مکروہات اور ہمارے ذہنی تعصّبات فکری ہیں کہ سماعی نیز جس ماحول کو اس بات کی بھی خبر نہ ہو کہ پاکی و ناپاکی گناہ گاری و اطاعت شعاری جواز و عدم جواز اور حرام و حلال کی وقت نوزایدی' اسطلاحین' معقولات نے وضع کی ہیں یا منقولات نے؟ یا مردوں کی پاکیزگی و پارسائی کے ضوابط' عورتوں کی عصمت و عفت کے قواعد' جنسی تعلقات کی حد بندی اور ازدواج کا رواج قدرت کا عطیہ ہے یا پنچوں کی ایجاد ہے؟ ایسے ماحول میں چہرہ حقائق سے پردہ اٹھانے والے کو نکو بن کر رہ جانے میں دیر ہی کتنی لگتی ہے۔ اس لیے اب میرے واسطے صرف ایک ہی صورت رہ گئی ہے کہ امور گفتنی کو ناگفتنی کے زمرے میں لے آؤں اور

افسوس بے شمار سخن ہائے گفتنی
خوف فساد خلق سے ناگفتہ رہ گئے

پر نگاہ کر کے میں نے اپنے دور کی ذہنی سطح پر آ جاؤں سب کی ہاں میں ہاں ملاوں اور کوچہ بتاں و کوئے مغاں دونوں کو بداخلاقی کا مرکز ٹھہراؤں۔

بہت اچھا تسلیم کر لیا میں نے ان دونوں اداروں کا بداخلاقی کا مرکز لیکن دیکھنا یہ ہے کہ یہ ادارے جو اتنے ہی قدیم ہیں جتنی انسانی تمدن کی تاریخ..... معرض وجود میں آئے ہیں'

آسودگی تمنا کی بازی گاہ دنیا میں ان اداروں کو جنہیں یخ بستہ پیران فرتوت مادر زاد پر شکستہ جوانان صالح اور گرگان باراں دیدہ سیاسی افراد بداخلاقی کے اڈے کہہ کر

اپنا جی خوش کرتے ہیں) معرض وجود میں لایا جائے نوع انسانی کا پیدائشی ذوق مسکرات[1] و مستورات کیوں کر؟ اس مسئلے پر غور کرتا ہوں تو پتا چل جاتا ہے کہ اس مطالبہ دررسد اور تمنا اور یہ ہیجانی ذوق برانگیختہ ہوا ہے۔ اس ناقابل مقابلہ تند اور شدید حیوانی جبلت کا جو انسان کو اکسا کر وجد میں لاتی ہے اور اس کی نسل بڑھاتی ہے۔ اور جس کی ناقابل فتح شدت کا یہ عالم ہے کہ تاریخ تمدن سے لے کر آج تک ہزاروں ارضی و سماوی طاقتوں کے دانت کھٹے کر کے اور کسی مادی یا روحانی طاقت کو اپنی پشت پر کاٹھی رکھنے کی اجازت نہ دے کر مونچھوں پر تاؤ دے رہا ہے۔

اور جب نگاہ کرتا ہوں اس جذبہ گرم کی صلاحیت و حرارت پر تو یہ دیکھ کر ہنسی آتی ہے کہ آج کل کے ڈسٹرکٹ بورڈوں میونسپلٹیوں اور کارپوریشنوں کے ان ووٹوں کی بھیک پر جینے والے بونے اور اوچھے ارکان پر جو اس خیال خام میں مبتلا ہیں کہ وہ ان بداخلاقی کے اداروں کو بند فرما دیں گے۔ نیولے ڈھال تلوار باندھ کر نام خدا شیر کا شکار کرنے گھروں سے نکل پڑے ہیں۔

پرانے زمانے کو چھوڑیے اس دور میں بھی پاک و ہند کے بڑے بڑے شہروں میں طوائفوں کے اڈوں کو ڈھایا اور مے خانوں کے دروازوں کو قفل لگایا جا چکا ہے پھر بھی طوائفیں معدوم اور مے خوار مفقود نہیں ہو سکے ہیں کوچہ خوباں و کوئے مغاں کو ایک محلے سے نکال کر دوسرے محلے میں آباد کرنا بالکل اسی نوعیت کی حماقت ہے کہ کہنی کے پھوڑے کو گھٹنے پر منتقل فرما کر اس بات کا یقین کر لیا جائے کہ پھوڑا باقی نہیں رہا۔

---

[1] لوگ مسکرات کو شراب وغیرہ سے مختص کرتے ہیں حالانکہ سکر کے دائرے میں دنیا کی ہر چیز داخل ہے جو خون میں ہیجان اور دل میں نشاط کا طوفان برپا کرتی ہے۔ بچے کو پیار کرنا، چاندنی سے لطف اٹھانا پھول سونگھنا، پیٹ بھر کر کھانا کھانا حسینوں کو آغوش میں لینا یاروں کی صحبت میں بیٹھنا مختلف کھیل کھیلنا عبادت کرنا وظیفہ پڑھنا گانا سننا، تماشے دیکھنا، صحائف پڑھ کر جھومنا، اور رو دینا۔ یہ بھی سکر ہی کی شاخیں

ہیں۔اس کے معنی ہی ہیں کہ ذوق سکر ہمارے وجود کا احاطہ کیے ہوئے ہے اور سکر کے بغیر درد دیدہ انسان کا زندہ رہنا امکان سے باہر ہے۔

اس لیے دانش مندی اور انسانی فلاح اسی میں نظر آتی ہے کہ جہاں تک بازار حسن کا تعلق ہے ۔ ماہر دسن رسیدہ ڈاکٹروں کے ہفتہ وار معائنے کی وساطت سے اس ادارے کی تہذیب وتطہیر کا سائنٹفک بندوبست کیا جائے ۔اور ایسے ضابطے وضع کیے جائیں کہ امن عامہ اور صحت جسمانی میں کوئی خلل نہ پڑنے پائے۔

اب رہا مسکرات کا مسئلہ سو حکومت کا یہ فرض ہے کہ اعلیٰ قسم کی اور پختہ لیکن سستی شراب کشید کرنے کے واسطے بھٹیاں قائم اور ایسے افراد کے نام اجازت نامے جاری کر دے جو صحت جسمانی سلامتی عقل اور شرافت نفس کی بنا پر بادہ خواری کی اہلیت رکھتے ہیں۔

اگر اس برسوں کے سوچے سمجھے مشورے پر عمل نہیں کیا گیا تو یاد رکھیے اور کان کھول کر سن لیجیے کہ ایک طرف تو انسانی فطرت بغاوت پر کمر باندھے گی۔گھر گھر بھٹیاں قائم ہو جائیں گی اور ناڑیوں کے ہاتھ کی کھینچی ہوئی شراب یعنی اسپرٹ پی پی کر لوگ جرائم پر اتر آئیں گے اور دھڑا دھڑ مرنے لگیں گے۔

اور دوسری طرف جب طوائفوں کے اڈے بند کر دیے جائیں گے تو ان کے پاؤں کی زنجیر کھل جائے گی اور وہ اڈے شہر کا رخ کر کے گلی گلی میں پھیل جائیں گے۔ شہر کا ہر مکان بازار حسن میں تبدیل ہو کر رہ جائے گا۔اور شہر کی ہر شریف زادی خانگی کا روپ بھر کر طوائف سے بھی دو قدم آگے نکل جائے گی اور عصمت فروشی کا پانی اس قدر ٹوٹ ٹوٹ کر برسے گا کہ کالجوں کے احاطوں اور گھروں کی انگنائیوں میں گھٹنوں گھٹنوں پانی کھڑا ہو جائے گا۔

☆☆☆

فرنگی سے نفرت

ایک روز میں لکھنو کے نخاس والے مکان کی بالائی منزل کے برآمدے میں اپنی کھلائی بڑی بی کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا کہ سڑک سے دفعتہً تڑاق تڑاق کی آوازیں آئیں۔ بڑی بی نے جھک کر دیکھا تو زار زار رونے لگیں۔ میں نے پوچھا یہ بیٹھے بٹھائے رونے کیوں لگیں بڑی بی..... انہوں نے روتے ہوئے کہا بیٹا موا گاڑی والا گھوڑے کو چابک سے مار رہا ہے تڑاق تراق..... ہائے ہمارے جان علم پیا کے زمانے میں ان گھوڑوں کو رئیسوں کی آبرو سمجھا جاتا تھا۔ ان کو دودھ جلیبی اور مٹھائی کھلائی جاتی تھی۔ جب سے ان بندر فرنگیوں کا راج ہوا ہے ان غازی مردوں کو چابکوں سے مارا جانے لگا ہے۔ بیٹا یہ غازی مرد کس قطار میں شمار ہیں ان بندروں کا جب سے دور دورا ہوا ہے۔ بڑے بڑے شریف زادے گلیوں میں جوتیاں چٹخاتے پھرتے ہیں۔ انہوں نے یہ کہتے کہتے اپنے بے بوٹی کے کھکل سینے پر ہات مار کر کہا ''ہائے ہمارے جان عالم پیا اب کبھی نہیں پلٹیں گے'' بڑی بی کی یہ بات سن کر میں بلبلا گیا اور فرنگی سے نفرت ہوگئی۔ اور وہی لڑکپن کی نفرت آگے چل کر میری سیاہی نظموں کے روپ میں شعلہ افشانی کرنے لگی۔

میری مونچھوں کے کونڈے! الحفیظ و الامان..... ہائے جوانی کا وہ عاصیانہ ریعان..... پیرانہ سر خواتین میں اس کی وہ معصومانہ مان دان..... وہ ہر طرف سے آئے میں صدقے میں قربان..... وہ رنگوں کے پیہم گھلتے سینکڑوں نشان..... وہ کل یوم ہوا فی الشان وہ جھمکتی زمین جھلجھلاتا آسمان وہ مشک وہ زعفران..... وہ عود وہ لوبان وہ ریحان وہ رمان وہ عطر پھول اور پان..... وہ امنگوں کی پور پور کی گمکتی چٹخان..... وہ ترنگوں کے رگ رگ میں کٹتے دھان..... وہ جھولتی گلیاں وہ جھومتے میدان..... وہ امریوں کی کجریاں وہ برکھا کے پکوان..... وہ پی ہو کو کو دے سلوں کے شیشوں کی درکان..... وہ گھپ راتیں وہ گل اوسان وہ گوگل بن کے جھٹپٹے وہ بانسری

کے سریلے بان..... وہ رادھا جی کی مسکان..... وہ ہلالوں کا بازار وہ خنجروں کی دکان..... گاہے گل پوش گاہے لہولہان..... وہ کاہ پر قدم کا بکشاں پر گریبان..... وہ عشوؤں کے گرداب وہ عربدوں کے طوفان..... وہ نرالے ہانکے انوکھے مچان..... وہ جھوٹے وعدے سچے پیمان..... وہ پہاڑوں کی تول پلکوں کی میزان..... وہ کانٹوں کے حصار پھولوں کے ایوان..... وہ شیشوں کے در وہ پتھر کے دربان..... وہ ادھر سے سوال ہے کوئی امکان..... وہ ادھر سے جواب الا بالسلطان..... وہ تو اتر خطا و نسیان..... وہ تسلسل عدوان..... وہ سلسلہ انتقام بالاحسان..... وہ قلزم حسن و عشق کا طغیان وہ پیہم ابر زخ لا یجیان..... وہ بیاہیاں طرار وہ کنواریاں نادان..... وہ لہجوں کی مرکیاں وہ بولوں کی لچکان..... وہ انکھڑیوں کے ڈوروں کی گویا زبان..... وہ حورانی مقصورات فی الخیام کی شرمیلی آن بان..... وہ صراحی دار گردنوں کے ڈوروں کی لچک میں ارجن کمان..... وہ بوجھل پپوٹے وہ نیندوں کے جھپان..... وہ یخرج منھما الولوو المرجان..... وہ چاہوں بانہوں کا مرج البحرین یلتقیان..... وہ رامش و رنگ کے بوستان وہ فیھا عینان تجریان وہ ہر الھڑ حور وہ ہر امرد غلمان..... کافر زلفوں کی چھاؤں میں وہ مکھڑوں کے قرآن..... اور دھانوں میں رہ رہ کر وہ نعرہ فبای آلاء ربکما تکذبان!!

امیر اودھ میں یہ رسم جاری تھی کہ جب لڑکوں کی مسیں بھیگنے لگتیں تھیں تو مٹی کے کورے کونڈوں میں چوٹی دار جلیبیاں بھر کر حضرت یوسف کی نیاز دلائی جاتی تھی۔

اب ذرا میری مونچھوں کے کونڈوں کا دھوم دھڑ کا بھی دیکھ لیجیے..... ادھر زنانے مکان کے چوڑے چوڑے دروں اور اونچی اونچی محرابوں کے طویل و عریض دالان میں چاندنی کا فرش بچھا ہوا تھا۔ دیوار گیریاں اکے اور گیس کے ہنڈے جل رہے ہیں..... خواتین گاؤ تکیوں پر ٹیک لگائے بیٹھی ہیں۔ ادھر ادھر فرشی اگال دان اور بڑے بڑے چاندی کے پان دان رکھے ہوئے ہیں اور ان کے مقابل ڈومنیاں ڈھارنیں

سرورنیاں اور میراثنیں نقلیں کر رہی ہیں۔ اور نقلوں کے بعد ڈھولک پر گانا ہو رہا ہے۔ اور گانے والیوں کو بیل[1] دی جا رہی ہے۔

ادھر مردانے صحن میں دل بادل شامیانہ لگا ہوا ہے۔ شامیانے کے گرد نوکر چاکر وغیرہ پرے جمائے ہوئے ہیں۔ چاروں طرف گیس کے بڑے بڑے ہنڈے سنسنا رہے ہیں۔ مشعلچی مشعلیں اٹھائے ہوئے ہمہ تن انتظار بنے بیچ میں کھڑے ہوئے ہیں..... شامیانے کے نیچے شرکائے جشن اونچے اونچے گاؤ تکیوں پر کہنیاں ٹیکے بڑے وقار کے ساتھ قالینوں پر بیٹھے ہوئے ہیں۔ اور وہ دیکھیے اپنے کاشمیریوں کے طائفے کے ساتھ پندرہ سولہ برس کا خوبرو اور شیریں حرکات علی جان[2] جس کے حسین چہرے پر شکر پر ہلکا سا نمک چھڑکا ہوا ہے۔ چلا آ رہا ہے۔ بڑی لٹک کے ساتھ چھم چھم کرتا ہوا۔ شامیانے میں قدم رکھتے ہی اس نے بڑے لوچ کے ساتھ فرشی سلام کیا ارباب محفل کو..... سلام کرنے میں اس کی کلائی اس قدر لچکی کہ ڈر لگنے لگا کہ کہیں ٹوٹ نہ جائے اور مظہر کا مصرعہ

آہ مظہر خم سلام کسے

---

[1] اس انعام کو بیل کہتے ہیں جو شادی میں خصوصاً اور دیگر تقریبات میں بالعموم گانے والیوں کو دیا جاتا ہے۔ اور اس کا قاعدہ یہ تھا کہ جب کوئی خاتون ان کو انعام دیتی تھی تو ڈھولک بجانے والی اس کے عطا کردہ روپوں کو ڈھولک کے حاشیے پر تین بار کھٹکھٹاتی تھی۔ اور اس خاتون کے شوہر کا نام لے کر با آواز کہتی تھی کہ فلاں خاں صاحب کی بیل یعنی اگر انعام دینے والی کے شوہر کا نام نواب احمد خاں ہوتا تو ڈومنی پکار کر کہتی تھی نواب احمد خاں کی بیل)۔

[2] یہ عجیب اتفاق ہے کہ جان علی حجام نے میرا ختنہ اور علی جان کاشمیری نے میرے ختنے کے جشن پر مجرا کیا۔ خان علی نے خون بہایا اور علی جان نے رنگینیوں کے دریا بہا دیے۔

یاد آ گیا..... سلام کر کے وہ اپنے سازندوں کے آگے ایسے دل فریب گھماؤ سے بیٹھ گیا کہ جیسے اڑتا ہوا کبوتر اپنی چھتری پر آ کر بیٹھ جاتا ہے..... اس کے بیٹھتے ہی۔

میں چمن میں کیا گیا گویا دبستاں کھل گیا

کی طرح سازندے اپنے اپنے ازملانے لگے۔ سازوں کا ملایا جانا ایک صبر آزما عمل ہوتا ہے یعنی

ہرچند سریلے نغموں کے جذبات جگائے جاتے ہیں
اس وقت کی تلخی یاد کرو جب ساز ملائے جاتے ہیں

لیکن کاشمیریوں (بھانڈوں) نے اپنی اچھل کود اپنے قوا واوا کے نعروں اور اپنی پیٹ میں بل ڈال دینے والی نقلوں سے اس تلخی کو ڈھانپ لیا اور اس قدر ہنایا کہ لوگ لوٹنے لگے..... اور جب ساز مل گئے اور ہنسی کے دونگرے رک گئے..... تو علی جان پھر ہری لے کر یوں کھڑا ہو گیا کہ بھاؤ بتانے جیسے پہلی کرن پھوٹتے ہی دریا سانس لے کر مچلنے لگتا ہے۔ پل بھر میں اچھی طرح ملے ہوئے ساز بجنے لگے۔ سارنگی کی رؤں رؤں..... جوڑی کی دوں دوں اور مجیرے کی کھن کھن کی نپی تلی اور گھلی ملی آوازوں پر فسوں دائرے میں علی جان نے بھاؤ بتانے کے واسطے جب اپنے لچکیلے ہات یعنی چپو اٹھائے اپنے چھریرے جسم کی کشتی کھین کے لیے تو کاشمیریوں نے اسے حلقے میں لے لیا۔ اور بڑی سریلی آواز میں کہنے لگے ادھر دیکھو خوش وقتی ادھر دیکھو خوش وقتی۔ اللہ نے یہ دن دکھایا کہ خاں صاحب بہادر کی ڈیوڑھی پر علی جان کا طائفہ آیا..... وہ محفل ویران جہاں بھانڈ نہ باشد اس پر بڑا قہقہہ پڑا۔

اس کے بعد سازوں کی منظم گونج میں علی جان کاشمیریوں کا حلقہ توڑ کر یوں اپنا چہرہ سامنے لایا گویا کالی بدلی سے چاند نکل آیا..... سامنے آتے ہی اس نے چھلاوے نے فرش پر یوں چھم سے پاؤں مارا کہ ابل پڑا زمین سے رقص کا فوارہ..... اور داہنے بائیں کھڑے ہوئے کاشمیریوں نے اس رقص کے ہر سم پر تالیاں بجا بجا کر کہنا شروع

کر دیا۔ تا تا تا نا تھئی تھئی تھئی تھئی۔ اے تا تا تا تا تھئی اور جب اس کے ناچ میں تیزی آئی تو کاشمیریوں نے آہاہاہا۔ ایبڑھ کے اے بڑھ کے بیٹا بڑھ کے۔ ہاں بڑھ کے بیٹا بڑھ کے۔ تھئی تھئی تھئی تھئی تا تا تا تا۔ کے نعرے لگانا شروع کر دیے اور بھاؤ بتانے اور ناچنے کے بعد جب اس نے بن پانی کا چلا جارے بجرا! گانا شروع کر دیا تو ایسا معلوم ہوا کہ وہ ایک بجرا ہے اور فرش پر ہچکولے کھا کھا کر بہتا چلا جا رہا ہے۔ اور ساز اس کے بولوں سے اس قدر دست و گریباں اور ہم آہنگ ہیں گویا سونے کی اڑتی ہوئی سوئیوں میں جھلجھلاتے مقیش کے ڈورے پروئے جا رہے ہیں۔

علی جان کے دل نشین مجرے کے بعد شامیانے پر ایک سناٹا چھا گیا ایک کھنکھناتا سناٹا چھا گیا..... اس کے بعد چار طوائفیں تابڑ توڑ آئیں لیکن ان کے مجرے کا رنگ جما ہی نہیں..... اور ایسا لگا کہ جیسے حافظ شیرازی کے کلام کے بعد ذوق کی غزل پڑھی جا رہی ہو۔ یا شراب کے بغیر خالی سوڈا پیا جا رہا ہو۔ یا لیلیٰ کی محمل کے بغیر بلبلاتا اونٹ شتر غمزے کرتا پھر رہا ہے نجد کے میدان میں۔

خدا خدا کر کے اب پچھلے پہر کوئی چودہ برس کی پانچویں طوائف آئی مجرے کے واسطے العظمتہ اللہ اس کا چمپئی مکھڑا گویا سر کوہ سار آغار بہار کی صبح طالع ہو رہی ہے..... اور اس کے شربتی رخساروں کی سرخ و کاغذی جلد کے نیچے سے یوں صباحت پھوٹ رہی ہے گویا غرفے کے رنگین شیشے سے چاندنی چھن چھن کر آ رہی ہے..... جب اس قتالہ عالم نے رقص کرنے کے لیے اپنے ترشے ہوئے کولھے کے دل فریب کٹاؤ پر بایاں ہاتھ رکھ کر چھلا سی کمر لچکائی تو ایسا نظر آیا کہ گویا رقص کی دیوی سنہری رتھ کا رتھرا بڑی لچک کے ساتھ گھوم رہا ہے..... اور کرہ ارض کی گردش اس کا طواف کر رہی ہے۔ یا مصر کے بازار میں یوسف کا بانکپن دیکھ کر زلیخا کے غرور کی کمان ٹوٹی جا رہی ہے۔

اور ہنگام رقص جب اس کافر نے ایک قیامت انگیز جھانولی کے ساتھ اپنی آنکھوں کے پٹ ادھے بھیڑ لیے تو ایسا معلوم ہوا گویا خرابات کی انگنائی میں دفعتہً جھٹپٹا ہو گیا

ہے اور رطل گراں پر ہلکا سا دھواں مچلنے لگا ہے..... اور جب اس ظالم نے اپنی گردن کے باریک ڈورے کو راگنی کے بہاؤ کی طرف موڑ کر ذرا سی جنبش دی تو ایسا محسوس ہوا کہ گویا نسیم سحر کی مضراب خیط ابیض بجا رہی ہے۔

---

[1] اے بے پانی کے بجرے چلا جا (چلتا رہ)

اس کی جوانی کا سیب ہنوز پال سے باہر نہیں نکالا گیا تھا۔ اس کے مکھڑے پر جوانی اور بانک پن گلے مل رہے تھے۔ اس کا وجود ایک ایسا جھٹپٹا تھا جس کی چھاؤں میں دھندلکا ہمک رہا تھا..... اس کی ناک کی نتھ گواہی دے رہی تھی کہ اس کا پنڈا ابھی تک کورا ہے۔ اور سینے پر اس کے آبی آنچل کے نیچے گویا ایک بلوا سا ہو رہا ہے۔

وہ بہت کم سن تھی اور موسیقی میں خام ہونے کی وجہ سے اس کے گلے میں پتی لگتی تھی۔ لیکن اس کی نیم پختہ جوانی کی وحشی آنکھوں کے شربتی ڈوروں اور وہ انوکھی راگنی چھڑی ہوئی تھی جس کو دنیا کے کسی ساز پر نہیں بجایا جا سکتا اور جو کو کانوں سے نہیں آنکھوں سے سنا جا سکتا ہے۔

اور آخر کار ڈوبتے ستاروں کی چھاؤں میں اس دختر قمر نے جب یہ غزل بھیرویں میں چھیڑی۔

نسیم ' جاگو ' کمر باندھو' اٹھاؤ بستر کہ رات کم ہے

تو راگنی کی چلت پھرت اس کے نیم رواں اور کچے گلے میں یوں گھومنے لگی گویا پروا کے ملائم جھونکوں میں پٹے[1] سے کٹا ہوا چاند تارا[2] فضا میں پتا رہا ہے۔

اور جب ناچتے ناچتے انعام کی خاطر وہ ہچکولے کھاتی کشتی کی مانند آہستہ آہستہ میری طرف بڑھنے لگی تو میرا گلا رندھنے لگا۔ میری گردن کے ہاروں کی خوش بو تیز ہو گئی اور جب وہ ایک گھٹنا ٹیک کر چھم سے میرے سامنے بیٹھ گئی تو اس کے کم سنی کے انفاس کی خوش بو کھچ سے میرے سینے میں چبھ گئی۔ اور اس کی پیشواز کا سرا جب میرے ہات کی پشت سے مس ہو گیا تو میرے بدن میں پوسی پھٹنے لگی۔

میری زندگی کے اٹھارہ معاشقوں میں وہ میرا مبہم سا معاشقہ اولیں تھا..... جو عالم خواب میں شبنم کی مانند مجھ پر گرا اور میرے تن بدن میں جذب ہو کر گم ہو گیا۔

۱پتنگ بازی کے ایک پیچ کا نام ۲ایک قسم کا پتنگ

اب اگر وہ زندہ بھی ہو گی تو میری طرح بوڑھی ہو چکی ہو گی۔ اور ہم ایک دوسرے کو پہچان بھی نہیں سکیں گے۔..... ہائے ظالم وقت کا دھارا کتنے چاندوں کو غرق کر چکا ہے۔

لیکن اتنی طویل مدت گزر جانے کے بعد بھی جب اس مجرے کی یاد آتی ہے تو میرے جھریوں بھرے ہاتھ کی پشت پر اس کی پشواز کا دامن سرسرانے اور کروٹیں سی لینے لگتا ہے۔ ہائے کیا کروں میرے اللہ!

کانوں سے سنا تھا کہ پشت رسالت پر مہر نبوت ثبت ہوا کرتی ہے اور آنکھوں سے دیکھ رہا ہوں کہ میری پشت دست پر اس پیشواز کی مہر لمس آج تک دمک رہی ہے۔

میرا آگرے کا پہلا سفر

آگرے سے نانا جان کا دعوت نامہ آیا، میری ماں کی باچھیں کھل گئیں..... سفر کی تیاریاں شروع ہوئیں۔ اور پورے ایک ہفتے کے بعد جب رخت سفر تیار ہو گیا تو لکھنو اادمی بھیج کر دین کمپارٹ منٹ یعنی ایک فرسٹ کلاس ایک سیکنڈ اور ملازموں کے واسطے ایک تھرڈ کلاس بوگی ریزرو ہو کر چوبیس گھنٹے سے پیش تر ملیح آباد اسٹیشن پہنچ گئی۔ اور وہ تینوں ڈبے ماں گودام کے پلیٹ فارم پر لگا دیے گئے۔

پردے کا یہاں تک اہتمام کیا گیا کہ زنانے کمپارٹمنٹ کی تمام کھڑکیاں پہلے ہی سے بند کر دی گئیں اور صرف یہی نہیں ان پر کوکیلوں سے ٹھونک ٹھونک کر اندر سے چادریں بھی جڑ دی گئیں۔ دن بھر ان میں سامان لادا جاتا رہا۔ اور رات کو پہرہ بٹھا دیا گیا۔

ہماری گاڑی صبح نو بجے جانے والی تھی۔ گھر بھر میں تڑکے سے ایک ہنگامہ برپا ہو

گیا۔اور باقی سامان بھی سٹیشن پر پہنچا دیا گیا..... گھر سے چلتے وقت دادی جان نے ہم سب کے بازوؤں پر امام ضامن باندھے حیدری خانم قرا ان کو ہاتھوں میں بلند کر کے' انگنائی کے کنوئیں کی چھت پر جا کھڑی ہوگئیں۔جس کے نیچے سے ہم سب ایک ایک کر کے گزرے ماماؤں اصیلوں نے دہی مچھلی[1] کی آوازیں بلند کیں اور ہم سب سٹیشن کی جانب' تاج محل کو جب قریب سے دیکھا تو یہ کلیہ ٹوٹ گیا اور قریب سے وہ اس قدر حسین نظر آیا کہ جی چاہا اس دوالی کے سفید کھلونے کو دانتوں کے نیچے کرم کرم چبا کر کھا جاؤں۔

---

[1] اس کو آغاز سفر کا نیک شگون سمجھا جاتا تھا۔یعنی جس طرح دہی اور مچھلی میں ساز گاری ہوتی ہے وہی سفر میں شامل حال رہے۔

اللہ اکبر تاج محل کا پھاٹک..... آسمان سے باتیں کرتا پھاٹک..... جب خدام تاج میں سے کسی نے اس کی محراب کے نیچے اللہ اکبر کا نعرہ بلند کیا تو محراب میں سے ایسی عظیم گونج پیدا ہوگئی کہ رونگٹے کھڑے ہو گئے۔اور وہ گونج دیر تک باقی رہی۔اور ایسا معلوم ہوا کہ گوش رسالت میں وحی کی جھنکار گونج رہی ہے۔

اس الوہی جھنکار میں ڈوبا ہوا جب اندر گیا تو تاج پر تفصیلی نگاہ ڈالی تو ایسا محسوس ہوا کہ خواب میں جنت دیکھ رہا ہوں..... فواروں کی کھنک سبزے کی لہک اور تاج کی چمک دمک نے دیوانہ کر دیا..... میں یہ سوچنے لگا کہ وہ کیسے نجیے تلے چوم لینے کے قابل ہاتھ ہوں گے جن کی فن کاری نے خیط ابیض خواب زلیخا تاب مرمر' سپیدہ سحری' اور جلوہ کنعان کو چاندی کی دیگ میں ڈال کر ستاروں کے انگاروں پر پگھلایا۔موسم بہار کے سرشار جھونکوں میں سکھایا اور ہیرے کی نازک نازک چھینیوں سے تراش تراش کر در و بام کے سانچے میں ڈھال دیا ہے۔

خدا کی قسم' بے ساختہ جی میں آیا کہ پھاڑ ڈالوں گریبان چر سے۔اور ناچنے لگوں تھرک تھرک..... لیکن جب کن انکھیوں سے باپ کی طرف دیکھا ڈر کے مارے کلیجہ

مسوس کر رہ گیا کہ ناچوں گا تو باپ اس طرح عاق کر دیں گے جیسے میرے پردادا نے اپنے ایک لڑکے کو جو لونڈی کے بطن سے پیدا ہوا تھا یہ سن کر عاق کر دیا تھا کہ وہ گاتا اور بھاؤ بتاتا ہے۔

اپنے ولولہ رقص کا گلا گھونٹ کر جب میں نے تاج محل کے دوسرے تماشائیوں کی طرف نگاہ اٹھائی تو یہ دیکھ کر حیرت میں غرق ہو گیا کہ وہ لوگ بھی بڑی سنجیدگی کے ساتھ ثبات عقل و ہوش تاج کا نظارہ کر رہے ہیں۔ اور ان میں سے ایک فرد بھی ناچ نہیں رہا ہے۔ تو میں سوچنے لگا کہ یہ سب کے سب کیا پتھر کے بنے ہوئے ہیں یا یہ تمام لوگ بھی اپنے اپنے پٹھان باپوں کے ساتھ یہاں آئے ہیں۔

گاڑیوں اور فیٹنوں میں روانہ ہو گئے..... زنانے ڈبے کے تینوں طرف قناتیں کھڑی کر دی گئیں خواتین اپنے اپنے درجے میں اور ہم سب اپنے ڈبے میں بیٹھ گئے۔

لکھنو اور کان پور ہوتی ہوئی جب ہماری گاڑی ٹونڈا جنکشن پہنچی تو دودھ گرام..... دودھ گرام..... پوری کاچوڑی (دودھ گرم پوری کچوری) کے نعروں نے بوکھلا دیا۔ اور کانوں کو ان بگڑے ہوئے لہجوں سے پتا چل گیا کہ ہمارا قافلہ اودھ سے بہت دور آ چکا ہے۔

وہاں ہمارے ڈبے کاٹ کر آگرے جانے والی گاڑی کے بریک کے پیچھے جوڑ دیے گئے۔ گاڑی آگے بڑھ کر جب آگرے کی طرف مڑنے لگی تو میرے باپ نے اشارہ کر کے بتایا دیکھو یہ تاج محل ہے میں نے ادھر نگاہ اٹھائی تو حیران ہو گیا۔ جلال و جمال کی ایسی متناسب ہم آہنگی کبھی دیکھی ہی نہیں تھی۔ میں ٹکٹکی باندھ کر دیکھنے لگا۔ دیکھتا رہا پلک جھپکائے بغیر دیکھتا رہا..... یہاں تک کہ گاڑی ایک طرف مڑ گئی۔ تاج اوجھل ہو گیا۔ اور گویا دودھ سا گیس کا ہنڈا چٹ سے ٹوٹ گیا۔ آگرہ فورٹ سٹیشن پر گاڑی رک گئی۔ مامنوں نے جھپٹ کر مجھے گلے لگا لیا۔ زنانے ڈبے کے گرد قناتیں

کھینچ دی گئیں اور ہم سب گزری منصور خان کی طرف جہاں نانا رہتے تھے روانہ ہو گئے۔ میں نے اپنے نانا جان کے محل کو جسے کسی فرانسیسی رئیس نے بنوایا تھا اپنے آبائی محلوں سے مختلف پایا۔ میں نے دیکھا کہ ہمارے محل دومنزلہ ہیں یہ سہ منزل ہے۔ ان میں بڑے بڑے در اور دالان ہیں یہ ایک دوسرے سے پیوستہ کمروں کا مجموعہ ہے۔ ان میں فقط روشن دان ہیں۔ اس میں جا بجا کھڑکیاں ہیں۔ ان کے صحن کشادہ ہیں۔ اس کا صحن نسبتہ چھوٹا ہے۔ ان میں سو ڈیڑھ سو آدمی رہ سکتے ہیں۔ اس میں چھ سات سو آدمیوں کی گنجائش ہے اور ہر چند یہ گزری منصور خاں کی ڈھال پر واقع ہے مگر اس قدر بلند ہے کہ گردوپیش کے تمام مکان اس کے آگے پست دکھائی دیتے ہیں اور اس کی مہتابی سے تاج محل نظر آتا ہے۔

تاج محل کا قریب سے دیدار

ہر مادی و ذہنی چیز میں بعد اضافہ اور قرب خفت پیدا کرتا ہے..... بعد اجمال ہوتا ہے اور قرب تفصیل اور اجمال تفصیل سے زیادہ حسین ہوتی ہے..... لیکن خدا گواہ کر کے کہتا ہوں کہ اگر اس وقت میں اپنے باپ کے ساتھ نہ ہوتا تو گریبان کے پرزے اڑا کر ایسا ایسا اچھلتا کودتا' ناچتا' قلابازیاں لگاتا شلنگیں بھرتا اور ایسے ایسے شندے اور دیوانے چارے کرتا کہ فوراً آگرے کے پاگل خانے بھیج دیا جاتا۔ اور وہاں جب کوئی پوچھتا کہ یہ تو نے اپنا کیا حال بنا رکھا ہے۔ تو اچک کر کسی درخت پر چڑھ جاتا اور اس کی سب سے اونچی شاخ پر بیٹھ کر یہ نعرہ لگاتا۔

با حسنش ایں جنوں کہ تو ' بینی ..... تحمل است
ناصح ' ملامتے مکن ' ایں نا شکیب را !!

☆☆☆

ولولہ تعلیم

میرے ولولہ تعلیم کے ساتھ میرے باپ نے وہ سلوک کیا جو بجلی خرمن سے کرتی ہے۔ بات یہ نہیں تھی کہ وہ مجھ کو جاہل رکھنا چاہتے تھے۔ مگر سارا کھیل بگاڑے ہوئے تھی۔ ان کی غیر معمولی محبت بے حد و حساب محبت وہ دل سے چاہتے تھے..... کہ میں پڑھوں تو ضرور مگر ان کی آنکھوں سے ایک پل کے لیے بھی جدا نہ ہونے پاؤں..... اور اس بے کراں محبت کی بنا پر جب میں دانت نکال نکال کر ان کی خدمت میں عرض کرتا تھا کہ میاں مجھ کو پڑھنے کے لیے کہیں باہر بھیج دیجیے میں گھر پر نہیں پڑھ سکوں گا مولوی الٹے مجھ سے ڈرتے ہیں..... ڈرنے والے مولوی پڑھا نہیں سکتے۔ تو ان کے چہرے پر ایک شدید قسم کا کرب کا رنگ دوڑ جایا کرتا تھا۔ تنگ آ کر میں نے گھر کی تمام دیواریں کوئلے سے تعلیم کا بھوکا شیر لکھ لکھ کر سیاہ کر ڈالیں۔ میاں نوکروں سے ان تحریروں کو مٹوا دیتے تھے۔ اور میں پھر لکھ دیتا تھا۔

آخر کار میں نے اپنی پھپی زاد بھائی اور تعلیم کے شیدائی صفدر حسین خاں کو پکڑا کہ آپ میاں سے میری سفارش کر دیں..... صفدر بھائی مسدس حالی کی نسل میں سے تھے انہوں نے میری امداد کا وعدہ کیا۔ ان کا یہ احسان میں کبھی نہیں بھولوں گا کہ انہوں نے میری تعلیم کے بارے میں میرے باپ سے بار بار کہا اور بڑے اصرار کے ساتھ کہا لیکن میاں نے اس کان سے سنا اور اس کان سے اڑا دیا۔

لیکن صفدر بھائی دھن کے پکے تھے۔ ہمت نہیں ہارے۔ ایک روز شام کے وقت میاں کو بڑے اچھے مود میں پا کر انہوں نے بڑی جسارت کے ساتھ یہاں تک کہہ دیا کہ مانموں اب زمانہ بدل چکا ہے..... جو بچہ گھر کے رئیسانہ ماحول سے باہر نکل کر نہیں پڑھے گا وہ شریفوں کی اولاد بے تربیت ہے۔ کے زمرے میں آ کر تباہ ہو جائے گا۔ مانموں آپ خاندان بھر میں سب سے زیادہ پڑھے لکھے اور عقل مند آدمی ہیں۔ اور پھر بھی تعلیم سے اس قدر غفلت برت رہے ہیں۔

یہ سن کر میاں بگڑ گئے اور ارشاد فرمایا صفدر..... ایک چھوڑ چار چار معلم اس کو پڑھا رہے ہیں یہ اس عمر میں گلستان اور بوستان' سکندر نامہ اور دیوان حافظ چاٹ چکا ہے اور گومتی پرشاد سے انگریزی بھی پڑھ رہا ہے کیا اسی کا نام ہے تعلیم سے غفلت.....! صفدر بھائی نے بات جوڑ کر کہا میں سر جھکائے لیتا ہوں آپ چاہیں تو مجھ کو مار لیں مگر اس قدر ضرور عرض کروں گا چار کیا دس استاد بھی ایسے ماحول میں بے کار ہیں مانمون رئیسوں کے بچے مولویوں سے نہیں ڈر سکتے۔ بلکہ الٹے مولوی ان سے خوف کھاتے ہیں۔ مانموں..... یہ تو آپ کے سامنے کی بات ہے کہ نسیم نانان کے ایک بچے کو باہر سے آئے ہوئے ایک استاد نے ہلکا سا تھپڑ مار دیا تھا تو انہوں نے اس کا ہاتھ فوراً تڑوا دیا تھا۔..... اس دن سے یہاں کے تمام استاد اور بھی ڈر گئے ہیں اور اپنے شاگردوں کو گھرکی تک دینے کی جرات نہیں کرتے''۔ یہ سن کر میاں کچھ سوچنے لگے۔ صفدر بھائی نے اشارے سے بتایا کہ آثار اچھے ہیں۔ تھوڑی دیر غور کرنے کے بعد میاں نے کہا کہ صفدر یہ تو بتاؤ شبیر کو بھیجوں تو بھیجوں کہاں لکھنو ہر چند قریب ہے مگر وہاں کے رنگین اِ ماحول میں یہ

اِ اے میاں کو یہ کب معلوم تھا کہ وہ جس شبیر کو مرد صالح بنانا اور بگڑنے سے بچانا چاہتے ہیں وہ بگڑے ہوئے بغیر مانے گا نہیں۔ اور اس کا اگر بسم اللہ کے گنبد میں بند کر کے اس کے پاؤں میں اخلاقی جلالی کی زنجیریں بھی ڈال دی جائیں گی پھر بھی یہ شبیر اس گنبد اور ان زنجیروں کو توڑ پھوڑ کر حریم بتاں و بارگاہ مغاں میں پہنچ جائے گا۔ کاش میاں ہی کو نہیں دنیا کے تمام باپوں کو یہ معلوم ہوتا کہ اپنے بیٹے اور اس کے فطری میلان کے بیچ میں آ کر کوئی باپ تا دیر ٹھہر ہی نہیں سکتا۔ اس لیے کہ داخلی تقاضوں کو خارجی احکام نیچا نہیں دکھا سکتے۔ اگر کروروں انبیاء پانی کو یہ حکم دیں کہ وہ نشیب کی طرف نہیں فراز کی طرف بہنے لگے پانی ان کا حکم نہیں مانے گا اور نشیب کی جانب ہی بہتا رہے گا۔ اگر یہ سن کر کوئی انسان کے ذی شعور اور پانی کے بے شعور ہونے کی بات

کرے گا تو غور کرنے کے بعد اس کو پتا چل جائے گا کہ شعور بھی فطری تقاضوں اور جبلتوں کی زنجیر میں جکڑا ہوا ہے۔

بگڑ جائے گا۔ صفدر بھائی نے کہا مانموں یہ میں خود بھی نہیں چاہتا کہ ان کی تعلیم لکھنو میں ہو میں اپنے بیٹے اسرار حسن کو سیتا پور میں پڑھا رہا ہوں آپ شبیر میاں کو سیتا پور بھیج دیں وہاں ملیح آباد کے بہت سے لڑکے یعنی عبدالباری عبدالعزیز فخر الحسن پڑھ رہے ہیں اور شبیر میاں کالنگو ٹیا یار ابرار بھی وہیں تعلیم پا رہا ہے۔

میاں نے یہ سن کر ارشاد فرمایا اچھا صفدر..... ایک مہینے کے بعد شبیر کو سیتا پور لے جانا میں اس ایک مہینے میں اپنے دل کو بھی سمجھالوں گا..... یہ سنتے ہی میرا دل قلقاریاں مارنے لگا۔

لیکن جب پورا مہینہ گزر جانے کے باوجود میاں کا وعدہ ایفا نہیں ہوا تو میری امیدوں پر پانی پھر گیا۔

اسی اثناء میں جب لفٹیننٹ گورنر سے ملنے کے لیے میاں لکھنو جانے لگے تو میں بھی ساتھ ہولیا۔ اور جب وہ لاٹ صاحب سے مل کر رخصت ہونے لگے تو میں پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ لاٹ صاحب نے میرے باپ سے پوچھا آپ کا یہ لڑکا رو کیوں رہا ہے؟ تو میں نے ان سے تمام ماجرا بیان کر دیا۔ لاٹ صاحب نے بڑھ کر میرے سر پر ہاتھ پھیرا۔ اور میرے باپ سے اپنی ٹوٹی پھوٹی اردو میں کہا اس کا مفہوم یہ تھا کہ خاں صاحب آپ بڑے خوش قسمت ہیں ایسے علم کے شوقین لڑکے کو تو ولایت میں بھی نہیں ہیں۔ آپ اس کو ایک مہینے کے اندر اندر کسی سکول میں داخل کر کے مجھے مطلع کریں۔ اتنا کہہ کر اس نے بڑے پیار سے میرے گال تھپتھپائے اور کہا اگر خاں صاحب نے میری بات نہیں مانی تو میں سرکاری وظیفہ دلا کر تم کو تعلیم کے واسطے لندن بھیج دوں گا"۔

گورنمنٹ ہاؤس سے نکل کر جب میاں گاڑی میں بیٹھے تو مجھ پر برس پڑے۔

فرمایا

مردود تو نے لفٹیننٹ سے میری شکایت کیوں کی اور وہ بھی میرے منہ پر..... کیا تو یہ سمجھتا ہے کہ میں اس لال منہ والے بندر سے ڈر جاؤں گا؟ خوب کان کھول کر سن لو کہ اگر لفٹیننٹ گورنر کے باپ بھی کہیں گے پھر بھی میں تجھ کو گھر سے باہر بھیج کر نہیں پڑھانے کا..... ایسی تیسی لاٹ صاحب کی..... یہ سنتے ہی میں پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا ہچکیاں بندھ گئیں روتے روتے..... اور دوران گریہ فرط قلق سے میری سانس میرے گلے میں گھوم پھر کر کچھ ایسے زبردست جھٹکے سے نکلی کہ میرے عاشق باپ کا منہ فق ہو گیا فرط محبت سے ان کو یہ خطرہ پیدا ہو گیا کہ میرا دل بیٹھ جائے گا۔ انہوں نے دیوانہ وار دونوں ہاتھ بڑھا کر مجھ کو اپنے سینے سے لگا لیا۔ اور انتہائی عجلت کے ساتھ کہا تیرے سر کی قسم ایک مہینے کے اندر میں تجھ کو سیتاپور بھیج دوں گا..... میری سانس ٹھہر گئی ہچکیاں رک گئیں۔ آنسو تھم گئے۔ میرے باپ نے مجھ کو بہت غور سے دیکھ کر پوچھا بیٹا اب طبیعت کیسی ہے۔ میں نے مسکرا کر کہا اچھا ہوں میاں۔ ان کے چہرے پر بحالی آ گئی۔ اور میں دل ہی دل میں سیتاپور جانے کے دن گننے لگا۔

ملیح آباد آتے ہی میاں نے صفدر بھائی کو بلا بھیجا اور کہا صفدر تم شبیر کو جمعہ کے دن سیتاپور لے جاؤ میرا دل خوشی کے مارے اچھلنے لگا۔

دو دن کے اندر اندر میرے ساتھ جانے والی باورچی کا جس کو سید کے نام سے پکارا جاتا تھا تقرر کر دیا گیا اور صفدر بھائی نے چار پانچ دن کے اندر اندر میرے تمام زریں اور بھڑکیلے کپڑے نظری کر کے سادہ جوڑے سلوا دیے۔

خدا خدا کر کے جمعہ آیا۔ میرا تمام سامان گاڑی میں رکھوا دیا گیا۔ لیکن بڑی بی دادی ماں اور سب سے زیادہ میرے باپ کی رخصتی آنسوؤں میں گاڑی کا وقت بہہ گیا اور میں کلیجہ تھام کر رہ گیا۔

دوسرا جمعہ آیا..... میں گاڑی کے وقت سے دو گھنٹے پیش تر ہی تیار ہو گیا..... دادی

اور ماں نے میرے بازو پر امام ضامن باندھے سب نے یکے بعد دیگرے مجھے گلے سے لگایا۔ بڑی بی نے بھی مجھ کو سینے سے چمٹالیا۔ میاں نے اس قدر بھینچ کر مجھے سینے سے لگایا کہ میری پسلیاں لچک گئیں۔ اور میرے سینے پر ان کے دھڑکتے دل کی ضربیں پڑنے لگیں..... آنگن میں پہنچ کر جب حسب دستور قرآن کے نیچے سے نکلے تو میاں نے بھرائی ہوء آواز میں حکم دیا کہ ادھر آؤ بیٹا میں ان کے پاس پہنچا انہوں نے ارشاد فرمایا تھوری دیر کے واسطے بیٹھ جاؤ۔ اور دو چار منٹ کے بعد جب میں نے گھڑی پر نظر جمائی اور فرط اضطراب سے کسمسانے لگا تو میاں نے بری درد بھری آواز میں فرمایا

می روی دگر یہ می آید مرا
ساعتے منشیں کہ باراں بگزرد

اتنے میں صفدر بھائی آ گئے اور بات جوڑ کر کہا مانموں گاری چھوٹ جائے گی۔ میاں نے میرے چہرے پر نگاہیں جما دیں۔ اور پھر اشارے سے مجھ کو رخصت کی اجازت دے کر سر جھکا لیا۔ میاں کے ساتھ پورا گھر رونے لگا۔ میں نے آنسو بھری آنکھوں سے سب کو جھک جھک کر سلام کیا۔ اور جب باہر جانے کے واسطے ڈیوڑھی سے گزرنے لگا تو ہچکیاں میرا تعاقب کرنے لگیں..... اور میاں کی آواز سنائی دی۔

سرو سیمینا بصحرا می روی
سخت بے مہری کہ بے مامی روی

الغرض گھر سے باہر اس طرح آیا جیسے بھرے گھر سے جنازہ نکلتا ہے۔

تھرڈ کلاس اور اکے کا پہلا تجربہ

صفدر بھائی نے سٹیشن جاتے ہوئے مجھ کو ایک لمبا لیکچر پلایا۔ جس کا خلاصہ یہ تھا کہ اب زمانہ تیزی کے ساتھ بدل رہا ہے امیری کی بو اپنے سر سے نکال دوں مانموں نے مجھ کو فرسٹ کلاس کا کرایہ دیا ہے مگر میں تم کو لے جاؤں گا تھرڈ کلاس میں..... منظور

ہے تمہیں۔ مجھ کو کیا معلوم تھا کہ تھرڈ کے مسافروں کو کن کن بلاؤں سے دوچار ہونا پڑتا ہے میں نے ان کی تجویز منظور کر لی۔

لیکن تھرڈ کلاس میں قدم رکھا تو جی سن سے ہو کے رہ گیا۔ پاؤں کے نیچے سے زمین نکل گئی۔ سب سے پہلے اس ڈبے کی اس بدبو نے میرے دل پر گھونسا مارا جس سے میں کبھی دوچار نہیں ہوا تھا۔ پھر میں نے دیکھا کہ وہ ڈبہ اوندھا اوندھا سا ہے..... اور بے گدوں کی کھردری ذلیل بنچیں میرا منہ چڑھا رہی ہیں..... اور ایک بنچ پر چند گنوار، بچھو مارکہ تمباکو کی چلمیں پی پی کر بری طرح..... کھانس رہے ہیں۔ ناک میں ڈنگ مارنے لگی گڑ کی بدبو..... مرتا کیا نہ کرتا سر جھکا کر کھری سیٹ پر بیٹھ گیا۔ سیٹ چبھنے لگی..... سانس میرے سینے میں الجھ گئی اور امام ضامن گرم ہو کر میرے بازو پر چپکے لگانے لگے اور میں کھڑکی سے منہ نکال کر بیٹھ گیا..... اور چار باغ سے نکل کر صفدر بھائی نے دو خبیث اکے والوں کو اشارے سے بلایا۔ اور دو دو کوڑی کے ذلیل اکے اپنے گدھوں کے سے افیونی گھوڑوں کے ساتھ چوں چوں کرتے جب میری طرف رینگنے لگے تو مجھے ایسا لگا کہ جیسے منہ کالا کر کے مجھے گدھے پر بٹھایا جا رہا ہے۔ صفدر بھائی نے میری حالت کا اندازہ لگا کر قہقہہ مارا اور ان کا وہ قہقہہ اضافہ اہانت برجراحت کی طرح مجھے بہت ہی برا لگا۔ انہوں نے مجھ کو جز بز دیکھ کر کہا شبیر میاں یہ آپریشن نہایت مفید ہے اس سے تمہارے دل میں جو غرور کا مادہ فاسد ہے وہ خارج ہو جائے گا۔ میں چپ ہو گیا۔

اکا میرے قریب آیا تو میں نے کہا صفدر بھائی اس پر بیٹھوں کیوں کر..... انہوں نے میری بغلوں میں ہات دے کر مجھے بہزاد دقت بٹھا دیا اور دوسرے اکے پر سید باورچی سامان سمیت سوار ہو گیا۔

اکے کے چکنے گدے کی بو سے مجھے متلی ہونے لگی۔ اور یاد آ گیا حافظ کا یہ مصرع۔

صد منزل است و منزل اول قیامت است

اب چار باغ سے ہمارے ذلیل اکے[1] اغامیر کی ڈیوڑھی کی طرف رسان رسان رینگنے لگے۔

جب ہمارا اکا جھاؤ لال کے پل پر سے گزرنے لگا تو میری نظروں کے سامنے سے اپنے پردادا کا محلّہ گزرنے لگا۔ جس کے نکڑ کے پتھر پر احاطہ فقیر محمد خاں جلی حروف میں کندہ تھا۔ اس بورڈ کو دیکھ کر میرے تمام رونگٹے جھن سے ہو گئے۔ خیال آیا کہ ادھر سے دادا جان ہاتھی پر گزرتے اور ان کی سواری کے آگے نقیب بولا کرتے تھے۔ آج اسی طرف سے ان کا پوتا ایک حقیر طوطہ بنا ہوا اکے میں بیٹھا ترخ ٹوں ترخ ٹوں گزر رہا ہے شرم کے مارے میں نے اپنا منہ چھپا لیا۔

---

[1] اس زمانے میں سیتا پور جانے والی چھوٹی لائن کی گاڑی کے واسطے سٹی اسٹیشن جانا پڑتا تھا۔ جو آغامیر کی ڈیوڑھی میں واقع تھا۔

الغرض بہزار کوفت و ذلت سیتا پور پہنچ گیا۔ ملیح آباد کے تمام لڑکے نہال ہو گئے۔ اور ابرار نے دوڑ کر میرے گلے میں بانہیں ڈال دیں۔

دوسرے ہی دن میرا نام برانچ کے سکول میں لکھا دیا گیا۔ صفدر بھائی نے ہائی سکول کے فرشتہ سیرت ہیڈ ماسٹر بابو گھمنڈی لال اور بورڈنگ کے ہنس مکھ انچارج گھوش بابو سے بھی مجھے ملا دیا اور میں ہزاروں ولولوں کے ساتھ باقاعدہ سکول آنے جانے اور جی لگا کے لکھنے پڑھنے میں سرگرم ہو گیا۔

ابھی سیتا پور آئے بمشکل پندرہ بیس دن ہی گزرے ہوں گے ایک روز شام کو کیا دیکھتا ہوں کہ ہمارے گھر کے داروغہ شیخ امید علی چلے آتے ہیں شیخ صاحب کو دیکھ کر میں سمجھا کہ میاں سیتا پور تشریف لائے ہیں لیکن جب داروغہ صاحب نے میاں کا خط دکھایا تو معلوم ہوا کہ میاں نے فقط دو روز کے لیے ملیح آباد بلایا ہے..... دو دن کی چھٹی لے کر جب رات کی گیارہ بجے والی گاڑی سے ملیح آباد آیا اور اپنے مکان کی گلی میں پہنچا تو یہ دیکھا کہ میاں ڈاکٹر عبدالکریم اور چند سپاہیوں کو لیے خلاف معمول اچکن اور

ٹوپی کے بغیر پھاٹک سے برآمد ہو رہ ہیں ..... اور جیسے ہی مجھ پر ان کی نظر پڑی ہائے میرا بیٹا کہہ کر وہ جھپٹ پڑے۔ اور مجھ کو سینے سے لگا کر رونے لگے۔ ڈاکٹر عبدالکریم نے فرمایا خان صاحب آپ خوش ہونے کے عوض رو رہے ہیں۔ میرے باپ نے ارشاد فرمایا ڈاکٹر صاحب کاکوری کے پل سے گزرتے ہی یہ ایک سنت جاریہ ہے کہ ریل ہمیشہ سیٹی دیتی ہیل لیکن آج اسنے سیٹی نہیں دی۔ اور میں یہ خیال کر کے دیوانہ ہو گیا کہ کہیں خدانخواستہ پل تو نہیں ٹوٹ گیا ہے ڈاکٹر صاحب جس کا بیٹا ریل سے آ رہا ہو اس کے جی سے پوچھیے کہ وقت مقرر پر ریل کا سیٹی نہ دینا کتنے واہموں کو برانگیختہ کر سکتا ہے ڈاکٹر صاحب نے کہا خاں صاحب سچ کہا ہے کسی نے

عشق است و ہزار بدگمانی

سیتاپور میں میری تعلیم کا سلسلہ ڈیڑھ سال سے زیادہ جاری نہیں رہ سکا۔ اور میری مفارقت کی تاب نہ لا کر غالباً سنہ ۱۹۰۸ء میں میرے باپ نے مجھ کو لکھنو طلب فرما کر حسین آباد کے ہائی سکول[1] میں داخل کرا دیا اور میرے قیام کے واسطے نخاس (چڑیا بازار) میں سید اعجاز حسین صاحب کے مکان کا بالائی اور کشادہ حصہ کرائے پر لے لیا گیا۔ میرے مکان کے نیچے ایک منشی واحد علی نوادر کی دکان تھی اس کی دکان کے سامنے کسی بزرگ کا مزار تھا جس پر ہر جمعہ رات کو چراغاں ہوا کرتا تھا اور اس کے اطراف میں ہر اتوار کو چڑیوں کا بازار لگا کرتا تھا اور میرے مکان[2] کے عین سامنے حضرت ریاض خیرآبادی رہتے تھے۔

میں اس واقعے کو آج تک نہیں بھولا۔ کہ جس روز میں نے اس مکان کے چوڑے چکلے سینے میں جس کے دونوں طرف نیچے سے اوپر تک بڑے شاداب گملے رکھے ہوئے تھے پہلا قدم رکھا تھا تو ہوائے سرد کے ایک تیز اور معطر جھونکے نے میرا اس دل نوازی سے استقبال کیا تھا کہ میرے سینے کی تمام کھڑکیاں تڑاتڑ کھل گئی تھیں اور جگر میں ایک ایسی نشہ آور خنکی محسوس ہوئی تھی کہ میں جھومنے لگا تھا۔

خدا گواہ ہوارے سر دوشکریں کا وہ پھولوں میں بسا باریک دھارو الا جھونکا میرے سال خوردہ ارگرم وسرد کشیدہ سینے میں آج کی تاریخ تک محفوظ ہے اور رسا بسا ہے اور میرے تھکے ہوئے پھیپھڑے اس کی تازگی کو اس تحریر کے وقت تک فراموش نہیں کر سکے ہیں۔

۱اس سکول میں آغائی صاحب کے پوتے اور میرے ساتھ میرزا حبیب حسین صاحب ہیڈ ماسٹر کے حکم سے یہ امتیازی برتاؤ کیا گیا تھا کہ تمام لڑکے تو بنچوں پر بٹھائے جاتے تھے لیکن ہم دونوں کو کلاس ٹیچر کی میز کے داہنے بائیں کرسیوں پر بٹھایا جاتا تھا۔ اور وہیں میں چھٹے اور ساتویں درجے کا امتحان پاس کر کے آٹھویں درجے میں آ گیا تھا سید محمد جواد صاحب جو ہمارے دینیات کے معلم تھے۔ ہر چند مجھے دینیات سے کوئی دلچسپی نہ تھی مگر سید صاحب کے کلاس میں بڑے شوق سے جاتا تھا اور ان کی عربی وفارسی کی غیر معمولی قابلیت سے فیض یاب ہوا کرتا تھا۔ میرزا حبیب حسین صاحب اور سید محمد جواد صاحب کی شخصیتوں اور شفقتوں کو میں عمر بھر یاد رکھوں گا۔ اور اللہ جنت نصیب کرے مجھ میں اگر معصومیت ہوتی تو میں ان دونوں بزرگوں کے واسطے تمام عمر یہی دعا کرتا رہتا۔

۲وہ مکان شہید کر ڈالا گیا ہے۔ اور اس کی بنیادوں پر ایک نیا مکان تعمیر کرا کے اب وہاں ایک مطربہ رہتے رہے آ کے سجادہ نشین قیس ہوا میرے بعد۔

اب کبھی جب کبھی پاکستان سے لکھنو جاتا ہوں اور اپنے وطن میں ایک پردیسی کے مانند گھومتا ہوں جب نخاس کی طرف نکل جاتا ہوں وہ سب سے پہلا جھونکا چڑیا گھر کے درختوں سے اتر کر نیچے آتا ہے اور ہائے میرے شبیر کا دردناک نعرہ لگ اکر میری گردن میں بانہیں ڈال دیتا ہے اور ہچکیوں پر ہچکیاں لینے لگتا ہے۔ جرنیلی ٹوپی اور سونے کے درکا وہ لڑکا جو وہاں سے حسین آباد سکول جایا کرتا تھا۔ میرے وجود کے احاطے سے نکل کر میرے سامنے آ کھڑا ہوتا ہے اور بڑی رقت کے ساتھ پوچھتا ہے

کہ میں اب یہ ہو کر رہ گیا ہوں۔ اور اسی لمحے کے اندر میرا محبوب عطا حسین قز لباش جو اب اس دنیا میں نہیں ہے اور ہر روز مجھ سے ملنے آیا کرتا تھا۔ سیاہ شیروانی پہنے اور آنکھوں میں آنسو بھرے اس دردانگیز مسکراہٹ کے ساتھ میری طرف آنکھیں اٹھا کر اپنا سر جھکا لیتا ہے جس مسکراہٹ کی دھاریوں میں کروڑوں نوحے کروٹیں لیتے رہتے ہیں ہائے کھائے جا رہی ہیں مجھ کو پرانی یادیں دل پھٹا جا رہا ہے میرا اے میرے اللہ!

اس زمانے میں میرے مکان کے سامنے اور حضرت ریاض خیر آبادی کے مکان کی دیوار کے نیچے دور تک گھوڑا گاڑیوں کا اڈہ تھا۔ جہاں پچیس تیس گاڑی والے رہتے تھے۔ اور ہر روز بلا ناغہ صبح سے چار پانچ بجے۔ ایک صاحب وکٹوریہ روڈ کی طرف سے مولیٰ اعلیٰ امام علی مرتضیٰ علی گاتے ہوئے جیسے ہی میرے مکان کے سامنے سے گزرتے تھے تو گاڑی والے ٹھمکی دار آواز میں نعرہ لگایا کرتے تھے۔ نواب صاحب بکرا حاضر ہے۔ اور وہ نواب صاحب ان کو گالیوں پر دھر لیا کرتے تھے۔ لیکن کیا مجال کہ کوئی فحش لفظ زبان پر آجائے۔

جیسے ہی گاڑی والوں کی آواز بلند ہوتی تھی کہ نواب صاحب بکرا حاضر ہے ویسے ہی وہ بڑی سریلی اور ٹھہری ہوئی آواز میں کہتے تھے اے آل رسول کے دشمنو اے معاویہ کے دنبو اے ابن زیاد کے اونٹو تم پر لعنت تم پر آخ تھو اے یزید کے پلو اے ابن ملجم کے بوکڑو۔ اے ہند جگر خوار کے پڑدو۔ تم پر لعنت ہزار بار لعنت اے کنواریوں کے جنو لعنت لعنت ہزار بار لعنت آخ تھو آخ تھو آخ تھو اور ان گالیوں پر گاڑی والوں کے قہقہے بلند ہو جاتے تھے اور جب وہ گالیاں دیتے ہوئے گڑھے والی سرائے کی طرف مڑنے لگتے تھے تو گاڑی والوں کی آواز پھر بلند ہو جاتی تھی نواب صاحب بکرا حاضر ہے..... نواب صاحب بکرا حاضر ہے اور وہ اسی نوع کی گالیاں دیتے ہوئے مڑ جایا کرتے تھے اور اس طرف میرے گونڈے کے باشندے میاں نوروز باورچی کا بھی یہ معمول تھا کہ جب وہ نواب صاحب بکرا حاضر ہے کی آوازیں سنتے تھے..... تو

چارپائی پر اٹھ بیٹھ جاتے اور بڑبڑانے لگتے تھے کہ ان سالے گاڑے والوں پر نالت (لعنت) روج روج (روز روز) بکرا حاجر بکرا حاجر (بکرا حاضر) بیکھا کرت ہیں (چیخا کرتے ہیں) یو (یہ) کا (کیا) وارے ہات (واہیات) پنا (پن) ہے سالے سویرے سویرے اللہ رسول کا نام تولیت (لیتے) ناہیں (نہیں) بکرا حاجر بکرا حاجر کا گل (غل) مچائے رہت (رہتے) ہیں تھوک ہے ان کی اوقات پر۔

ایک روز کا ذکر ہے کہ اس نواب صاحب بکرا حاضر ہے کے ہنگامے میں کوئی گھنٹے دو گھنٹے بیشتر میں اپنا سبوق یاد کرنے کے بعد دیوان حافظ کے مطالعے میں غرق تھا۔ چاندنی چھٹکی ہوئی تھی تارے جھلملا رہے تھے۔ کہ سڑک پر میرے مکان کے نیچے سے بھیرویں میں ڈھلی ایک تان لرزتی آئی۔

سحر بابادمی گفتم حدیث آرزو مندی
خطاب آمد کہ واثق شو بالطاف خداوندی

اور یہ بھی عجیب اتفاقیہ بت تھی کہ میں بھی اس وقت یہی غزل پڑھ رہا تھا صبح کا سہانا وقت نسیم سحر کے ہلکے ہلکے جھونکے..... دھندلکے میں طلسمی شان اور اس پر یہ درد بھری تان..... میرے تمام بدن میں راگنی دوڑنے لگی۔

ابھی میرا تمام بدن گنگنا رہا تھا کہ اسی لوچ کے ساتھ دوسری تان سنی۔

دعائے صبح و آہ شب کلید گنج مقصود است
بایں راہ و روش می رو کہ بادل دار پیوندی

---

[1] دراصل وہ سرائے نہیں تھی بلکہ ٹکھائیوں کا چھوٹا اس محلّہ تھا جو اب سڑک میں آ چکا ہے۔

اب مجھ سے رہا نہیں گیا ایک ایک چھلانگ میں دو دو تین تین سیڑھیاں طے کرتا سڑک پر آ گیا۔ اور دیکھا کہ ایک گورے چٹے سفید داڑھی کے دراز قامت بزرگ میرے مکان کے نیچے والی قبر کی طرف منہ کیے دھیمے سروں میں گا رہے ہیں۔

بایں راہ و روش می رو کہ با دل دار پیوندی

نہ جانے میرے دل پر کیا بیت گئی کہ میں ہچکیاں لے لے کر رونے لگا۔ ان بزرگ نے بڑی حیرت کے ساتھ مڑ کر دیکھا تو مجھے موجود پایا۔ اور زیر لب کہا اللہ اللہ یہ عمر اور اس قدر دردمندی..... میاں صاحب زادے تم کون ہو؟ میں نے کہا کہ میں طالب علم ہوں۔ وہ میرے قریب آ گئے اور کہا ''صاحب زادے ذرا ادھر سڑک کی روشنی کے نیچے تو آ جاؤ'' میں روشنی کے کھمبے کے نیچے آ گیا۔ انہوں نے مجھے بڑے غور سے دیکھا بار بار دیکھا..... اور اس طرح دیکھا جیسے کوئی چیز ان کی جاتی ہے..... اور پھر کانپتی آواز میں دوبارہ پوچھا۔ صاحب زادے تم کون ہو؟..... میں نے پھر وہی کہا طالب علم ہوں۔ انہوں نے یہ سن کر آسمان کی طرف آنکھیں اٹھائیں اور بڑی آہستگی سے کہا صاحب زادے تم طالب علم نہیں مطلوب علم ہو۔ مطلوب علم ہو۔ ان کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے اور

در خرابات مغاں نور خدا می بینم

دیں عجب کہ چہ نورے زکجا می بینم

کہتے ہوئے کڑہ ابوتراب خاں کی ڈھال کی جانب مڑ گئے..... اور میں تا دیر اس طرح مبہوت کھڑا رہا گویا میں اس دنیا میں موجود ہی نہیں ہوں۔ اور اس وقت بھی جب کہ میں اس واقعے کو قلم بند کر رہا ہوں میرے رونگٹے کھڑے ہوئے ہیں اور وہ چاندنی رات مجھ پر چھائی ہوئی ہے۔ اور ان بزرگ کی آواز کڑہ نواب ابوتراب خاں کے موڑ سے اس وقت بھی میرے کانوں میں آ رہی ہے۔

دیں عجب بیں کہ چہ نورے نہ کجا می بنیم!!

☆☆☆

میرا نکاح

میرا نکاح ایسا ویسا نہیں بڑی ضدم ضدا اور بڑی چوٹم چاٹا کا نکاح تھا۔ اس صورت حال کی تھوڑی سی تفصیل بھی سن لیجیے۔ میرے دادا نواب محمد احمد خاں کے مختلف البطن بھائی تھے نواب محمد نسیم خاں..... ان دونوں بھائیوں کے مابین حسب دستور خاندان بنی امیہ اور بنی ہاشم کے مانند، بڑی ان بن اور بڑی تن پھن رہا کرتی تھی۔ میرے خسر نواب محمد نسیم خاں کے بیٹے تھے اور میں نواب محمد احمد خاں کا پوتا تھا اس لیے میرے خسر کے بڑے بھائی نواب محمد علی خاں کو یہ بات پسند نہیں تھی کہ ان کے چھوٹے بھائی کی لڑکی سے میرا نکاح ہو، لیکن چوں کہ میرے خسر اور میرے باپ کے درمیان دستور خاندان کے خلاف بڑی گہری محبت تھی اس لیے میرے باپ نے جب میرا پیام دیا تو انہوں نے منظور فرما لیا۔ اور ان کی منظوری سے میرے خسر کا تمام قبیلہ بگڑ گیا اور میرے چچا نواب محمد علی خاں کو خصوصیت کے ساتھ بے حد ملال ہوا..... اور اس بنا پر میرے نکاح کے موقع پر میرے نکاح کو خوشی کے ساتھ ساتھ یہ جذبہ بھی کارفرمائی کر رہا تھا کہ میرے خسر کے تمام قبیلے کے علی الرغم میرا نکاح ہو رہا ہے۔ اللہ اللہ میرے نکاح کا دھوم دھڑکا..... بڑی دھوم سے مجرے ہوئے دعوتیں ہوئیں، اور عین نکاح کے دن دشمنوں کو جلانے کے لیے اس قدر زور زور سے ڈھول پیٹے گئے اور اس قدر شدت سے تاشے بجائے گئے اور اتنے بڑے بڑے ہوذرگولے چھوڑے گئے کہ ان کی دوں دوں دناؤن دناؤن سے دور دور تک زمین ہلنے لگی۔ ہائے پٹھانوں کا مزاج!

---

[1] اس وقت میری عمر ہوگی مشکل سے گیارہ بارہ برس کی۔

لیکن یہ نکاح آگے چل کر کیا رنگ لایا کتنا بڑا فتنہ اٹھ کھڑا ہوا اس کے بعد۔ اور میرے سہرے کے پھولوں نے کتنے کانٹے بو دیے میرے باپ کی رہ گزار حیات میں اس کا ذکر آگے آئے گا۔

یوں تو نو برس کی عمر سے ہی شعر کی دیوی نے مجھ کو آغوش میں لے کر مجھ سے شعر

کہلانا شروع کر دیا تھا۔لیکن آگے چل کر جب شاعری سے میرا انہماک بڑھنے لگا تو شاید اس خیال سے کہ اگر میں شاعری میں ڈوب گیا تو میری تعلیم ناقص رہ جائے گی میرے باپ کے کان کھڑے ہو گئے' اور انہوں نے مجھ سے ارشاد فرمایا کہ خبردار اب اگر تم نے شاعری کی تو مجھ سے برا کوئی نہ ہو گا۔!اور اس کے ساتھ انہوں نے زنانے میں بوا گلزار اور مردانے میں داروغہ امید علی کو مامور فرمایا کہ وہ جب مجھے شعر کہتے دیکھیں تو ان کی جناب میں رپورٹ پیش کریں۲۔باپ کے اس حکم امتناعی اور زنانہ و مردانہ خفیہ پولیس کے تقرر نے مجھ کو بوکھلا دیا۔

!میری تو نو برس کی جان اور شاعری کے میلان پر تعجب نہ فرمائیے۔ذرا سوچیے کہ وہ بچہ جس کا باپ بھی شاعر ہو دادا بھی شاعر ہو دو سوتیلے چچا بھی شاعر ہوں بڑی پھپّی بڑی بہن اور بڑا بھائی بھی شاعر ہو جس کا حقیقی ماموں بھی شاعر ہو۔جس کے باپ کا ماموں بھی شاعر ہو جس کی دادی میرزا غالب کی قرابت دار ہو اور اردو فارسی کے اشعار برمحل سناتی ہو جس کی انا خالص لکھنوی ہو اور رات کے وقت کھلی ہے کنج قفس میں مری زبان صیاد کی لوری دے دے کر اس کو سلاتی ہو جس کے گھر میں آئے دن لکھنو کے شاعر آتے جاتے اور تیسرے چوتھے مہینے مشاعرے ہوتے رہتے ہوں اور جو شعراء کے دیوانوں کو پتنگ اور گولیوں کی طرح کھیل کر پروان چڑھا ہو وہ شعر نہیں کہے گا تو اور کیا کرے گا؟.....۲بوا گل زار اور داروغہ امید علی جب مجھے شعر کہتے پکڑ لیتے تھے تو میں دانت نکال نکال کر استدعا کرتا تھا کہ خدا کے لیے میاں تک یہ بات نہ پہنچانا۔لیکن وہ دونوں اس قدر بے مروت اور بے درد تھے کہ میری رپورٹ کرنے سے چوکتے ہی نہ تھے۔بوا گلزار نے میری چغلیاں کھا کھا کر اس قدر روپیہ جمع کر لیا تھا کہ سونے جھونے سے اپنی بیٹی کا نکاح کیا اور داروغہ امید علی نے اس قدر انعام پایا کہ ایک آم کا باغ لگا لیا اور بہت سی زمینیں بھی خرید لیں۔شاعری نے مجھ کو تو برباد کر ڈالا تھا مگر میرے مخبروں کے گھر بھر دیے

آپ	کو	سوخت	غیر	کو	لذت
یہ	مزا	ہم	کباب	میں	دیکھا

مشیت کا یہ فرمان کہ شاعری کر، شریعت کا یہ حکم کہ خبردار شاعری کے قریب بھی نہ پھٹک۔ اس میں کشمکش میں پڑ گیا کہ اپنی فطرت کا حکم مانوں اور کہ اپنے باپ کا خارجی فرمان قبول کروں۔

سوچنے لگا، میں اپنی ذات سے جدا کیوں کر ہو جاؤں۔ شعر کہتا ہوں تو باپ بگڑتے ہیں میں نہیں کہتا تو دل پر بگاڑ آتے ہیں۔ ادھر باپ کا حکم واجب الاذعان ہے ادھر فطرت کا ناقابل تسخیر میلان..... ادھر منشائے پدر ادھر تقاضائے قضاوقدر۔ کیا کروں کیا نہ کروں؟ شعر کہوں تو باپ ڈانٹ پلائیں اپنے دسترخوان پر کھانا نہ کھلائیں اور شعر نہ کہوں تو دماغ کے پرخچے اڑ جائیں۔

میری حالت آدم و ابلیس کی سی ہوگئی..... آدم کو ممانعت ہی گ ہتھی کہ خبردار شجر ممنوعہ کے قریب بھی نہ پھٹکنا لیکن مشیت الٰہی کا تقاضا تھا کہ آدم لوٹ جی بھر کے مزے لوت شجر ممنوع کے اور ابلیس کو حکم دیا گیا تھا کہ جھک جا سجدے میں آدم کے روبرو۔ لیکن مشیت نے آنکھ دکھادی تھی کہ اگر بے اگر سجدی کر دیا تو ناک کاٹ ڈالی جائے گی جڑ سے۔

سو جس طرح آدم و ابلیس ممانعت و حکم سے روگردانی کر کے مشیت کے سامنے جھک گئے اور مجال نہیں تھی کہ منہ جھکتے اسی طرح میں حکم پدر سے روگردانی کر کے فرمان قضاوقدر کے آستاں پر سربسجود ہوگیا۔

اس لیے میں شاعری ترک نہیں کر سکا۔ لیکن چوری چھپے شعر کہتا اور ادھر ادھر دیکھتا ہوا کسی گوشے میں جا کر ان کو لکھتا اور پرچے اپنے صندوقچے کے اندر مقفل کر دیتا۔ اور قاچاقیوں (سمگلروں) کی طرح اس صندوقچے کو اپنی ماں کے حوالے کر دیتا تھا کہ وہ اس کو چھپا کر رکھ دیں میری ماں کو میری اس حالت پر بڑا ترس آتا تھا مگر وہ اداس ہو جانے کے سوا اور کر ہی کیا سکتی تھیں۔

لیکن اس قدر مجرموں کی سی احتیاط کے باوجود میں اذرا اور باہر کئی بار عین موقع پر شعر کہتا پکڑا گیا۔ میرا جیب خرچ بند ہوا' باپ نے اپنے ساتھ کھانا کھلانا ترک کر دیا' اور اکثر تھپڑ بھی مارے اپنی ہر ذلت کے بعد میں نے بارہا اپنے کان پکڑ کر قسمیں کھائیں کہ اب کبھی شعر نہیں کہوں گا۔ اب کھائی سو کھائی اب کھاؤں تو رام دہائی۔ لیکن جیسے ہی میرے دل میں شاعری کی رگر گاہت ہونے لگتی تھی میری تمام قسمیں چور چور ہو کر رہ جایا کرتی تھیں اور حضرت وحشت کا یہ شعر مجھ پر صادق آ جایا کرتا تھا۔

مجال ترک محبت نہ ایک بار ہوئی
خیال ترک محبت تو بار بار آیا

شعر گوئی کی اجازت

ایک بار میں اپنی صندوقچے میں جیب سے پرزے نکال نکال کر رکھ رہا تھا کہ بوا گلزار نے دیکھ لیا اور وہ بھانپ گئیں..... میاں کو خبر کر دی۔ میاں آئے دن میری ماں سے کہا شبیر کا صندوقچہ کہاں ہے؟ میری ماں کا رنگ ہلدی کا سا ہو گیا۔ میاں کا خوف اس قدر تھا کہ وہ انکار نہیں کر سکیں اور میرا صندوقچہ ان کے سامنے رکھ دیا میاں نے مجھ سے کنجی مانگی کانپتے لرزتے ہاتھوں سے میں نے کنجی دے دی انہوں نے صندوقچہ کھولا میرے پرزے ایک ایک کر کے نکالے..... میں اپنے گاپ کو اس طرح دیکھنے لگا جیسے گائے اپنے بچھڑے کو چھری کے نیچے دیکھ کر کانپنے لگتی ہے۔ اور جب انہوں نے میرے تمام پرزے چر چر پھاڑ کر پھینک دیے تو میرے منہ سے ایک بڑی دردناک چیخ نکلی اور میں بے ہوش ہو گیا میری ماں دیوانہ وار مجھ سے چمٹ کر رونے لگیں۔ میاں کے حواس اڑ گئے دادی جان نے آ کر میرے باپ کو ڈانٹا کہ کیا بچے کو مار ڈالے گا۔

ڈاکٹر عبدالکریم کو میرے بے ہوش ہو جانے کی خبر کی گئی۔ انہوں نے میری نبض دیکھی اور کہا خان صاحب گھبرائیے نہیں میں دوا ساتھ لایا ہوں۔ انہوں نے میرا منہ چیر کر دوا پلائی رئیس کی انا نے منہ پر چھینٹے مارے اور دس پندرہ منٹ کے بعد مجھے ہوش

آ گیا..... مجھے ہوش آتے ہی میرے باپ نے مجھ کو سینے سے لگا کر ارشاد فرمایا کہ بیٹا میں نے شعر کہنے کی تجھ کو اجازت دے دی..... میں تجھے خود اصلاح دیا کروں گا۔ ادھر آ کر دھم بھر کے لیے اس پلنگڑی پر لیٹ جا میں لیٹ گیا تو میرا جی بہلانے کے لیے انہوں نے مجھ سے کہا بیٹا اس شعر کے معنی بیان کر۔

وہ جلد آئیں گے یا دیر میں شب وعدہ
میں گل بچھاؤں کہ کلیاں بچھاؤں بستر پر

اب شعر کی اجازت مل جانے کے بعد میری طبیعت بحال ہو چکی تھی۔ میں نے ذرا اس کے دوست نے وعدہ کیا ہے کہ آج میں آؤں گا۔ اب شاعر اس شش و پنج میں ہے کہ میں گل بچھاؤں کہ کلیاں۔ اگر وہ ٹھیک وقت پر آنے والا ہے تو میں کھلے ہوئے پھول اور اگر وہ دیر سے آنے والا ہے تو میں بے کھلی کلیاں بچھا دوں؟

میاں نے پوچھا ڈاکٹر صاحب معنی صحیح بیان کیے ہیں شبیر نے؟ ڈاکٹر صاحب نے کہا اس سے زیادہ صحیح معنی بیان ہی نہیں کیے جا سکتے۔ میاں نے کہا مجھے آپ کی رائے سے اتفاق ہے۔ لیکن طرز بیان میں اس نے دو ٹھوکریں کھائی ہیں۔ ڈاکٹر صاحب نے کہا۔ صاحب زادے پھر تشریح کر دیجیے۔ میں نے پھر ایک ایک لفظ دہرا دیا..... ڈاکٹر نے کہا۔ میرے نزدیک تو آپ کے صاحب زادے نے کہیں ٹھوکر نہیں کھائی ہے میاں نے ہنس کر کہا۔ آپ لاکھ سخن سنج اور حالی کے ہم وطن سہی پھر بھی جائے استاد خالیست سنیے اس کی پہلی غلطی تو یہ ہے کہ اس نے کھلے ہوئے پھول کہا ہے کلی جب چٹک کر کھل جاتی ہے تو اس کو پھول کہا جاتا ہے۔ کھلاوٹ تو پھول کی عین ذات ہے اس لیے کھلے ہوئے پھول کہنا حشو و زوائد میں داخل ہے اور دوسری غلطی یہ ہے کہ اس نے کلی کے متعلق بے کھلی کلیاں کہا ہے حالانکہ کلی کو تو اسی لیے کلی کہتے ہیں کہ وہ ہنوز چٹک کر کھلی نہیں ہے اور بے کھلا پن اس کی عین ذات ہے۔ اس لیے بے کھلی کلیاں کہنا صرف اسراف الفاظ ہی نہیں ایک مہمل سی بات بھی ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے

کہا بے شک آپ کا خیال درست ہے۔ پھول اور کلی کے ساتھ ان توصیفی سابقوں کی کوئی ضرورت نہیں۔ اس کے بعد میاں نے ارشاد فرمایا اچھا ایک اور شعر کے معنی بھی بتا دو تو میں تمہاری شعر فہمی کو مان جاؤں گا۔

آ رہے ہیں لاش کے وہ ساتھ ساتھ
اب ہماری قبر کتنی دور ہے

یہ شعر سن کر میں الجھن میں پڑ گیا۔ دونوں مصرعوں میں کوئی ربط ہی نظر نہیں آیا اور سوچنے لگا۔ اور دس پندرہ منٹ سوچنے کے بعد میں خوشی سے اچھل گیا بستر سے اٹھ بیٹھا میں نے کہا شاعر کے جنازے کے جلوس میں اس کا دوست شریک ہے۔ شاعر کو یہ خیال ستانے لگتا ہے کہ اس کے دوست کو پیدل چلتے ہوئے تکلیف ہو رہی ہوگی اس لیے وہ سا غور کر کے عرض کیا میاں یہ شعر تو بہت آسان ہے..... اکتا کر پوچھ رہا ہے کہ اب ہمارے قبر کس قدر فاصلے پر رہ گئی ہے میاں نے جھک کر مجھے سینے سے لگا لیا۔ ڈاکٹر صاحب نے بھی مجھ کو بہت داد دی اور اس امر کا اعتراف کر لیا کہ ان کو یہ شعر مہمل معلوم ہو رہا تھا میاں نے مجھ سے کہا تمہیں اس شعر میں فن کے نقطہ نظر سے کوئی عیب تو نظر نہیں آ رہا ہے۔ میں بے چارہ فن سے واقف ہی کہاں تھا۔ میں نے کہا کوئی عیب نہیں ہے۔ میاں نے فرمایا اس کے پہلے مصرع میں تعقید ہے اور پھر مثالیں دے کر سمجھایا کہ تعقید کیا چیز ہوتی ہے۔

ڈاکٹر صاحب نے کہا خان صاحب آپ صاحب زادے کو شاعری سے باز تو نہیں رکھ سکتے۔ لیکن یہ بات ضرور سمجھا دیجیے کہ تکمیل تعلیم سے بیش تر اس مشغلے پر زیادہ وقت صرف نہ کیا جائے۔

میاں نے فرمایا ڈاکٹر صاحب میں تعلیم سے بھی آگے کی بات سوچ رہا ہوں..... یعنی شاعری وہ چیز ہے جو شارع کو اس امر کی اجازت ہی نہیں دیتی کہ وہ شعر کہنے اور شاعرانہ زندگی بسر کرنے کے علاوہ دنیا کا کوئی اور کام بھی کر سکے۔ اسی کے ساتھ ساتھ یہ وہ بد بلا ہے کہ شاعر کے دل میں دولت کو اس قدر حقیر کر دیتی ہے کہ وہ اس کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھتا جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ مفلسی کا صید زبوں ہو کر رہ جاتا

ہے..... ڈاکٹر صاحب جی باوا[1] کے پاس جس قدر جائے داد اور دولت تھی وہ میرے پاس نہیں ہے۔ اور میرے پاس جو جائے داد اور دولت ہے وہ میرے بعد اس کے سات بھائی بہنوں میں تقسیم ہو جائے گی۔ اور اس کے پاس جائے داد کا جو حصہ آئے گا وہ اس قدر بڑا نہیں ہوگا کہ شاعر کی بے نیازی کو تا دیر برداشت کر سکے۔ اتنا کہہ کر ان کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے انہوں نے میری طرف نگاہ اٹھا کر کے دعا کے لیے ہاتھ بلند فرما دیے کہ اے اللہ میرے شبیر کو تباہی[2] سے بچانا اور اس پر ایسی کرم کی نگاہ رکھنا کہ معاش کی خاطر اس کو دوسروں کا منہ نہ دیکھنا پڑے۔

---

[1] میرے باپ کے دادا یعنی حضرت گویا کو جی باوا کہتے تھے..... [2] میاں آپ کی دعا قبول نہیں ہوئی آپ نے دعا مانگی تھی اس بارگاہ میں جہاں عمر خضر کی درازی کے علاوہ کوئی دعا قبول ہی نہیں فرمائی جاتی..... آپکو خبر نہیں کہ آپ کی آنکھوں کا تارا شبیر ایک کثیر العیال وفقید المعاش بوڑھے کی صورت میں دادی غربت میں ٹھوکریں کھا رہا ہے وہ پاکستان آ کر ایک معمولی سی تنخواہ پر زندگی بسر کر رہا ہے۔ لیکن اس جرم پر ملازمت اور دیگر وسائل معاش سے محروم کر دیا گیا ہے کہ وہ (۱) عزت نفس کے مرض میں مبتلا ہے (۲) کسی کے اقتدار کے سامنے سر نہیں جھکاتا (۳) وہ اپنے ضمیر اور قلم کو فروخت نہیں کرتا (۴) اسے اپنے آبائی وطن سے نفرت نہیں ہے (۵) اور اس کا سب سے بڑا قصور جس سے بغاوت کی بو آتی ہے یہ ہے کہ وہ وقط پاکستانیوں اور ہندوستانیوں کو ہی نہیں بلکہ روئے زمین کے تمام باشندوں کو وحدت کی زنجیر میں جکڑ کر ایک مستحکم اکائی اور ایک آفاقی ریاست بنانے کے شیطانی خواب دیکھتا رہتا ہے۔

میاں کاش میں آپ کی زندگی ہی میں مر جاتا اور آپ میرا جنازہ اٹھاتے اور مجھ کو یہ دن نہ دیکھنا پڑتا۔ مگر کیا کیا جائے قضاء قدر کی ستم ظریفی کو

طغیان ناز ہیں کہ جگر گوشہ خلیل
آرد بز بر تیغ و شیہ ش نہ می کند

پہلا مشاعرہ

یہ غالباً سنہ ۱۹۱۰ء یا سنہ ۱۹۱۱ء کی بات ہے کہ میں اپنے باپ کی معیت میں، حضرت مولانا رضا فرنگی کے محلی کے مشاعرے میں پہلی بار شریک ہوا اور دنگ ہو کر رہ گیا۔

آیئے آپ کو اس مشاعرے میں لے چلوں تا کہ آپ خود دیکھ لیں کہ شفاف چاندنی بچھی ہوئی ہے چاندنی پر قالین ہیں گاؤ تکیے دیواروں سے لگے ہوئے..... ادھر ادھر صاف ستھرے اگالدان نیچوں میں ہار لپٹے حقے شال باف سے منڈھی ہوئی چھوتی چھوٹی کوری ہانڈیاں ہانڈیوں میں چاندی کے ورق کی معطر گلوریاں اور الائچی دانے تنبا کو اور قوام کی ڈبیاں رکھی ہوئی ہیں شعراء زیادہ تر انگرکھے اور کم تر شیروانیاں پہنے اپنے اپنے مراتب کے لحاظ سے دوزانو بیٹھے ہوئے ہیں سب کے سروں پر ٹوپیاں ہیں سامعین میں سے کوئی بھی ننگے سر نہیں ہے۔ آپس میں آہستہ آہستہ باتیں ہو رہی ہیں گلوریاں کھائی جا رہی ہیں اور حقے پیے جا رہے ہیں..... اور جو شاعر مشاعرے کے فرش پر قدم رکھتا ہے۔ وہ حاضرین کو جھک جھک کر غیر ملفوظ سلام کر رہا ہے حاضرین اس کے حسب مرتبہ نیم قد یا سرو قد جوابی سلاموں سے اس کا خیر مقدم کر رہے ہیں..... لیجیے اب میر مشاعرہ کے سامنے شمع آ گئی ہے اور مولانا رضا کی غزل سے حسب دستور مشاعرے کا آغاز ہو رہا ہے۔ اور داد سے چھت گونجنے لگی ہے کس کی یہ مجال ہے کہ اثنائے غزل خوانی میں کوئی مصرع نہ اٹھائے حقہ پی لے پان کھا لے، آپس میں سرگوشی کرنے لگے یا کوئی ادھر سے اٹھ کر ادھر بیٹھ جانے کی جسارت کر سکے۔

میر مشاعرہ کے بعد اب شمع گردش کر رہی ہے۔ نوشق نوجوانوں کی صفوں میں اور کمی بیشی کے ساتھ سب کو داد مل رہی ہے۔ اور معمولی اشعار کے سروں پر بھی ماشاءاللہ کے سہرے باندھے جا رہے ہیں۔ لیجیے نومشقوں میں میری باری بھی آ گئی۔ ارے غضب ہو گیا شمع سامنے رکھی ہوئی ہے رعب محفل سے میں کانپ رہا ہوں شعرا کی صفوں سے آوازیں آ رہی ہیں بسم اللہ صاحب زادے بسم اللہ لیکن صاحب زادے کا

دم نکلا ہوا ہے کیا مجال کہ منہ سے ایک حرف بھی نکل سکے..... اب میرے باپ مجھ سے فرما رہے ہیں پڑھتے کیوں نہیں پٹھان کا بیٹا تو بارہ برس کی عمر سے ہی رن میں تلوار چلانے لگتا ہے..... اور ایک تم ہو کہ تم سے ایک غزل بھی نہیں پڑھی جا رہی۔ اب میرزا محمد ہادی صاحب رسوا اپنی جگہ سے اٹھ کر میرے پہلو میں آ گئے اور میری پیٹھ ٹھونک کر فرما رہے ہیں۔ صاحب زادے آپ تو شاعر شاعر کے بیٹے شاعر کے پوتے اور شاعر کے پڑپوتے ہیں۔ پڑھیے اور گرج کر پڑھیے..... اب بڑی ہمت کر کے میں مطلع پڑھ رہا ہوں مطلع پر داد مل رہی ہے اور داد کے نشے میں شعر پڑھ رہا ہوں۔

اے نسیم صبح کے جھونکو یہ تم نے کیا کیا
میرے مست خواب کی زلفیں پریشاں ہو گئیں

اس شعر پر مطلع سے زیادہ داد پا رہا ہوں..... اور ولولے کے ساتھ دوسرا شعر سنا رہا ہوں۔

میری آنکھیں جانتی ہیں کرب افراط خوشی
خندہ زن دیکھا کسی کو اور گریاں ہو گئیں

اب داد کا غلغلہ زیادہ بلند ہو رہا ہے۔ اور سبحان اللہ ماشاء اللہ سے مشاعرہ گونج رہا ہے۔ اور میرزا محمد ہادی رسوا حضرت صفی سے کہہ رہے ہیں مولانا دیکھیے آپ نے اس شعر کے تیور یہ عمر اور اتنی گہری بات..... اور اب میں آخری شعر پڑھ رہا ہوں۔

ہائے میری مشکلو ' تم نے بھی کیا دھوکا دیا
عین دل چسپی کا عالم تھا کہ آساں ہو گئیں

دیکھیے چھتیں اڑ رہی ہیں اور دھویں پار ہو رہے ہیں اس شعر کی داد سے..... اور فرما رہے ہیں اللہ نظر بد سے بچائے۔

مشاعرے سے داد کے رطل ہائے گراں پی کر جھومتا جھامتا گھر آیا خوشی کے مارے دیر تک نیند نہیں آئی..... اور سو گیا تو خواب میں رات کو یہ دیکھتا رہا کہ پریاں

بھینچ بھینچ کر مجھے گلے لگا رہی ہیں۔

غسل مجھ پر واجب ہو گیا..... صبح اٹھتے ہی حمام کیا اور ناشتے سے فارغ ہو کر جب اپنے باپ کی خواب گاہ کے برآمدے سے ہو کر گزرنے لگا تو باپ کی آواز آئی ادھر آیئے جناب اِدم نکل گیا اس آواز غضب سے..... اور جب لرزتا ہوا..... ان کی خواب گاہ میں گیا تو انہوں نے بڑی بھاری آواز میں ارشاد فرمایا دیکھیے صاحب! یہ میری دلی تمنا ہے کہ آپ اس دنیا میں پھلیں پھولیں عمر مسیح و خضر پائیں آپ کی دولت میری دولت سے بڑھ جائے آپ کا مرتبہ مجھ سے ہزار گنا فزوں ہو جائے آپ زندگی کے ہر شعبے میں سبقت لے جائیں مجھ سے..... مگر کان کھول کر سن لیجے کہ میں اس کو برداشت نہیں کر سکتا کہ خاں صاحب آپ مجھ سے شاعری ۲ میں بھی بڑھ جائیں۔ رات کے مشاعرے میں آپ کو مجھ سے زیادہ داد ملی اب آپ کا میرے ساتھ مشاعرے جانا بند..... قطعی بند..... غضب خدا کا باپ سے زیادہ بیٹے کو داد ملے میں یہ الٹی گنگا بہنے کا موقع نہیں دینے کا..... سنا خاں صاحب آپ نے؟؟

میرے باپ میر کو غالب پر ترجیح دیتے ہلکی پھلکی زبان میں شعر کہتے اور داغ کے اس شعر پر عامل تھے۔

کہتے ہیں اسے زبان اردو
جس میں نہ ہو رنگ فارسی کا

ایک روز میں نے ان کی خدمت میں اپنی ایک غزل اصلاح کے واسطے پیش کی جس میں جا بجا فارسی کی ترکیبیں تھیں۔ اور ایک مصرع تھا۔

ہماری زندگی یعنی وفائے رازداں تک ہے

اِ غصے کے وقت یہی ان کا لہجہ ہو جایا کرتا تھا ۲ غالباً سچ کہا گیا ہے کہ Art is selfish

---

انہوں نے تیوریوں پر ڈال کر ارشاد فرمایا سبحان اللہ یعنی وفائے رازداں تک اس

یعنی کی دادنہیں دی جاسکتی..... مجھے اس بات کا شدید خوف ہے کہ آٹھ دن میں..... شمار سبحہ مرغوب بت مشکل پسند آیا تک آجاؤ گے۔ نا صاحب میں تمہیں اصلاح نہیں دوں گا۔ اور تمہیں عزیز صاحب کے سپرد کردوں گا۔ وہ بھی یعنی وفائے رازداں اور شمار سبحہ کے برتن والوں میں سے ہیں دونوں میں خوب نباہ ہو جائے گا..... یہ فرما کر انہوں نے عزیز صاحب کو بلا کر مجھے ان کا شاگرد بنا دیا..... اور یہ سلسلہ تلمذ پانچ چھ برس کے اندر ہی منقطع ہو گیا۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ حضرت عزیز بہت ہی اچھے استاد اور بہت ذی علم بزرگ تھے..... اور جہاں تک کہ زبان کی صحت اور لہجے کی نجابت کا تعلق ہے ان کی ذات سے مجھ کو نہایت کثیر فائدہ حاصل ہوا لیکن جب مجھ کو واضح طور پر محسوس ہونے لگا کہ میری فکر کا جادہ ان سے مختلف ہے اور ہم دونوں کی تخیل ایک ہی سمت پر سفر نہیں کر رہی ہے اور ان کی اصلاحوں سے اشعار کا لفظی رنگ و روغن تو ضرور ابھر آتا ہے لیکن معنویت دھندلی ہو کر رہ جاتی ہے۔ تو میں نے اصلاح لینا ترک کر دیا۔

لیکن اسے سے میرے اور ان کے تعلقات میں کسی قسم کی تلخی راہ نہیں پا سکی۔ میں ہمیشہ ان کے روبرو سر جھکاتا اور وہ ہمیشہ میرے سر پر ہات پھیرتے رہے۔

ایک دن جب کہ میں بڑے دن کی تعطیل میں گھر آیا ہوا تھا۔ میری ماں نے برے درد بھرے لہجے میں مجھ سے ارشاد فرمایا ننھے تمہارے باپ میرٹھ والی سے نکاح کرنا چاہتے ہیں میں سوتیا ڈاہ سہ نہیں سکوں گی۔ مجھے میرے باپ کے گھر پہنچا دو۔ ورنہ میں سنکھیا کھا کر سو جاؤں گی۔ ماں کی یہ بات سن کر میرا دل کانپ گیا۔ میں نے عرض کیا اماں آپ گھبرائیں نہیں میں آپ کو چھ سات دن کے اندر ہی نانا جان کے وہاں پہنچا دوں گا

اس کے بعد میں نے بڑے بھائی شفیع احمد خاں اور ابرار حسن سے مشورہ کیا اور ہات بٹانے کو کہا..... وہ دونوں آمادہ ہو گئے..... لیکن سوال یہ تھا کہ اتنے بڑے اور وہ

بھی ریزرو کمپارٹمنٹ میں سفر کرنے کے لیے روپیہ کہاں سے آئے گا۔

ہم دو روز تک یہی سوچتے رہے کہ روپیہ کیونکر فراہم کیا جائے لیکن کوئی صورت سمجھ میں نہیں آئی۔ تیسرے دن ابرار آئے اور کہنے لگے کیا کہیں گے آپ بھی روپے کی ایسی تدبیر سوچ کر آیا ہوں کہ پٹ ہ نہیں سکتی۔ آپ جانتے ہیں کہ بشیر مانموں (میرے باپ) اور محمد علی چچا کے درمیان آج کل ان بن ہے آپ اسی وقت ان کے پاس چلے جائیں اور ساری داستان سنائیں۔ اور مجھ کو یقین ہے کہ بشیر مانموں کی دل آزاری کے واسطے وہ کھٹ دے ڈیڑھ دو ہزار روپے دے دیں گے۔

مجھے ابرار کی یہ تدبیر پسند آئی اور جی کڑا کر کے محمد علی چچا کی طرف روانہ ہو گیا اور جب ان کی کوٹھی کے لکڑی کے زینے پر پہنچا تو یہ دیکھا کہ وہ ایک جڑواں صوفے پر بیٹھے حقہ پی رہے ہیں۔ اور ان کے پہلو میں ایک بلا کی نوخیز طوائف بیٹھی گنگنا رہی ہے۔ اور سامن صوفے پر چچا کے مصاحب سکندر میرزا صاحب اس کے گلے کی داد دینے میں سرگرم ہیں۔

یہ سوچ کر کہ میں بے موقع آ گیا ہوں میرا دل چاہا کہ الٹے پاؤں چلا جاؤں لیکن اس نوخیز طوائف کی صورت اور اس کی آواز نے پاؤں میں زنجیر ڈال دی۔ اور میں نظر جمائے اور طاقت سماعت کو حاضر کیے اس کی صورت دیکھنے اور اس کا ترنم سننے لگا کہ اتنے میں چچا نے حقے کا ایک لمبا سا کش لے کر دروازے کی جانب نظر اٹھائی تو دیکھا میں کھڑا ہوا ہوں اور حیرت و شرم کے ساتھ ان کے منہ سے نکل گیا..... ارے غلام شبیر!! میں نے سلام کیا۔

وہ طوائف اچھل کر کھڑی ہو گئی اور میرے دل پر شہاب ثاقب کی سی لکیر ڈالتی ہوئی دوسرے کمرے میں چلی گئی اور سکندر مرزا صاحب بھی اس کے پیچھے پیچھے کمرے میں چلے گئے۔

چچا سے میں نے تمام ماجرا بیان کر کے دو ہزار طلب کیے۔ انہوں نے زبان سے

ایک حرف بھی نہیں کہا اٹھے اور الماری سے دو ہزار کے نوٹ نکال کر میرے حوالے کر دیے میں نے چچا کو جھک کر سلام کیا۔ اور اس طوائف کو پھر ایک نظر دیکھنے کی تمنا لیے ہوئے گھر آ گیا۔

---

[1] میرا پہلا نام غلام شبیر تھا پھر شبیر احمد ہو گیا اور بعد میں میں نے اس کو شبیر حسن سے تبدیل کر دیا لیکن چچا مجھ کو ہمیشہ میرے پہلے نام سے ہی پکارتے رہے۔

روپیہ آ گیا تو ابرار کو لکھنو روانہ کر کے ایک سیکنڈ کلاس کمپارٹمنٹ کو ریزرو کرا کے ملیح آباد منگا لیا۔ اور شام ہوتے ہی مکان کے عقبی دروازے سے نکل کر ہم سب اپنے کمپارٹمنٹ میں آ گئے۔ اور تمام کھڑکیاں اندر سے بند کر کے روشنی گل کر دی۔

تھوڑی دیر میں لکھنو جانے والی گاڑی آ گئی۔ اور ہمارا درجہ بریک کے پیچھے لگا دیا گیا۔

ابھی گاڑی چھوٹنے میں دو تین منٹ باقی تھے کہ پلیٹ فارم پر میرے باپ کی آواز گونج اٹھی ''اسٹیشن ماسٹر صاحب کیا اس گاڑی میں لڑکے سفر کر رہے ہیں؟!''

اسٹیشن ماسٹر کو رشوت دے کر ہم اپنا چکے تھ۔ اس نے کہا ''خاں صاحب آپ کے صاحب زادوں میں سے اس گاڑی میں کوئی سفر نہیں کر رہا ہے''۔

میرے باپ کو اطمینان نہیں ہوا۔ اسٹیشن ماسٹر سے فرمایا دو چار منٹ گاڑی رکوا لیجیے تا کہ میرے آدمی ایک ایک درجے کو دیکھ لیں ممکن ہے آپ کی نظر نہ پڑی ہو'' گاری رکوا دی گئی ..... اور نوکر چاکر اور اقربا نے پوری گاڑی کھنگال ڈالی ہم نہیں ملے ہم تو اندھیرے درجے میں بریک کے پیچھے دبکے ہوئے تھے۔ کسی ڈھونڈنے والے اور خود میاں نے بھی ہمارے ڈبے کی طرف اس خیال سے نظر بھی نہیں اٹھائی کہ وہ یہ سمجھے کہ وہ ڈبہ خالی جا رہا ہے۔

گاڑی تقریباً پانچ چھ منٹ تک ملیح آباد سٹیشن پر کھڑی رہی اور ان چند لمحوں کے اندر ہزاروں صدیوں کا مجموعی خوف ہمارا احاطہ کیے رہا..... ہم سب اتنی دیر تک سولی پر

لٹکے رہے میاں کی آواز بجلی کی طرح ہمارے دلوں پر گر رہی تھی۔ اور میں اندر سے چٹخنی لگی کھڑکیوں کی طرف دیکھ رہا تھا کہ اب ٹوٹیں اور اب ٹوٹیں۔ مجھ کو اپنے انفاس کی آمد و شد سے ڈر لگ رہا ہے۔ پسینے پر پسینے آ رہے تھے تمام جسم برابر بھیگتا چلا جا رہا تھا۔ اور دل یوں کھٹ کھٹ کھٹ کھٹ دھڑک رہا تھا کہ ہر بار یہ گمان ہوتا تھا کہ سینہ توڑ کر باہر نکل آئے گا۔

خدا جانے کس نے مخبری کر دی تھی یہ بات آج تک معلوم نہیں ہو سکی۔

خدا کی قسم اس وقت اگر ڈائن موت جبڑا کھول کر سامنے آ جاتی کہ میرے جبڑوں میں آؤ گے یا باپ کے قبضے میں جاؤ گے۔ تو میں فوراً اس کے جبڑوں میں گھس جاتا کہ اتنے میں گاڑی نے سیٹی دی سیٹی کی آواز سے میں دہل گیا پہیوں میں چوں چوں شروع ہوئی گاڑی رینگنے لگی۔ اوپر کی سانس نیچے آئی کھڑے رونگٹے بیٹھنے لگے۔ سانس کا نظام درست ہونے لگا اور جب کاکوری کے پل پر گاڑی پہنچ گئی تو میں نے جیسے ہی درجے کی روشنی کھولی تو یہ دیکھا کہ میری ماں سجدے میں ہیں۔ عباسی خانم مغلانی فرش پر اوندھی پڑی ہوئی آہستہ آہستہ نا دعلی پڑھ رہی ہیں۔ اور ابرار اور بڑے بھائی سیٹوں کے نیچے سے برآمد ہو رہے ہیں۔ یہ سماں دیکھ کر میری ہنسی نکل گئی ابرار نے قہقہہ لگایا اور بھائی صاحب کے تیوروں پر بل پڑ گئے..... اماں میری بلائیں لینے لگیں..... لیکن عباسی خانم بدستور اوندھی پڑی رہیں..... یہاں تک کہ چارباغ آ گیا۔

ٹونڈلہ جنکشن پر گاڑی رکی تو ایک لمبے تڑنگے بڑی بڑی گچھے دار مونچھوں کے تھانہ دار صاحب آٹھ پولیس والوں کے ساتھ آئے اور بڑے تحکمانہ انداز میں پوچھا آپ کا نام کیا ہے؟..... میں نے بگڑ کر کہا رستم دوراں شبیر حسن خاں'' سر سے لے کر پاؤں تک اس نے مجھ کو دیکھا اور کہا'' میں آپ سب کو یہاں اتار لینے کے واسطے آیا ہوں'' میں نے بھنا کر جواب دیا'' کس کی مجال ہے جو ہم کو اتار لے؟'' اس نے حکم دیا سپاہیوں کو

کہ ان کا سامان اتار لو۔ میں میرے بھائی اور ابرار ڈنڈے لے لے کر پلیٹ فارم پر کود پڑے۔ اور میں نے پولیس والوں کو ڈانٹ کر کہا۔ خبردار ہمارے درجے میں قدم نہ رکھنا۔ نہ اتنے میں ہمارے درجے کے سامنے لوگوں کے ٹھٹ لگ گئے تھانہ دار نے انگلی بلند کر کے کہا میں اسباب اتروائے بغیر نہیں مانوں گا۔ میں نے ڈنڈا زمین پر مار کر کہا اگر ہمت ہے تو سامان اتار کر دیکھ لو تھانہ دار نہیں کہا آپ نہیں مانیں گے میں نے کہا جب تک زندہ ہوں میں نہیں مانوں گا۔ لوگوں کا ہجوم اور ہماری آوازوں کا شور سن کر سٹیشن کے انگریز سپرنٹنڈنٹ کو ہمارے درجے کی طرف کھینچ لایا آتے ہی اس نے تھانہ دار سے انگریزی میں پوچھا ''معاملہ کیا ہے.....؟'' تھانہ دار نے بڑی نرم آواز میں جواب دیا کہ ''میں ان لڑکوں کے باپ اور نانا کا ملنے والا ہوں ان کے باپ نے مجھے تار دیا ہیکہ وہ دوسری گاڑی سے یہاں آ رہے ہیں اُس ان کے خاندان کو یہاں اتار لوں'' ریلوے سپرنٹنڈنٹ نے پوچھا ''گرفتاری کا وارنٹ ہے آپ کے پاس؟'' تھانہ دار نے جھینپ کر اور ڈر کر کہا کہ یہ باپ اور بیٹوں کا پرائیویٹ معاملہ ہے اس میں وارنٹ کی کیا ضرورت ہے۔ سپرنٹنڈنٹ کے بگڑ کر کہا آپ قانون کی گرفت میں آ چکے ہیں۔ پولیس افسر ہو کر آپ ایسی خلاف قانون باتیں کر رہے ہیں اور وہ بھی ریلوے پلیٹ فارم کے سے پبلک مقام پر..... آیئے میرے دفتر میں۔

اس کے بعد ہمارا درجہ آگرے جانے والی گاڑی سے جوڑ دیا گیا۔ اور ہم آگے اور آگرے سے دھول پور پہنچ گئے۔ اور نانا جان سے تمام ماجرا بیان کر دیا۔ ہماری داستان سن کر میری سوتیلی نانی ھنے نانا جان سے کہا تم بشیر احمد کے غصے کو نہیں جانتے۔ وہ بڑا غضب ناک پٹھان ہے۔ اسی وقت مہاراجہ کے پاس جاؤ اور ان سے پورا حال کہہ کے حویلی کے چاروں طرف پولیس کا پہرہ بٹھا دو۔ نانا جان اسی وقت مہاراجہ کے پاس گئے اور حویلی کے گرد پولیس کا پہرا بٹھا دیا گیا۔

دوسری گاڑی سے میرے باپ دھول پور آ گئے لیکن انتہائی دانش مندی کی بناء پر

ڈاک بنگلے میں ٹھہر گئے اور اپنے بہنوئی نواب احمد خان کو جو میرے بڑے بھائی کے خسر تھے نانا جان کی حویلی سن گن لینے کے لیے روانہ کر دیا۔

نواب پھپا نے آ کر جب پہرے دار چوکی کا حال بتایا تو میرے باپ نے نواب پھپا سے کہا میں آپ کے ساتھ گاڑی میں چلتا ہوں گاڑی کو باہر روک دوں گا آپ نواب صاحب کے پاس چلے جائیں میرا سلام کہیں اگر وہ مجھے بلانے پر آمادہ ہو جائیں تو پھر کوئی دشواری نہیں ہوگی۔ میرے بلانے سے ابا کریں تو آپ حویلی سے نکل کر ڈیوڑھی کے چبوترے پر کھڑے ہو جائیں اور کسی نوکر سے کہیں کہ نواب صاحب نے اپنے داماد کو بلایا ہے وہ پھاٹک پر گاڑی میں بیٹھے ہوئے ہیں انہیں بلا لاؤ..... یہ جادو چل گیا میرے باپ نانا کی حویلی میں پہرے داروں کا سلام لیتے ہوئے داخل ہو گئے۔

نانا جان سنگ مرمر کی چوکی پر بیٹھے حقہ پی رہے تھے۔ کہ کھلے ہوئے زینے پر میرے باپ کی پیشانی نمودار ہوئی۔ نانی نے چیخ مار کر کہا ارے بشیر احمد نانا نانی کی چیخ سن کر گھبرا گئے۔ بات لگا تو حقا گر گیا اور چلم ٹوٹ گئی۔ ہم سب لوگ گدا گدا کر بھاگ کھڑے ہوئے اور سامنے کے سنگین کمرے میں داخل ہو کر اندر سے کنڈیاں لگا لیں۔ حواس غائب ہو گئے۔ اور عباسی خانم کے پاس سے کھراہند کے بھبکے آنے لگے۔

لیکن یہ دیکھ کر کہ میاں نے نانا جان کو جھک کر سلام کیا۔ اور ان کا ہات اپنے سینے سے لگا کر روتے ہوئے کہا کہ بابا آپ کے سر کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ میں نے عقد ثانی کا کبھی خواب بھی نہیں دیکھا۔ نہ جانے کس نے ان کے کان بھر دیے ہیں کہ یہ لوگ مجھ سے بگڑ کر یہاں آ گئے۔ میں اپنے والد مرحوم کی روح کی قسم کھا کر وعدہ کرتا ہوں کہ زندگی بھر عقد ثانی نہیں کروں گا۔ اور سچے دل سے یہ کہتا ہوں کہ آپ کی صاحب زادی اور اپنے بچوں سے مجھے یہ شکایت مطلق نہیں ہے کہ وہ سب یہاں کیوں چلے آئے ہیں۔ اگر ایسی افواہ سنکر وہ اپنی ماں کی مدد نہ کرتے اور ان کو آپ کے قدموں تک نہ

پہنچا دیتے تو میں ان کی شرافت سے مایوس ہو جاتا۔ اور یہ سمجھ لیتا کہ جو بچے اپنی ماں کے ساتھ وفا نہیں وہ میرے کیا ہو سکتے ہیں۔

یہ سن کر نانا کا چہرہ بحال ہو گیا۔ میری ماں کو آواز دی کہ اپنے بچوں کو لے کر یہاں آ جا۔ ہم آئے تو میاں نے ہم سب کو گلے سے لگا لیا۔ اور فرمایا میرے گھر کے ڈوبے آفتاب یہاں مل گئے خدا کی قسم میں تم سے ناخوش نہیں ہوں۔ اور تم نے اپنی ماں کو ریزرو گاڑی میں لا کر میری لاج رکھ لی ہے..... اگر خدانہ خواستہ تم عام درجے میں لاتے تو میں زندگی بھر کسی کو منہ نہ دکھا سکتا۔

جب ہم سب ملیح آباد آ گئے تو میرے باپ نے میری ماں سے کہا کہ آپ کو کچھ خبر بھی ہے کہ آپ کے یہ بڑے صاحب زادے یہاں کس شرط پر تشریف لائے ہیں میری ماں نے پوچھا کس شرط پر میرے باپ نے فرمایا اس شرط پر کہ میں امانی گنج کا پورا باغ ان کے نام لکھ دوں۔ میری ماں نے چھاتی پیٹ کر کہا ہے شفیع احمد شریف بیٹے باپ سے یہی برتاؤ کرتے ہیں؟؟

میرے باپ قول کے دھنی تھے دوسرے ہی روز امانی گنج کا باغ بھائی صاحب کے نام لکھ دیا' اور فرمایا شبیر کل اس کے جواب میں بڑا باغ' جو اس سے آٹھ گنا بڑا ہے تیرے نام لکھ دوں گا'' میں نے کہا ''میاں آپ مجھے خوش کرنا چاہتے ہیں تو میرے نام نہیں اماں کے نام لکھ دیجیے۔'' میاں نے میری پیٹھ ٹھونک کر کہا ''شاباش شاباش تو بڑے دل کا آدمی ہے۔ اور دوسرے دن بڑا باغ میری ماں کے نام لکھ دیا[1]۔

---

[1] میاں کے انتقال کے بعد جب میری ماں بڑا باغ میرے نام منتقل کرنے لگیں تو میں نے کہا اماں رئیس احمد کو بھی شریک کر لیجیے میری ماں نے ہم دونوں کے نام باغ لکھ دیا۔ اور ہم کو ہماری نیت کا پھل مل گیا۔

☆☆☆

علی گڑھ میں

ایم اے او[2] کالج میں میرا داخلہ

میرا غالباً سنہ ۱۹۱۲ء میں وہاں کے سکول میں داخلہ ہوا تھا' اور مجھے ممتاز ہاؤس کے نمبر ۴۲ کمرے میں جگہ دی گئی تھی اس کمرے میں کاکوری کے دو سگے بھائی ثابت علی اور ثامن علی پہلے سے موجود تھے۔ اور میرے قیام سے تثلیث پیدا ہوگئی تھی۔ اور ان دونوں بھائیوں کے چلے جانے کے بعد رام پور کے دو سگے بھائی برکت اللہ خاں اور محسن اللہ خان میرے کمرے میں آ گئے..... ہمارا وہ دو سگے بھائیوں اور ایک دوسرے خاندان کے طالب علم والا کمرہ بورڈنگ ہاؤس کے سب پراکٹر مظہر علیم صاحب فرید آبادی کے کمرے سے ملا ہوا تھا۔ ہر چند مظہر علیم صاحب مہربان استاد تھے مگر ایک ناگفتنی علت کی بنا پر ہمارے مابین رقابت پیدا ہوگئی تھی۔ اور وہ محسن اللہ خاں عبدالجلیل خان اور مجھ سے ناخوش رہا کرتے تھے۔

میرے زمانے میں قدیم وضع داری کے مکمل علم بردار نواب وقار الملک سیکرٹری سید احمد کی آنکھیں دیکھے ہوئے میر ولایت حسین صاحب پراکٹر جن کا تمام کالج احترام کرتا تھا اور جن کی شفقت کا سکہ بیٹھا ہوا تھا سب کے دلوں پر

---

[2] یعنی محمدن اینگلو اورینٹل کالج یہ مسلمانوں کو غیر اسلامی خطاب دینے والا غلامانہ انگریزی نام اس کالج کے بانی ان سید احمد نے (جن کے کاسہ سر میں سر کے خطاب کا ہندوستان شکار عقاب اپنا آشیاں بنا چکا تھا) اپنی ذہنیت کے اس تیشہ زبوں سے تراشا تھا۔ جس سے حب وطن کے پہاڑ کاٹے جاتے تھے اور عشرت کدہ پرویز کی جانب جوئے شیر لائی جاتی ہے۔ اور یہ خدا بخشے انہیں خویش دشمن و بیگانہ دوست بزرگ کا موروثی اثر یہ کہ جو آج تک ہمارا تعاقب کر رہا ہے اور جس کے باعث ہم آزاد ہو جانے کے باوجود آج بھی اپنے سرکاری محکموں تہذیبی اداروں اور اپنے شہر کے محلوں کو پی آئی ڈی سی رائٹرز گلڈ اور پی ای سی ایچ سوسائٹی کے انگریزی نام عطا فرما کر

فخر محسوس کر رہے ہیں اور یہاں تک کہ اپنے ناموں کے سروں پر ٹی پی عبداللہ..... اے ڈی اظہر..... وائی الیف مجیب..... اور ڈبلو ڈبلو رحمٰن کے گندے تو کرے لادلا دکر اس آرزو میں مرے جا رہے ہیں کہ کوئی اللہ کا بندہ ہم غلمٹوں کو فرنگی یا کم سے کم کرسٹان ہی سمجھ لے اور ہماری کالی نیٹویت پر انگلستان کا گورا پن چھا جائے۔ دراصل علی گڑھ تحریک اٹھائی ہی گئی تھی اس غرض سے کہ (۱) مسلمانوں کو ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی سے بے تعلق ثابت کر کے اس امر پر مہر تصدیق ثبت کر دی جائے کہ مسلمان کا دل محبّ وطن کی سی ذلیل چیز سے قطعی آلودہ نہیں ہے۔ (۲) مسلمان کو پیٹ پالنے کی خاطر فقط اس قدر تعلیم دی جائے کہ وہ بابو یا ڈپٹی کلکٹر بن کر بڑا بابو بن سکے (۳) اپنی زبان کو فراموش کر کے انگریزی میں اس قدر غرق ہو جائے کہ وہ انگریزی میں سوچے اور انگریزی میں خواب دیکھے (۴) وہ مغربیت اختیار کر کے مشرق سے اس قدر بیزار ہو جائے کہ اپنی معاشرت اپنی زبان اپنے ادب اپنے روایات اپنی ثقافتی وراثت کو ذلیل اور یہاں تک کہ اپنے باپ دادا تک کو احمق سمجھنے لگے (۵) اور اس کا نتیجہ ہو کہ حکومت برطانیہ کو دوام حاصل ہو جائے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ مزاج روزگار کی کارفرمائی کی بدولت اس شر سے خیر اور اس نقصان سے کچھ فائدے کے پہلو بھی نکل آئے لیکن جب آخری حساب کتاب کے بعد میزان کل کی نوبت آئی تو پتا چلا کہ اس کاروبار میں نفع بہ کم اور گھاٹا بہت زیادہ ہوا..... اور قلیل سود کا کثیر زیاں احاطہ کیے ہوئے ہے۔

ہمارے دور کالج کے ڈاکٹر تھے شفاعت اللہ صاحب جن کو ہماری شریر پارٹی نے یہ دھمکی دے کر ہموار کر لائی تھا کہ اگر آپ ہم لوگوں کو ہمارے مطالبے پر فرضی بیماری کی چھٹیاں نہیں دلائیں گے اور ہماری فرضی بیماری کے موقع پر ہمارے پرہیزی کھانوں میں کباب پراٹھے اور مرغ مسلم تجویز نہیں کریں گے تو ہم آپ کا نام ہلاکت اللہ رکھ کر اس نام کو اس قدر شہرت دیں گے کہ معائنے کے ہنگام آپ جس بورڈنگ

ہاؤس میں بھی داخل ہوں گے وہاں کے در و دیوار ہلا کت اللہ ہلا کت اللہ کے نعروں سے گونجنے لگیں گے۔

اسی طرح ہماری پارٹی نے ڈاک خانے والوں کو بھی اس قدر ڈرا دیا تھا کہ جب ہم علی گڑھ سے باہر سیر کرنا چاہتے تھے تو وہ ہمارے گھروں سے بلاوے کے فرضی تار ہمارے نام بھیج دیا کرتے تھے۔

ہمارے خاص معلم تھے واجد علی صاحب شیدا اور قاضی عبدالجلیل صاحب مراد آبادی واجد علی صاحب بڑے بڑے مزے کے آدمی تھے وہ جب کسی حسین طالب علم کو دھیلے سے تھپڑ مارتے تو اس یک گالوں پر آہستہ آہستہ ہات پھسلا کر دونوں آنکھیں میچ لیا کرتے تھے انہیں کی فرمائش پر میں نے ایک انگریزی فلم لارڈ یولنس ڈائر کا اردو نظم میں ترجمہ کیا تھا۔ وہ میری غالباً پہلی یا دوسری نظم تھی جو تلف ہو چکی ہے۔ اور ہمارے دوسرے معلم قاضی صاحب بلا کے ظریف انسان تھے اور ان کا یہ مزاحیہ دعویٰ تھا کہ انگریزی زبان اردو کے بطن سے پیدا ہوئی ہے..... اور ابتدا میں ایک بوڑھا انگریز تھا جو اردو بولنے والوں کے الفاظ اپنے لہجے میں لکھ لیا کرتا تھا اور اس کی وہی بیاض انگریزی زبان کا سرمایہ بن گئی۔

وہ کہتے تھے کہ یہ ڈاٹر فادر مدر سسٹر اور ڈیکوریشن کے الفاظ دراصل دختر، پدر، مادر، سراندر اور دیکھورے شان سے بنائے گئے ہیں جن کا تلفظ بگڑ گیا ہے۔ اور انگریزی میں طوائف کے لیے جو پراسٹی چیوٹ کا لفظ ہے وہ ہماری اردو پرائے واسطے کی کا بگڑا ہوا تلفظ ہے۔

میرے دور کا علی گڑھ ایسا نہیں تھا جیسا کہ آج کا علی گڑھ ہے۔ اس زمانے کے طالب علموں میں کوئی اودھی تھا۔ نہ پنجابی نہ بنگالی تھا نہ بہاری۔ صوبوں کے تعصّبات کی کسی کو خبر ہی نہ تھی اور جتنے بچے تھے وہ سارے ایم اے او کالج کے بچے اور آپس میں شیر و شکر تھے اور ان کے مابین اس قدر مضبوط اتحاد تھا کہ سارے شہر پر دھاک بیٹھی ہوء

ی تھی ہماری۔ اور یہاں کی پولیس بھی لرزہ براندام رہتی تھی۔ ہم سے اور اگر کسی لڑکے پر کوئی آنچ آجاتی تھی تو سارا کالج دوڑ پڑتا تھا اس کی امداد کے واسطے۔

اپنی پارٹی کے تمام ارکان کے نام مجھ کو یاد نہیں رہے ہیں۔ پٹنے کے سید عباس علی سید مبارک علی رام پور کے محسن اللہ خان جوار علی گڑھ کے عبدالجلیل خاں کے نام فراموش نہیں ہوئے۔ اور یہ بھی حافظے میں محفوظ ہے کہ اس پندرہ بیس لڑکوں کی ٹولی کے سردار تھے عبدالجلیل خاں اور ان کے نائب تھے محسن اللہ خاں۔

ایک بار جب ہم پانچوں لڑکے یعنی عباس علی مبارک علی محسن اللہ عبدالجلیل، اور میں سالانہ امتحان میں پاس ہو گئے تو ہم لوگوں میں یہ مسکوٹ ہوئی کہ پاس ہونے کی خوشی میں آگرے جا کر دوالی دیکھیں۔

لیکن اس عیاشی کے واسطے روپیہ کہاں سے آئے اور چھٹی کیونکر ملے؟ یہ بڑا ٹیڑھا سوال تھا۔ عباس علی نے یہ مشورہ دیا کہ ہم سب اپنے اپنے باپوں کو خط لکھ کر اپنے اپنے پاس ہونے کی خوشخبری سنائیں اور نئے کورس کی کتابوں کی غلط سلط لمبی چوڑی فہرست بھیج بھیج کر اپنے اپنے گھروں سے پان پان سو روپے منگائیں۔ یہ تجویز پنچوں نے بہت ہی پسند کی۔ سب نے اپنے باپوں کو اسی مضمون سے خط بھیجے۔ میں نے بھی اپنے باپ کی خدمت میں خط روانہ کر دیا۔

مجھے خط لکھے چھ سات روز ہو چکے تھے تو ایک دن دیکھا کہ داروغہ امید علی خاں چلے آرہے ہیں انہیں دیکھتے ہی میرا ماتھا ٹھنکا کہ ہو نہ ہو دال میں ضرور کچھ کالا ہے داروغہ صاحب کمرے میں آئے میں نے سلام کیا۔ سب کی خیریت پوچھی اور ان کے آنے کا سبب بھی دریافت کیا۔ انہوں نے کہا خان صاحب منی آرڈر کر رہے تھے مگر بڑ ابھیا (میرے برادر بزرگ) نے کہا رقم کسی کے ہاتھ براہ راست ہیڈ ماسٹر کے پاس بھیج دی جائے مین سن سے ہو کر رہ گیا۔ لیکن چہرے سے پریشانی ظاہر نہیں ہونے دی۔ اور محسن اللہ کے پاس جا کر جو اس وقت جلیل کے کمرے میں گئے ہوئے تھے سارا

ماجرا بیان کر دیا محسن تھوڑی دیر غور کرنے کے بعد آئینہ دیکھنے لگے میں نے کہا ماشاءاللہ مصیبت میں گھرا ہوا ہوں اور تم آئینہ دیکھ رہے ہو۔ انہوں نے مسکرا کر کہا تمہاری مشکل حل کرنے کے لیے ہی آئینہ دیکھ رہا ہوں۔ میں نے کہا یہ کیا بکواس کر رہے ہو؟ ..... انہوں نے کہا یہ تم تو چغد ہو میری بات سمجھ ہی نہیں رہے ہو۔ میں آئینے میں دیکھ رہا ہوں کہ میں انگریزوں کی طرح خوب گورا چٹا ہوں اور تمہاری خوش قسمتی ہے کہ میری آنکھیں بھی انگریزوں کی طرح کرنجی ہیں۔ میں نے کہا یہ کیا کہہ رہے ہو؟ کیا گھانس کھا چکے ہو؟ انہوں نے کہا تم بھی کتنی موٹی عقل کے آدمی ہو..... جاؤ کمرے میں سے میرا کالا سوٹ میرا بوٹ' ٹائی اور ہیٹ لے آؤ مگر اس طرح کہ کوئی دیکھنے نہ پائے۔ میں نے ان سے پوچھا کیوں؟ انہوں نے اپنے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر کہا خاموش وقت ضائع نہ کرو اور جو چیزیں میں نے کہی ہیں جلدی سے لا دو میں ان کا سب سامان لے آیا۔ انہوں نے جلدی جلدی سوٹ پہنا۔ سر پر ہیٹ لگا کر کہا آؤ میرے ساتھ۔ میں سٹپٹا گیا۔ اور ان کے ساتھ ہو لیا..... وہ سیدھے ہیڈ ماسٹر کے کمرے کے برآمدے میں داخل ہو گئے اور ہیڈ ماسٹر کے چپراسی سے کہا ہم اس وقت ایک مذاق کرنے آئے ہیں ابھی ہیڈ ماسٹر کے آنے میں آدھ گھنٹہ باقی ہے تم مجھ کو اجازت دے دو کہ میں ان کی کرسی پر بیٹھ جاؤں۔ اور جب شبیر اپنے ساتھ ایک آدمی کو لے کر یہاں آئے تو اس کے دروازے پر روک کر میرے پاس لاؤ اور پھر کمرے کے باہر نکل کر اس آدمی سے کہو چلیے صاحب بہادر کے پاس یہ کہہ کر محسن نے چپراسی کے ہاتھ پر پانچ روپے رکھ دیے چپراسی نے بات مان لی اور محسن ہیڈ ماسٹر کی کرسی پر جا کر بیٹھ گیا۔ اور میں دوڑتا ہوا ممتاز ہاؤس چلا گیا اور داروغہ صاحب کو لے کر آ گیا۔ چپراسی نے حسب ہدایت اندر جا کر اطلاع کی اور باہر نکل کر داروغہ صاحب سے کہا چلیے صاحب بہادر کے پاس۔

داروغہ نے ہیڈ ماسٹر کو سلام کیا۔ اور جیب سے میری فرستادہ فہرست کتب اور پان

سو کے نات نکال کر ہیٹ ماسٹر کی میز پر رکھ دیے اور پوچھا حضور اس رقم میں کوئی کمی بیشی تو نہیں ہو گی؟..... ہیڈ ماسٹر صاحب نے کہا دل یہ رقم ایک دم (بالکل) برابر (صحیح) ہے۔ اچھا کھان صاحب سے ہمارا سلام بولنا..... اب آپ جائیے۔

داروغہ امید علی سلام کر کے میرے ساتھ باہر نکل آئے اور جیسے ہی میں برآمدے کی سیڑھیوں سے اترنے لگا تو یہ دیکھا کہ سچ مچ ہیڈ ماسٹر صاحب تیز تیز قدم رکھتا چلا آ رہا ہے۔ اور چھوٹا ہیڈ ماسٹر غسل خانے کے دروازے سے نکل کر منہ پر رومال سے ڈھانکے انتہائی بزدلی سے دوستی طرف بھاگتا چلا جا رہا ہے تڑاتڑ تڑاتڑ۔

ہماری چند گفتنی شرارتیں بھی سن لیجے۔ ناگفتنی شرارتیں لکھ دوں تو کتاب ہی ضبط ہو جائے گی۔

(۱) ایک بار مجھے اور محسن کو یہ شرارت سوجھی کہ چھت کے روشن دان سے مظہر علیم صاحب پر پیشاب کیا جائے چنانچہ رات کے بارہ بجے ہم دونوں چھت پر چڑھ گئے انکے کمرے میں لیمپ جل رہا تھا ہم نے جب دیکھا کہ عین روشندان کے نیچے ان کی چارپائی بچھی ہوئی ہے تو ہم دونوں نے بڑے خضوع و خشوع کے ساتھ اپنے اپنے پائے جامے کھولے اور نشانہ باندھ کر شرشر ان کے منہ پر دھاریں مارنے لگے۔ سویت میں ان کے منہ پر جب گرما گرم پیشاب کی دھاریں پڑنے لگیں تو وہ چیخ مار کر اٹھ کھڑے ہوئے اور روشن دان سے سر اٹھا کر چیخنے لگے۔ ارے یہ کون بدمعاش ہے ارے یہ کون بدمعاش ہے..... چوکی دار چوکی دار وہ دروہ کھول کر باہر آ گئے اور پھر اسی طرح چیخنے لگے چوکی دار چوکی دار دورا آیا تو انہوں نے کہا یہ کون بدمعاش چھت پر چڑھا ہوا ہے..... جاؤ اوپر جا کر دیکھو۔ یہ شون سن کر ہم دونوں اپنے کمرے کا دروازہ کھول کر برآمدے میں آ گئے اور اپنے صید زبوں سے بڑی معصومیت کے ساتھ ہم نے پوچھا کیا ہوا ماسٹر صاحب؟ انہوں نے دانت پیس کر کہا اس کیا ہوا صبح کو مزا چکھا دوں گا۔

صبح سید ولایت حسین صاحب پراکٹر کے سامنے ہماری پیشی ہوئی پراکٹر صاحب

نے بڑی خشونت کے ساتھ بید اٹھا کر پوچھا صاف صاف بتا دو یہ حرکت تم نے کی تھی؟ یا کسی اور نے اگر جھوٹ بولے تو خدا کی قسم کھال کھینچ لوں گا نہ محسن نے کہا خدا کی قسم ہمیں کچھ بھی نہیں معلوم کہ یہ شرارت تھی کس کی ہم دونوں بے خبر پڑے سو رہے تھے کہ شور ہوا اور ہماری آنکھ کھل گئی باہر آ کر ماسٹر صاحب سے پوچھا کیا ہوا؟ تو وہ الٹا ہم پر برس پڑے۔ آپ ہم کو چاہیں تو مار لیں۔ آپ ہمارے باپ کے برابر ہیں۔ مگر قصور ہمارا کچھ بھی نہیں۔ اللہ جانتا ہے کہ سب پراکٹر صاحب ہم پر مفت کا الزام لگا کر ہم کو پٹوانا چاہ رہے ہیں''۔

میر صاحب بڑی کشمکش میں پڑ گئے سر جھکا کر سوچنے لگے اور کہا اچھا تم دونوں جاؤ میں پوری تحقیقات کروں گا۔ اور اگر تمہاری خطا ثابت ہو جائے گی تو اس قدر ماروں گا کہ تم دونوں عمر بھر یاد رکھو گے۔ اور ہم دونوں دل ہی دل میں رسیدہ بود بلائے سے بخیر گزشت کہتے اپنے کمرے میں آ رہے اور ایک دوسرے کے گلے مل کر خوب ہنسے..... یہ خبر سن کر شام کو جلیل ہمارے کمرے میں آئے ہم دونوں کو مبارک باد دی..... ہم سے کہا تم دونوں کرسیوں پر بیٹھ جاؤ ہم کرسیوں پر بیٹھ گئے تو انہوں نے ہماری کرسیوں کے عین نیچے لوبان سلگا کر ہماری گردنوں میں ہار ڈال دیے اور ہپ ہپ ہرا کہنے لگے۔

(۲) ناشتے اور دونوں وقت کے کھانے کے وقت ہم لوگوں کو بلانے کے واسطے ڈائنگ ہال کے دروازے پر گھنٹہ بجایا جاتا تھا۔ ایک روز جب راتکے آٹھ بج گئے اور ڈائننگ ہال کا گھنٹہ نہیں بجا تو تمام لڑکے پریشان ہو گئے۔ اور ڈائننگ ہال کے برآمدے اور صحن میں جمع ہو کر شور مچانے لگے اور عرب لڑکے روتی روتی روتی (روٹی روٹی روٹی) کے نعرے لگانے لگے۔

اس ہنگامے کو سن کر ہمارے اور درمیانی گوشے کے دونوں سب پراکٹر مظہر علیم صاحب اور فصیح الدین صاحب بھی وہاں آ گئے اور چوکی دار سے پوچھنے لگے گھنٹہ کہاں ہے؟ چوکی دار

نے دیوار کی طرف اشارہ کر کے کہا صاحب گھنٹہ یہاں لٹکا رہتا تھا نہ جانے کون اڑا لے گیا۔اس پر فصیح الدین نے مظہر علیم صاحب سے کہایا مظہر العجائب گھنٹہ غائب''

مظہر علیم صاحب نے چونک کر کہا جلیل کہاں ہے؟ ہر طرف جلیل جلیل کی آوازیں بلند ہو گئیں۔جلیل ہوتے تو بولتے۔مظہر علیم صاحب نے چوکی دور کو کہا جلیل کو ڈھونڈ کر لاؤ۔

چوکی دار نے آ کر کہا ''وہ تو نماز کے ہال میں بیٹھ نماز پڑھ رہے ہیں'مظہر علیم اور فصیح الدین وہاں پہنچے تو دیکھا کہ جلیل سجدے میں پڑے ہوئے ہیں۔اور اسی عالم میں کوئی چیز اپنے کمبل میں لپیٹ رہے ہیں۔مظہر علیم نے کمبل کا سرا پکڑا کر زور سے جھٹکا دیا اور گھنٹہ بڑی جھنکار کے ساتھ فرش پر گر گیا۔یہ دیکھتے ہی مظہر علیم نے سر بسجود جلیل کے سر پر تڑاق سے ایک ٹیپ مار کر کہا اٹھ کھڑا ہو مردود.....جلیل نے دفعتہ کھڑے ہو کر چیخ ماری کہ یہ یہ اسلامی سکول جہاں عین سجدے کے وقت نمازی لڑکوں کے سروں پر ٹیپیں ماری جاتی ہیں۔یہ سنتے ہی مظہر علیم چانٹا تان کر جلیل کی طرف لپکے اور عرب لڑکے بھی آ گئے مارنے کے واسطے جلیل نے یہ رنگ دیکھا تو الا اللہ کہہ کر ایک لانبی جست لگائی اور چکارے کی طرح چوکڑیاں بھرتے ہال سے اس طرح بھاگ کھڑے ہوئے کہ انہیں کوئی پکڑ ہی نہیں سکا۔

(۳)علی گڑھ میں بڑی دھوم دھام سے ہر سال نمائش ہوا کرتی تھی۔ایک رات کو جب ہم پیشاوری پر اٹھے کباب اور خورجے کی چٹنی کھا رہے تھے تو ہماری جنڈال چوکڑی ایک چاقو چھری بیچنے والے کی دکان پر جا کھڑی ہوئی۔نمائش کی تیز روشنی میں چھریاں اور چاو ایسے جگمگ جگمگ ہو رہے تھے کہ میرا جی چاہا میں انہیں بڑھ کر سینے سے لگا لوں۔میں نے پٹھان دکان دار سے پوچھا تو اس نے کہا ایک روپیا چار آنہ محسن نے کہا نہیں دس آنا پٹھان نے کہا نائیں ایک روپیا چار آنا خوشی چاہے ٹیک (Take) خوشی چاہے تو نہ ٹیک (Take)۔

ان آوازاوں کوسن کر کالج کے دوسرے لڑکے بھی اسی طرف آ گئے۔ اور ٹھٹ کے ٹھٹ لگ گئے دکان کے سامنے..... محسن نے پھر کہا دس آنا دس آنا پٹھان نے پھر وہی جواب دیا نائیں نائیں ایک روپیہ چار آنا ایک روپیہ چار آنا خوشی چاہے ٹیک خوشی چاہے نہ ٹیک۔ یہ سن کر محسن برافروختہ ہو گئے۔ تمام لڑکوں سے اشارہ کر کے کہا غازیو بڑھو اور ٹوٹ پڑو اور لوٹ لو مال غنیمت کو یہ دعوت عام سن کر ٹوٹ پڑے تمام لڑکے چھریوں چاقوؤں پر پٹھان جھپٹا لڑکوں نے اسے دبوچ لیا۔ اور لٹنے لگی دکان دھڑا دھڑ۔ پٹھان نے پولیس پولیس پولیس کے نعرے لگانے شروع کر دیے..... پولیس والے جھپٹ پڑے۔ ہم نے چھریاں تان لیں وہ ٹھٹک گئے اتنے میں ایک شامت کا مارا انگریز پولیس افسر موٹر سائیکل پر بیٹھا ادھر آ نکلا..... اور جب اس نے موٹر سائیکل سے ایک پاؤں اتار کر ہمیں ڈانٹنا شروع کیا تو ٹوٹ پڑے ہم سب اس پر اور اتنا پیٹا کہ وہ بے ہوش ہو کر گر گیا اور ہم سب کے سب مال غنیمت لیے اور خوشی چاہے ٹیک خوشی چاہے نہ ٹیک کے نعرے لگاتے وہاں سے کالج بھاگ آئے۔

(۴) ایک روز میرے ایک لکھنوی دوست اور میرے دوست پرنس میرزا عالم گیر قدر کا بھائی جہاں گیر قدر ہمارے پاس آیا فریادی بن کر، اور کہنے لگا شبیر ایک فرسٹ ائیر فول لڑکا فضل الٰہی ہے وہ سالا اپنے حسن پر اس قدر مغرور ہے کہ سیدھے منہ بات ہی نہیں کرتا پٹے پر ہاتھ ہی نہیں رکھنے دیتا۔ تمہاری پارٹی ماشاءاللہ بڑی تگڑی ہے اس کو نیچا دکھاؤ تو میں تمہارا غلام ہو جاؤں۔

ہماری پارٹی لنگر لنگوٹ کس کر جہاں گیر قدر کی مدد کے واسطے آمادہ وہ گئی۔ اتوار کے دن جہاں گیر قدر کو دولہا بنا کر اور ہار پھول ڈوپٹہ مصنوعی داڑھی اور ڈھولک لے کر ہم دس پندرہ لڑکے براتیوں کی طرح کچی بارک پہنچ کر فضل الٰہی کے کمرے میں مبارک باد مبارک باد کے نعروں کے ساتھ درانہ گھس پڑے۔ فضل الٰہی نے جس کے متعلق ساری دنیا میں ایک طرف فضل الٰہی کا غلغلہ ایک طرف بلند تھا تیوریوں پر بل

ڈال کر کہا۔ میں نے تو آپ لوگوں کو نہیں بلایا تھا؟..... جلیل نے کہا دلھنیں کسی کو بلایا نہیں کرتیں جنیا ہم جہاں گیر قدر سے تمہارا نکاح پڑھانے آئے ہیں۔

اس لڑکے نے کوشش کی بھاگ نکلنے کی ہمارے ساتھیوں نے پکڑ لیا ڈوپٹہ اس کے سر پر ڈال دیا۔ جہاں گیر قدر کو ہار پھول پہنائے جلیل نے جیب سے مصنوعی داڑھی نکال کر منہ پر لگائی اور قاضی بن کر اس لونڈے کا جہاں گیر قدر سے نکاح پڑھوا دیا۔ اور نکاح پڑھا دینے کے بعد ساتھیوں نے ڈھولک بجا بجا کر نیچے سروں میں شادیانے گانا شروع کر دیے۔ برآمدے میں لڑکوں کا میلا لگ گیا اور ہر طرف قہقہے گونجنے لگے۔

اتنے میں کسی نے یہ دیکھ کر کہ ہیڈ ماسٹر راؤنڈ لگاتا چلا آ رہا ہے۔ ہم کو آگاہ کر دیا ہم سب خوف زدہ ہرنوں کے مانند بھاگ کھڑے ہوئے..... اور دولھا میاں بھی اٹھ ہی رہے تھے کہ ماسٹر سر پر آن پہنچا..... فضل الٰہی نے اس سے فریاد کی۔ اسنے جہاں گیر قدر سے پوچھا تم کون ہو؟..... جہاں گیر قدر کی زبان سے گھبراہٹ میں نکل گیا Sir I am Bride Groom (جناب میں دولھا میاں ہوں)..... ہیڈ ماسٹر نے ول مسٹر برائڈ گروم ول مسٹر برائڈ گروم کہہ کہہ کر بیدوں پر دھر لیا۔

براتی تو صاف بچ کر نکل گئے۔ اور بے چارے برائڈ گروم[1] صاحب پٹ گئے۔ اور اس واقعے کے ایک ہفتے کے اندر ہم تینوں لڑکوں یعنی محسن اللہ خان عبدالجلیل خاں اور آگے چل کر حضرت جوش ملیح آبادی بننے والے شبیر حسن خاں کو بھی سکول سے نکال دیا گیا۔

بہت بے آبرو ہو کر ترے کوچے سے ہم نکلے

---

[1] میرزا جہاں گیر قدر کراچی میں رہتے تھے صد حیف کہ دو مہینے ہوئے پچاسی چھیاسی برس کی عمر میں ان کا انتقال ہو گیا۔ اس کم بخت دنیا میں دولھا بھی مر جاتے ہیں اور دلھنیں بھی سدھار جایا کرتی ہیں۔

☆☆☆

لکھنو میں دوبارہ آمد

علی گڑھ سے نکالا تو پھر لکھنو آ گیا۔ بانھہ ٹوٹتی ہے تو گلے ہی آتی ہے۔ لکھنو آ کر ابرار اور رئیس کی معیت حاصل ہو گئی جو بلی ہائی سکول میں داخلہ ہو گیا۔ وہاں سے چرچ مشن سکول ور چرچ مشن سکول سے نکل کر ریڈ کرسچین کالجیٹ ڈیٹ سکول میں داخلہ لے لیا۔

کچھ روز تک تو ہم لوگ لاٹوش روڈ کے اس دومنزلہ مکان میں رہے جس کو بڑھیا والا مکان کہا جاتا تھا۔ پھر چلے گئے راجہ ابوجعفر صاحب کی کوٹس روڈ والی کوٹھی میں اور وہاں سے منتقل ہو کر پھر پہنچ گئے کھجوے[1] کے باغ کی کوٹھی میں۔

کھجوے کے قیام سے مجھے بہت فائدہ پہنچا ایک طرف تو نارنگی کے باغ میں دوڑ لگاتے رہنے سے میری صحت بہت اچھی ہو گئی دوسری طرف مولانا سید ناصر حسین قبلہ اور سکول آتے جاتے حضرت پیارے رشید صاحب کی صحبت سے نہایت علمی و ادبی فائدہ پہنا اور تیسری طرف میر زا محمد ہادی صاحب رسوا لکھنوی (صاحب امراو جان ادا) سے میں نے باقاعدہ فارسی و عربی پڑھنا شروع کر دی۔ عربی تو آ نہ سکی لیکن فارسی میں کسی قدر نظر پیدا ہو گئی۔ اور اسی کے ساتھ ساتھ میری اردو بھی خوب منجھ گئی۔

---

[1] کھجوے میں آغائی صاحب کا ایک بہت بڑا نارنگیوں کا باغ تھا۔ اس میں قدیم وضع کی دو کوٹھیاں تھیں ایک کوٹھی میں ہم لوگ رہتے تھے۔ دوسری کوٹھی میں ناصر حسین صاحب قبلہ کا وسیع کتب خانہ تھا اور ہماری کوٹھی کے نیچے والے حصے میں آغائی صاحب کی لاش رکھی ہوئی تھی جو ایک متعین مدت کے بعد کربلا بھیجی جانے والی تھی۔

اور لکھنو آ کر میرا بچھڑا محبوب عطا حسین قزلباش بھی مجھ کو دوبارہ مل گیا۔ عطا حسین کی صحبت می میری دادی نے جو شیعیت کے نقوش میرے بل پر بنائے تھے وہ اور بھی ابھر گئے اور جیسا کہ اوپر بیان کر چکا ہوں ناصر حسین صاحب قبلہ کی صحبت نے میری شیعیت میں پختگی پیدا کر دی۔

اب میں برابر مجلسوں میں جانے اور ماتم کرنے لگا..... اور میرے خاندان کی اصطلاح میں میری رافضیت مسلم ہوگئی پھر بھی میرے باپ نے مجھ سے ناخوشی کا مطلق اظہار نہیں فرمایا تھا۔

میرے تبرائی شیعہ ہونے کا تیقن

لیکن جب میرے باپ کے کان تک یہ خبر پہنچی کہ میں مقبرہ جناب عالیہ[1] کے جشن تبرا میں بھی شریک ہوا تھا تو یہ بات ان کو نہایت ناگوار گزری۔ انہوں نے میرے پھپّی زاد بھائی امیر حسن خاں کی معرفت یہ پیغام بھیجا کہ میں تبرا ترک کردوں انہوں نے کہا ماموں نے یہ فرمایا ہے کہ جہاں تک حب آل رسول کا تعلق ہے۔ میں اس کو جزو ایمان ہی نہیں اصل ایمان سمجھتا اور رسول اللہؐ کے بعد حضرت علیؑ کو سب سے افضل مانتا ہوں۔ لیکن اس کے باوجود اصحاب ثلاثہ پر سب وشتم کو برداشت نہیں کیا جا سکتا۔ اس لیے کہ اس فعل بد سے فقط خلفاء ہی کی توہین نہیں ہوتی بلکہ رسالت مآب کے فیضان صحبت پر بھی آنچ آتی ہے۔ اور جب میں تبرے سے دست بردار ہونے پر آمادہ نہیں ہوا تو میرے باپ نے وصیت نامے کی رو سے مجھ کو جائیداد سے محروم فرما کر فقط سو روپے ماہانہ کا گزارہ دار بنا دیا۔

اتنی بڑی جائیداد سے محروم ہو جانے کا میرے دل پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ اور اس کے برعکس میں نے یہ سوچا کہ ناخوش ہو جانے کے بعد بھی میرے باپ نے میرے نام سو روپے ماہانہ لکھ دیے۔ اگر وہ یہ بھی نہ کرتے تو میں کیا کر سکتا تھا۔ میرے باپ میں کس قدر شفقت کا جوہر ہے۔

---

[1] یہ مقبرہ گولا گنج میں ہے جہاں تبرہ بازی کا ایک سالانہ جشن کیا جاتا ہے۔ اور اکابر لکھنو شریک ہوتے ہیں۔

سچا خواب میرے تحت شعور کا فعال اضطراب::

اس محروم الارث ہو جانے کے کوئی چھ سات مہینے کے بعد ایک روز دوپہر کے

وقت جب کہ شدید گرمی پڑ رہی تھی۔ اور میں کٹرہ ابوتراب خاں (لکھنو) کے مکان کے ایک ٹھنڈے فرش پر لیٹا ہوا تھا۔ میں نے اللہ سے باتیں کرنا شروع کر دیں۔ میں نے کہا سنتا ہوں اے اللہ میاں جب کوئی تمہاری طرف ایک قدم اٹھاتا ہے تو تم اس کی جانب سو قدم اٹھاتے ہو۔ لیکن میرے ساتھ تمہارا معاملہ اس کے برعکس ہے۔ میں تمہاری طرف بڑھتا ہوں اور تم ہو کہ ٹس سے مس ہی نہیں ہوتے ہو تمہیں خوش کرنے کے لیے میں نے اپنے باپ کو ناخوش کیا ہے۔ جائیداد سے محروم ہو گیا اب تم مجھ سے یہ بتاتے ہی نہیں کہ میں راہ راست پر ہوں یا گم راہ ہو گیا ہوں ارے اللہ میاں کچھ تو منہ سے ولوسر سے کھیلو..... ''دل ہی دل میں یہ باتیں کرتے کرتے سو گیا۔

سوتے ہی خواب دیکھا کہ صبح کی گلابی روشنی پھیلی ہوئی ہے۔ آسمان سے سونا برس رہا ہے۔ اور میں کسی سواری پر بیٹھا ایسی راہ سے گزر رہا ہوں جس کے دونوں طرف بڑے گھنے اور شاداب درخت نسیم سحر سے جھوم رہے ہیں اور ہزاروں چڑیاں ان کی شاخوں پر بیٹھی چہچہا رہی ہیں۔ کہ مشرق کی سمت سے ایک جلوس بڑے تزک و احتشام کے ساتھ نمودار ہوا..... میری نظریں اس جلوس پر جم کر رہ گئیں..... اور جب وہ قریب آ گیا تو رئیس جلوس کے چہرے کی تابناکی دیکھ کر میرے دل پر اس قدر اثر پڑا کہ میں اپنی سواری سے ایک دم کود پڑا اور جھک کر سلام کیا..... رئیس جلوس نے میری طرف آنکھیں اٹھائیں ان کی آنکھوں سے کرنیں قطار در قطار نکلیں جو میرے دل میں پیوست ہو گئیں اور وہ مسکرا کر میرے سلام کا جواب دیتے ہوئے ایک سمت مڑ گئے۔ ابھی میں سوچ ہی رہا تھا کہ یہ کیس غیر معمولی مقناطیسی شخصیت تھی کہ بے جانے پہچانے مجھ کو اس نے اس قدر متاثر کر دیا..... کہ اتنے میں ایک دوسرا جلوس نمودار ہوا اور اس عجیب ساحب جلوس کا بھی مجھ پر ویسا ہی اثر پڑا اور وہ بھی میرے سلام کا جواب دیتا ہوا اسی طرف روانہ ہو گا جس طرف پہلا جلوس مڑ گیا تھا۔

جب دونوں جلوس نگاہوں سے اوجھل ہو گئے تو میں یہ بات سوچنے لگا کہ میں ان

سے متعارف کیسے ہوسکتا ہوں؟ اور کیوں نہ ادھر مڑ جاؤں جدھر یہ دونوں جلوس مڑ گئے ہیں۔ کہ دفعتہً میری پشت پر کسی نے ہاتھ مارا میں اچھل را۔ اور مڑ کر دیکھا وایک نورانی چہرہ کے بزرگ میری طرف دیکھ کر مسکرا رہے ہیں۔ میں نے پوچھا آپ کون ہیں .....انہوں نے کہا ابوذر غفاری۔ میں نے سلام کر کے ان کے ہاتھ چوم لیے اور ان کے سامنے سر جھکالیا۔ انہوں نے کہا سر اٹھاؤ یہ سر جھکنے کے لیے نہیں بنا ہے۔ میں تم کو مبارک باد دیتا ہوں کہ تم کو سرور کونین محمد رسول اللہؐ اور ان کے جانشین مشکل کشا علی ابن ابو طالب کی زیارت کا شرف حاصل ہوا ہے۔

یہ سن کر میرے دل میں فخر کے فوارے چھوٹنے لگے۔ اور آنکھوں میں مسرت کے آنسو برسنے لگے۔ اور میں نے پوچھا۔ ''میں اپنے رسول اور امام کو ڈھونڈنے کدھر جاؤ؟ انہوں نے درختوں کے ایک جھنڈ کی طرف اشارہ کر کے کہا دیکھو وہ جو مسجد کا منارہ نظر آ رہا ہے اسی طرف چلے جاؤ اللہ کا جواب تمہارا انتظار کر رہا ہے۔ یہ کہہ کر وہ غائب ہو گئے۔ اور میں دھڑکتے دل کے ساتھ ادھر روانہ ہو گیا۔ اور جب مسجد کے دروازے کی پہلی سیڑھی میں قدم رکھا تو دیکھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم چبوترے کے کنارے آستینیں چڑھائے بیٹھے ہیں۔ اور علی مرتضیٰ پانی کا ظرف ان کے پاس رکھ رہے ہیں۔ میری آہٹ سن کر رسول اللہؐ نے حضرت علیؑ سے کچھ اشارہ فرمایا۔ (جسے میں سن نہیں سکا) رسالت مآب کا ارشاد سن کر وہ میری طرف اس طرح چلے جیسے کوئی مژدہ سنانے والا آتا ہے۔ آہستہ آہستہ قدم اٹھاتے وہ میرے پاس تشریف لائے اور میرے سر پر ہاتھ پھیر کر ارشاد فرمایا جو ہم سے محبت کرتا ہے نہ تو اس کی دنیا خراب ہوتی ہے اور نہ ہی عقبیٰ۔ جاؤ بلندیاں تمہارا انتظار کر رہی ہیں۔ یہ خواب سن کر میری آنکھ کھل گئی۔ آنکھوں سے آنسوؤں کے چشمے پھوٹ نکلے اور دل بلیوں اچھلنے لگا۔ کہ بوالحاظن نے آ کر کہا منجھلے بھیا میاں بلا رہے ہیں۔ میں دھڑکتے دل کو سنبھال کر اٹھا۔ جلدی جلدی منہ دھویا اور اپنے باپ کے روبرو جا کر کھڑا ہو گیا۔ میرے باپ

کچھ لکھنے میں مشغول تھے۔قلم روک کر انہوں نے میری طرف نگاہ اٹھائی ان کی بڑی بڑی گلابی آنکھوں میں آنسو بھرے ہوئے تھے۔مجھ سے ارشاد فرمایا بیٹھ جاؤ میں بیٹھ گیا اور وہ پھر کہنے لگے میں حیران ہوں کہ یہ معاملہ کیا ہے؟ ان کا قلم بڑی تیزی اور انتہائی ولولے کے ساتھ دس پندرہ منٹ تک چلتا رہا اور جب عبارت مکمل ہوگئی تو انہوں نے کہا بیٹا یہ جائیداد کمبخت ایسی چیز ہے کہ اسے حاصل کرنے کے لیے بھائی بھائی کا گلا کاٹ دیتا ہے۔ میں نے تجھ کو جائیداد سے محروم کر دیا اور دیکھا کہ تیرے ماتھے پر شکن تک نہ آئی اور تیری اطاعت شعاری میں بھی یک سر مو فرق نہیں آیا۔لے یہ دوسرا وصیت نامہ ہے جس کی رو سے میری جائیداد میں سے تجھ کو تیرا پورا حق مل جائے گا۔تو بڑے کردار کا آدمی ہے۔اس کردار کا آدمی اگر یہودی یا مجوسی بھی ہو جائے تو بھی وہ اس امر کا مستحق ہے کہ اس کو سر آنکھوں پر جگہ دی جائے۔یہ کہہ کر میرے باپ پر رقت طاری ہوگئی اور رندھی ہوئی آواز میں فرمایا بیٹا میں تیرے کردار کے سامنے سر جھکاتا ہوں۔یہ کہتے ہی میرے انسان باپ نے میرے سامنے سر جھکا دیا۔.....میرے منہ سے دفعتہً چیخ نکل گئی۔ارے میرا باپ کتنا بڑا آدمی ہے اور جھپٹ کر میں نے ان کے دونوں جوتے اٹھا کر اپنے سر پر رکھ لیے سر سے اتار کر سینے سے لگا لیے۔پھر باپ کے قدموں سے منہ رگڑنے لگا اور میرے باپ نے مجھے چھاتی سے لگا لیا اور خود بھی رونے لگے۔

میرے نکاح کی تنسیخ کا مقدمہ

جب میری شیعیت یا یوں کہیے کہ میری رافضیت کا غلغلہ بلند ہوگیا تو میرے چچا نواب محمد علی خاں نے جن پر میرا نکاح نہایت شاق گزرا تھا اپنے چھوٹے بھائی یعنی میرے خسر کو طلب فرما کر کہا۔

غلام شبیر پکا رافضی بن چکا ہے۔تم نکاح کی تنسیخ کا دعویٰ دائر کر دو میں تمہارا پورا پورا ساتھ دوں گا.....اور میرے حقیقی چچا نواب محمد اسحٰق خان نے بھی میرے خسر سے

کہا۔ دیکھو مقیم اب پانی سر سے گزر چکا ہے۔ جب شبیر نے ضریح کے سامنے جھنڈا پڑھنا رکوا دیا تھا تو اسی دن میرا ماتھا ٹھنکا تھا کہ آج نہیں تو کل یہ ضرور رافضی ہو جائے گا۔ اور اب تو وہ کھلم کھلا رافضی ہو چکا ہے تم تنسیخ نکاح کا دعویٰ کر دو تو میں تمہارے ساتھ ہوں۔

میرے خسر بھولے بھالے پٹھان تھے۔ آ گئے بھڑی میں اور دائر کر دیا مقدمہ دن سے..... مقدمہ دائر ہوتے ہی ایک قیامت برپا ہو گئی۔ اور ملیح آباد سے لے کر لکھنو تک گونجنے لگا۔ اس کے چرچوں سے۔ میرے باپ نے اپنی سنت جاریہ پر عمل کرتے ہوئے پہلا کام یہ کیا کہ تمام درجہ اول کے وکلا یعنی شیخ علی عباس ظہور احمد میرزا سمیع اللہ بیگ سروزیر حسن اور الہ آباد کے سر تیج بہادر سپرو۔ اور سر جان جیکسن کو پہلے ہی سے اپنا لیا تا کہ فریق ثانی کو درجہ اول کا کوئی وکیل میسر نہ آ سکے۔

وہ مقدمہ پورے چھ برس تک مسٹر شرغا منصب شمالی کے اجلاس پر بڑے زور و شور سے چلتا رہا۔ میرے خسر کی جانب سے علمائے اہل سنت کے فتوے پیش کیے گئے تھے کہ رافضی کافر ہوتا ہے۔ اس لیے کسی مسلمان لڑکی سے اس کا عقد ایک ناجائز امر ہے اور خلاف شریعت۔

ہماری طرف سے اس کی نظریں بھی پیش کی گئیں تھیں کہ زمانہ قدیم سے لے کر اب تک سینکڑوں شیعہ لڑکوں نے سنی لڑکیوں کے ساتھ نکاح ہو چکے ہیں۔ اور انکی اولادیں ورثہ پا چکی ہیں۔ اور کیا ان تمام شیعہ لڑکوں اور سنی لڑکیوں کے سابق نکاحوں کا ناجائز قرار دے کر آج یہ فیصلہ کیا جائے گا کہ اس نوعیت کے نکاحوں سے جو بچے پیدا ہو کر اپنے اپنے باپوں سے وراثت پا چک ہیں ان کو اولاد ناجائز ٹھہرا کر وراثت سے محروم کر دیا جائے؟ اور ان سابق نکاحوں کے مواقع پر علمائے اہل سنت کو کیا ہو گیا تھا کہ وہ اس وقت بالکل خاموش رہے اور اس نکاح کی تنسیخ کا مقدمہ دائر ہوتے ہی وہ اسلامی شریعت میں کیا بنیادی انقلاب آ گیا ہے کہ آج اس کے خلاف فتوے جاری

کیے جا رہے ہیں؟ اور کیا یہ صحیح نہیں ہے کہ مولوی عبدالشکور صاحب نے سنیوں اور شیعوں کے درمیان جو منافرت پیدا کرنے کی تحریک چلائی ہے یہ تمام غلط فتوے اسی تحریک کے بطن سے پیدا ہوئے ہیں؟؟

لچچا مجھے شبیر حسن کی بجائے ہمیشہ غلام شبیر کہا کرتے تھے اس لیے کہ وہی میرا پہلا نام تھا۔

حیرت کی بات یہ ہے کہ تین پشتوں کے دیرینہ مراسم کے باوجود مولانا عبدالباری صاحب فرنگی محل نے بھی ان فتوؤں کی تصدیق فرما دی تھی..... لیکن میں آج تک شکر گزار ہوں کہ مولانا عبدالباری صاحب کے چچا شمس العماء مولانا عبدالحمید صاحب اور نامی پریس لکھنو کے مالک حکیم خواجہ شمس الدین صاحب نے میری موافقت میں گواہی دی تھی۔

جس روز میرے مقدمے کی پیشی ہوئی تھی تمام لکھنو ٹوٹ پڑتا تھا سننے کے واسطے..... اور میرے باپ اور میرے خسر کے ہمراہ جو تین تین چار چار سو جاں نثاروں حامیوں اور گواہوں کا لشکر آتا تھا۔ اس سے عدالت کے برآمدے اور صحن میں ایک میلہ سا لگ جاتا تھا چاروں طرف سے خوانچے اور قفلی والے ٹوٹ پڑا کرتے تھے اور ہر پیش پر تقریباً دو تین سو روپے چرندم خورندم پر اٹھ جایا کرتے تھے۔

مجھے خوب یاد ہے کہ جس روز میرے باپ عدالت میں بیان دینے کے واسطے اپنی کرسی سے کھڑے ہوئے تھے مخالف فریق کے وکیل شیشیر ناتھ صاحب نے عدالت سے کہا تھا کہ خاں صاحب کے بیان سے بیش تر میں یہ بات عدالت کے گوش گزار کر دینا چاہتا ہوں کہ میں ان کا قدیم نیازمند ہوں اس لیے مجھ کو معلوم ہے کہ وہ کس قدر شیریں بیان آدمی ہیں کہ سننے والوں پر جادو کر دیتے ہیں۔ اس لیے میری درخواست ہے کہ عدالت ان کی جادو بیانی سے متاثر نہ ہو۔ اور وہ تاثر قانون پر حاوی نہ ہونے پائے۔ یہ سن کر شرغا صاحب ہنس پڑے تھے اور یہ کہا تھا کہ اب ت میں

بڑے شوق سے خاں صاحب کا بیان سنوں گا۔ اور میرے باپ کے بیان کے اختتام کے بعد شرغا صاحب کے چہرے پر جو تاثرات نمودار ہوئے تھے' ان کو دیکھ کر شیشر ناتھ نے میرے خسر کے کان میں کہا تھا کہ خاں صاحب اب آپ مقدمہ ہار جائیں گے بہتر ہے کہ صلح کر لیجیے۔

مجھے پتا نہیں ہے کہ میرے خسر نے اس مقدمے پر کتنا روپیہ برباد کیا تھا لیکن یہ معلوم ہے کہ میرے باپ کے چالیس پچاس ہزار روپے صرف ہو گئے تھے۔



سینٹ پیٹرز کالج آگرہ

ابھی وہ مقدمہ چل ہی رہا تھا کہ میرے ریڈ کرسچن کالج کے ہید ماسٹر نے یہ مشورہ دیا کہ میں آگرے کے سینٹ پیٹرز کالج یں داخل ہو جاؤں اور وہاں سے سینئر کیمبرج پاس کروں اور سیدھا لندن چلا جاؤں۔

یہ بات میرے دل میں اتر گئی۔ اور میں سمجھ گیا کہ میں حساب اور جغرافیہ میں کمزور ہوں یہاں پنپ نہیں پاؤں گا۔ اس لیے سینئر کیمبرج کا پاس کر لینا میرے لیے آسان ہوگا اور ولایت جانے کا راستہ نکل آئے گا۔

رئیس اور ابرار نے بھی اس مشورے کو پسند کیا۔ اور کہا ہم بھی آپ کے ساتھ آگرے چلیں گے۔ جب یہ بات طے ہوگئی تو ابرار نے کہا بشیر مانموں کے پاس چلنے سے بیشتر آیئے اس سامنے والی جنات کی کوٹھری میں چل کر دعا مانگیں کہ بشیر مانموں ہم کو آگرے بھیجنے پر تیار ہو جائیں۔

جوتے اتار اتار کر آگے آگے ابرار اور پیچھے پیچھے میں اور رئیس اس کوٹھری میں داخل ہو گئے۔ ابرار نے کہا میں دعا مانگوں گا آپ لوگ آمین کہیں گے اس کے بعد ابرار نے دونوں ہات اٹھا کر دعا مانگی کہ اے اللہ ہم سب کے اچھے اللہ میں اور شبیر خاں اب تک جو گناہ کر چکے ہیں ان سب کو معاف کر ہم تیرے سامنے توبہ کرتے ہیں۔ ابرار نے یہ کہہ کر اپنے منہ پر اور ان کو دیکھ کر ہم دونوں بھی اپنے منہ پر تڑا تڑ تڑا تڑ تھپڑ مارنے لگے۔ اور تھپڑ مار چکنے کے بعد ابرار نے بڑی لجاجت سے کہا اے میرے معاف کر دینے والے اللہ بشیر مانموں کے دل میں یہ بات ڈال دے کہ وہ ہم تینوں کو آگرے بھیج دے ہم دونوں نے آمین آمین کے نعرے لگائے اپنے اپنے چہروں پر ہاتھ پھیرے اور پہنچ گئے۔ میاں کے کمرے میں میاں علیل تھے بستر پر لیٹے لیٹے انہوں نے ابرار کی طرف آنکھیں اٹھا کر فرمایا گرو گھنٹال کیا کرنے آئے ہو؟..... ابرار نے ہات جوڑ کر سینٹ پیٹرز کالج کے تمام محاسن اور وہاں کا آخری امتحان پاس کرنے

کے بعد تمام مفید نتائج اور پھر ولایت سے بیرسٹری کی سند لے کر آنے کے درخشاں امکانات پر دل نشیں تقریر کر کے کہا۔ یہ ہماری آخری درخواست ہے اسے مان لیجیے اور ہم کو آگرے بھیج دیجیے..... قوان مجید! کی قسم ہم بیرسٹر بن کر آئیں گے آپ کا دل باگ باغ ہو جائے گا۔

ہماری خوش قسمتی کہ میاں نے یہ درخواست قبول کر لی اور ہماری آگرے کی تیاریاں ہونے لگیں۔ لیکن دو چار دن بعد یہ معلوم ہوا کہ وہ خالصتہ فرنگی کالج ہے جہاں ہندوستانیوں کو داخلہ نہیں ملتا تو ہمارے پاؤں کے نیچے سے زمین نکل گئی اور ہم سب حامد علی خاں بیرسٹر کے پاس پہنچے کہ وہ شاید کوئی تدبیر نکال دیں۔ حامد علی خاں نے کہا اگر ہمارا لیفٹیننٹ گورنر سفارش کر دے تو وہاں داخلہ ہو جائے گا۔

میاں نے لیفٹیننٹ گورنر سے سفارشی خط لے کر ہم تینوں کو آگرے بھیج دیا اور ہمارے ساتھ انہیں گونڈے والے نوروز باورچی اور علی شیر خاں کو سپاہی کے طور پر ہمارے ساتھ کر دیا۔

! ابرار کی زبان سے قرآن مجید کے عوض ہمیشہ قوان مجید نکلا کرتا تھا۔

آگرے پہنچتے ہی کالج میں ہمارا داخلہ ہو گیا..... نانا کا محل چوں کہ کالج سے بہت دور تھا اس لیے محلّہ گھیا اعظم خاں میں ہم نے ایک دو منزلہ مکان کرائے پر لے لیا۔ اور جی لگا کے پڑھنے لگے۔ ہمارے کورس میں شیکسپیر کا ڈرامہ جولیس سیزر داخل تھا۔ اور میں اس ڈرامے پر اس قدر حاوی ہو گیا تھا کہ میرا پروفیسر یورپین طالب علموں سے کہا کرتا تھا کہ تم کو شرم نہیں آتی کہ یہ لڑکا ہندوستانی ہو کر جولیس سیزر کے مطالب تم سے کہیں بہتر سمجھتا ہے۔ اور جب اس کے متعلق اس سے کوئی سوال کرتا ہوں تو یہ اس کی ایسی اچھی شرح پیش کرتا ہے کہ گویا اس کے سینے میں شیکسپیر کا دل دھڑک رہا ہے۔ اس کالج کے ایک بوڑھے انگریز پروفیسر مسٹر گرین وڈ کو میں نے پرائیویٹ ٹیوٹر کے طور پر رکھ لیا تھا جو ہر شام کو بیرپی! کرانے آتے تھے اور دو گھنٹے تک اس خوبی اور ایسی دلچسپی سے پڑھایا کرتے

تھے کہ ان کا ایک ایک حرف میرے دماغ کا جزو بن جایا کرتا تھا۔

اس دور کی ایک بات مجھ کو آج تک یاد ہے کہ وہ عجیب بات یہ ہ کہ مجھ پر اس زمانے میں وہ چیز طاری ہوگئی تھی جس کو دینی اصطلاح میں نیک چلنی اور شاعرانہ اصطلاح میں بدچلنی کہا جاتا ہے اور تو اور میں سینما تک سے مجتنب ہوگیا تھا۔

میرا یہ معمول ہوگیا تھا کہ صبح سے پیش تر اپنے پڑوس کے ایڈورڈ پارک میں جاتا موذن کے حجرے سے اپنا مگدر نکالتا دیر تک انہیں ہلاتا اور دیر تک دوڑ لگاتا رہتا۔

اس پارک میں ایک کھاتے پیتے گھرانے کی چھریرے انگریز لڑکی بھی آیا کرتی تھی اور کن انکھیوں سے مجھے دیکھتی رہتی تھی اور اکثر پگڈنڈی کے موڑوں پر اس طرح ادبدا کر دوڑ لگاتی تھی کہ ہم ایک دوسرے سے ٹکرا بھی جایا کرتے تھے۔ لیکن میں اس قدر پارسا ہو چکا تھا کہ اس کی جانب ملتفت ہی نہیں ہوتا تھا۔ اور جب وہ حسرت بھری نگاہوں سے دیکھ کر سر جھکا لیا کرتی تھی..... تو وہ زاہد خبیث جس نے میرے دل پر قبضہ کر کے میرے شاعرانہ جمال پرست کو کان پکڑ کر باہر نکال دیا تھا..... میری پیٹ ٹھونکنے لگتا تھا۔

۱؎ ان کے منہ سے پڑھاتے وقت جب ہلکی شراب کی خوشبو آتی تھی میری طبیعت بگڑ جایا کرتی تھی اور یہ اسی کا آج تک اثر ہے کہ بادہ خواری کے وقت جب کوئی بے توفیق میرے پاس آتا ہے تو منہ اس سے دور رہتا اور منہ قریب لا کر بات نہیں کرتا.....

۲؎ میرا یہ بدچلنی کا دور جب ڈیڑھ برس کے بعد ختم ہوگیا تو میرے شاعر نے واپس آ کر اور میرے منہ پر طمانچے مار کر یہ کہا تھا کہ اے مردود تو نے جس لڑکی کا دل توڑا تھا حشر کے دن اس کا بات ہوگا اور تیرا گریبان۔

ایک خوف ناک پیش بینی

اس اثناء میں میرے باپ جب ہم لوگوں کو دیکھنے آگرے تشریف لائے اور تین چار دن قیام فرما کر لکھنو جانے لگے تو ہم لوگ آگرہ سٹی تک انہیں رخصت کرنے گئے

اور جب وہ گاڑی میں بیٹھے اور گاڑی رینگنے لگی تو دفعتہً میرے دل سے یہ صدا آئی کہ میاں کو جی بھر کے دیکھ لو کہ اب انہیں کبھی نہ دیکھ سکو گے..... یہ خیال آتے ہی میرا سر چکرانے لگا۔ اور دل تھام کر ایک قریب کی بنچ پر بیٹھ گیا..... رئیس و ابرار گھبرا گئے نوروز دوڑتا گیا اور پانی لے آیا۔ میں نے پانی کے دو گھونٹ پیے اچھو لگ گیا اور ابرار نے میری پیٹھ پر گھونسے مارے اور رئیس میرا سینہ سہلانے لگا اچھو سے تو نجات مل گئی لیکن اس خیال نے جو کانٹا چبھو دیا تھا دل سے نہیں نکلا۔ رئیس و ابرار نے پوچھا کیا ماجرا ہے میں نے اصلی بات نہیں بتائی ٹال دیا۔

اس واقعے کے بعد میں اداس اداس رہنے لگا..... اور اس کے چھ سات دن کے بعد میں نے خواب میں دیکھا کہ میرے باپ[1] کی لاش محمد علی چچا کی موٹر میں لکھنو سے ملیح آباد جا رہی ہے۔

میرا دل اس قدر زور سے دھڑکا کہ آنکھ کھل گئی۔ آنسوؤں سے لبریز آنکھوں سے میں نے گھڑی دیکھی صبح کے چار بج رہے تھے۔ میں نیچے آیا ابرار اور رئیس کو جگایا ابرار سے کہا تم پہلی ہی گاری سے لکھنو چلے جاؤ اور میاں کی خیریت بذریعہ تار مطلع کرو۔

میرے باپ کا انتقال[2]

دوسرے دن تار آ گیا میرے باپ کے انتقال کا..... تار بجلی کی طرح مجھ پر گرا..... چیخیں مار مار کر میں رونے لگا۔ رئیس نیچے سے دوڑا آیا پوچھا کیا ہوا؟ میں نے تار کی طرف اشارہ کر دیا۔ اس نے فرش سے تار اٹھایا ہم دونوں بھائی لپٹ کر دیوانہ وار رونے لگے۔ اور پہلی گاری سے ملیح آباد روانہ ہو گئے..... راستے میں ہمارا کیا عالم رہا کس کی مجال ہے کہ اسے بیان کر سکے۔ کان پور اسٹیشن پر جب ٹکٹ چیکر نے آ کر ٹکٹ مانگا اس وقت پتا چلا کہ فرط سراسیمگی میں ہم نے ٹکٹ ہی نہیں لیا۔

---

[1] اس کے بعد پتا چلا کہ بالکل یہی صورت حال پیش آئی تھی..... [2] میرے باپ کا انتقال بیالیس سال کی عمر میں سنہ ۱۹۱۶ء میں ہوا تھا۔

اور پاؤں کی طرف نظر جھکی تو معلوم ہوا کہ پاؤں میں جوتا بھی نہیں ہے۔ٹکٹ چیکر نے ہم کو سر سے لے کر پاؤں تک دیکھا اور کہا صورتوں سے تو آپ لوگ شریف معلوم ہو رہے ہیں لیکن..... میں نے اس کی بات کاٹ کر سارا ماجرا بیان کر دیا۔وہ کسے اچھے خاندان کا آدمی تھا اس نے کہا کوئی بات نہیں آپ لکھنو چل کر کیا ٹکٹ کے دام دے دیں گے؟ میں نے کہا یقیناً..... لکھنو پہنچ کر ٹکٹ چیکر میرے ساتھ ہولیا..... میں سیدھا اپنے مقدمے کے وکیل ظہور احمد کے پاس پہنچا انہوں نے ٹکٹ کے دام دے دیے۔ ٹکٹ چیکر نے رسید دیے بغیر دام اپنی جیب میں رکھ لیے اور ظہور احمد صاحب سے مزید دس روپے کے قرض لے کر ہم رات کی گاری سے ملیح آباد روانہ ہو گئے۔



برہنہ پا یتیموں کی طرح

اللہ اکبر وہ رات وہ نالوں سے گونجتی اور آنسوؤں میں ڈوبی ہوئی رات..... وہ صاحب خانہ کے سدھار جانے کے بعد کی سر پیٹتی رات۔ وہ ایک لٹے ہوئے قافلے کی بے قافلہ سالار رات!

جب اپنے گھر کے اداس پھاٹک پر نظر پڑی اور ہر آن شادیانوں سے گونجتے ہوئے صحن سے جب نالہ وشیون کی ملی جلی آوازیں سنیں دل پر گھن چلنے لگے..... اور جب اس صحن میں کانپتی پنڈلیوں کے ساتھ قدم رکھا جہاں شفقت پدری کی گھنیری چھاؤں میں میرا بچپن کھیلا کرتا تھا۔ تو ایک بہت بڑے کہرام نے میری پیشوائی کی..... داروغہ امید علی دوڑتے اور چیختے آئے اور مجھ سے چمٹ کر رونے لگے..... اور ہماری چیخوں نے بام و در میں زلزلہ پیدا کر دیا مکان کے اندر سے بھی ہائے ہائے کی صدائیں آنے لگیں..... دادی جان کی آواز آئی بشیر جاگ اٹھ تیرے بچے آگرے سے آئے ہیں سلام کرنے کو۔ دادی کی یہ آواز سن کر ایسا محسوس ہوا کہ گویا ذروں سے لے کر تاروں تک ایک عظیم ماتم برپا ہے۔ اور اس کرہ ارض کے تمام پہاڑ میرے سینے پر رکھ دیے گئے ہیں۔ اور اس آسمان کی ڈاٹ کے نیچے تمام دنیا کے رونے والوں کے آنسو میری آنکھوں میں بھر دیے ہیں۔ اتنے میں رئیس کی انا دوڑی آئیں ہم دونوں کو سہارا دے کر گھر لے گئیں۔ دادی اور ماں سوگ واری دیکھ کر دل پر ایسا ناقابل برداشت وزن پڑا کہ میں زمین پر گر پڑا۔ ایڑیاں رگڑنے لگا۔ گریبان پھاڑ دیا..... اور چیخ چیخ کر ہائے میاں ہائے میاں ہائے میاں ارے میں کیا کروں کدھر چلا جاؤں؟ ارے کوئی اللہ کا بندہ مجھ پر ترس کھائے اور مجھ کو میرے میاں کی قبر میں لے جا کر دفن کر دے یہ کہتے کہتے میں بے ہوش ہو گیا۔

میرے مقدمہ تنسیخ نکاح کا فیصلہ

میرے باپ کی موت کو غالباً ایک ہفتے کے بعد مقدمے کا فیصلہ سنا دیا گیا اور

میرے نکاح کو جائز قرار دیتے ہوئے عدالت نے مجھ کو یہ اختیار بھی دے دیا کہ میں چاہوں تو اپنے خسر اور ان کے گواہوں پر حلف دروغی کا مقدمہ بھی چلا سکتا ہوں۔

لے کہتے ہیں وقت سب سے بڑا چارہ گر ہے لیکن میرے باپ کی رحلت پر نصف صدی سے زیادہ مدت گزر چکی ہے لیکن میرا زخم دل مندمل نہیں ہو سکا ہے شرمزاج زندگی کے شدائد و مکروہات کی یورش پیہم میں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ میں اس غم کو بھول چکا ہوں۔ لیکن جب کبھی عمیق تنہائیاں میرے سینے پر زور سے ہات رکھ دیتی ہیں تو میں درد سے تڑپ جاتا ہوں اور سینے کے زخ کی موجودگی کا پتا چل جاتا ہے۔

کئی مہینے کی بات ے کہ اخبار نے بتایا تھا کہ ایک مقام پر ایک سو ساٹھ برس کا کوئی آدمی موجود ہے اس وقت میں نے دل ہی دل میں کہا تھا کاش میاں کو بھی اتنی ہی طویل زندگی ملتی اور وہ اپنے گووں کے پالے ہوئے اس بچے کو بھی بوڑھا دیکھ لیتے اگر مسیح مل جائیں تو میں بچوں کی طرح بلک بلک کر ان سے کہوں اے میرے اچھے حضرت مسیح میرے باپ کو زندہ کر دیجیے:

اگر آں طائر قدسی زدرم باز آید
عمر بگذشتہ بپیرا نہ سرم باز آید

ارے کوئی نہیں جانتا کہ یہ کون ہے جو محبت کے جکڑے ہوئے بے چارے انسانوں پر موت کو مسلط فرما کر اور ہمارے آنسوؤں کو موتیوں کی طرح پرو پرو کر اپنی گردن میں ہار ڈال رہا ہے۔ لاکھوں گھروں کے چراغ بجھا کر جشن چراغاں منا رہا ہے..... اور ہماری آہوں کو مضراب بنا کر اپنا ستار بجا رہا ہے؟

بزم ترا شمع و گل خستگی بوتراب
ساز ترا زیر و بم واقعہ کربلا

فیصلہ سنانے کے وقت عدالت کا کمرہ کھچا کھچ بھرا ہوا تھا یہی نہیں کہ ہم لوگ ہی آب دیدہ تھے میرے مخالفین اور خود میرے خسر بھی بے حد مغموم و پریشان نظر آ رہے

تھے۔

مسٹر شرغا حکم سنا نے بیٹھے تو آنکھوں میں آنسو بھر کر کہنے لگے خاں صاحب کو اس مقدمے کے جیتنے کی بڑی تمنا تھی کاش میں ان کی زندگی میں ہی فیصلہ سنا دیتا..... یہ سن کر اپنے تو اپنے غیروں کی آنکھوں سے بھی آنسو ٹپکنے لگے..... اور مجھ نامراد کو اپنی یہ فتح مندی لاکھوں شکستوں کے پہاڑوں کے نیچے دبی ہوئی محسوس ہونے لگی..... میں نے لاکھ لاکھ ضبط کرنا چاہا مگر ایک دردناک چیخ میرے منہ سے نکل گئی۔ ..... میرے خسر نے جھپٹ کر مجھے سینے سے لگا لیا اور عدالت کا کمرہ مجلس عزا میں تبدیل ہو کر رہ گیا۔

میری شادی بعد از خانہ بربادی

اس فیصلے کے دوسرے دن حضرت مولانا عبدالباری صاحب قبلہ فرنگی محلی میرے پاس تشریف لائے اور فرمایا کہ مجھ کو اپ کے والد گرامی کی ناوقت موت کا بے حد افسوس ہے اور اس بات کا بھی ملال ہے کہ میں نے مقدمے میں آپ کی مخالفت کی تھی۔ مگر اس کے یہ معنی نہیں کہ فرنگی محل پر اپ کے جد امجد نواب فقیر محمد خاں بہادر کے جو احسانات ہیں میں انہیں بھول گیا ہوں۔

اس کے بعد انہوں نے فرمایا کہ میں معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ آپ محمد مقیم خاں (میرے خسر) اور ان کے گواہوں پر مقدمہ چلائیں گے یا نہیں..... میں نے کہا مولانا اس دن کے لیے مجھے خدا نہ رکھے کہ میں مقیم چچا اور ان کے گواہوں پر مقدمہ چلا کر انہیں جیل بھیجنے کی سعی کروں۔ مولانا میری یہ بات سن کر خوش ہو گئے۔ مجھے سینے سے لگا لیا اور کہا آپ کی شرافت سے مجھے اسی جواب کی امید تھی..... اس کے بعد بڑی بزرگانہ ملائمیت کے ساتھ مسکرا کر انہوں نے یہ فرمایا کہ آپ کیا یہ وعدہ بھی کریں گے کہ اپنی بیوی کو شیعہ نہیں بنائیں گے۔ میں نے کہا مولانا دین میں اکراہ کو دخل نہیں ہے۔ میں کبھی ان کو شیعہ ہو جانے پر مجبور نہیں کروں گا۔

چاہیے تو یہ تھا کہ باپ کی موت پر میں کم سے کم پانچ برس تک سوگ مناتا لیکن حالات کی نوعیت اس قدر پیچیدہ اور اس قدر عجلت طلب تھی کہ مجبوراً یہ طے کرنا پڑا کہ جلد سے جلد رخصت کی رسم ادا کر دی جائے۔ اس لیے دسمبر سنہ ۱۹۱۶ء کے آخری ہفتے میں میری شادی کی تاریخ مقرر کر دی گئی۔

میرا سا بد بخت و بدنصیب دولہا اور کون ہو گا شادی کا جوڑا مجھے اس وقت پہنایا گیا جب کہ میرے باپ کا کفن بھی میلا نہیں ہوا تھا۔ اور میرے سر پر اس وقت سہرا باندھا گیا جب کہ میری آنکھوں سے آنسوؤں کی لڑیاں برس رہی تھیں..... میرے پھاٹک کی شہنائیوں کی آوازوں میں نوحے تیر رہے تھے..... میری ہتھیلی کی مہندی کے رنگ سے میرے دل کا خون ابل رہا تھا..... تاشوں کی جھنکار کف افسوس مل رہی تھی۔ اور مجھ نامراد کی شادی کے دوش پر میرے باپ کا جنازہ رکھا ہوا تھا۔

میں جب ہاتی پر بیٹھ کر براتیوں کے ساتھ اپنی سسرال کی جانب روانہ ہوا تو یہ دیکھا کہ میرے باپ سامنے کھڑے ہوئے کہہ رہے ہیں بیٹا شادی مبارک ہو میں نے جان دے کر تیرا سہرا دیکھا ہے اس وقت میں نے اس طرح ہچکیاں روکیں کہ میری پسلیوں میں درد ہونے لگا۔ اور دل سے آواز آنے لگی ہائے میرے باپ ہائے میرے باپ اور میرے سہرے کی مہکیں میرے سینے پر ڈنک مارنے لگیں۔

اے متاع درد در بازار جاں انداختہ
گوہر ہر سودٗ در جیب زیاں انداختہ

؎ میری بیوی آج تک سنی ہیں اور میں نہ شیعہ رہا نہ سنی اور اب مسلمان بھی ہوں کہ نہیں؟ اس کا فیصلہ کون کرے!!

تقسیم جائیداد

میری اس تجویز سے میرے بڑے اور چھوٹے بھائی نے اتفاق کیا کہ سرکاری طور پر نہیں نجی طور پر جائے داد تقسیم کی جائے۔ اور ماتا دین پٹواری کو حکم دیا گیا کہ وہ مساوی

قسم کی تین چٹھیاں بنا دے ۔ جب یہ کام مکمل ہو گیا تو پٹواری وہ چٹھیاں لے کر آیا' اور ان کو تہ کر کے ایک صندوق میں بند کر دیا۔ اور ہم تینوں بھائیوں نے آنکھیں بند کر کے ایک ایک چٹھی اٹھالی ۔

میں نے اپنی چٹھی کھولی تو سمجھ میں نہیں آئی ابرار کے حوالے کر دی اور جب انہوں نے وہ چٹھی پڑھی تو خوشی سے اچھل کر کہنے لگے مبارک ہو شبیر حسن خاں آپ کی چٹھی سب سے بڑھیا ہے ۔ میں نے پوچھا کس اعتبار سے انہوں نے کہا آپ کے حصے میں قلمی باغ آیا ہے ۔ میں نے پوچھا میری چٹھی میں تھانہ بھی ہے؟ ابرا نے کہا ارے یہ آپ کیا پوچھ رہے ہیں؟ اس باغ کی ایک ایک پتی پر ہزاروں تھانے قربان کیے جا سکتے ہیں ۔ آپ کو معلوم نہیں باغ کی فصیل دس دس بیس بیس ہزار روپے کی ہر سال فروخت ہوتی ہے ۔ تھانے میں رکھا ہی کیا ہے ۔ اس کی سالانہ مرمت میں الٹے آپ کی جب سے ہر سال پان چھ سو روپے جایا کریں گے ۔ میں نے کہا ارے تھانے کو تم کیا سمجھتے ہو؟ اس کی چھت سے ایسے ایسے مناظر دکھائی دیتے ہیں کہ آدمی وجد کرنے لگے یہ سن کر بڑے بھائی صاحب نے کہا میں تم کو اپنے بیٹے کے برابر سمجھتا ہوں اپنا دل میلا نہ کرو تھانہ میری چٹھی میں آیا ہے لو بدل لو یہ سن کر ابرار نے چیخ مار کر کہا شبیر حسن خان ارے ایسا غضب نہ کر بیٹھیے گا قوان مجید کی قسم بڑا غضب ناک قسم کا دھوکا کھا جائیے گا ۔ اس بات پر بڑے بھائی صاحب نے ابرار سے ڈانٹ کر کہا کہ تم کون ہوتے ہو ہم بھائیوں کے درمیان ٹانگ اڑانے والے یہ کہہ کر بھائی صاحب نے اپنی چٹھی میری چٹھی سے بدل لی اور ابرار غصے کے مارے وہاں سے اٹھ کر چلے گئے ۔

تھپڑی بج گئی ملیح آباد میں میری اس حماقت کی ۔ لوگوں نے آ کر کہا ارے ہزاروں کی سالانہ آمدنی پر لات مار کے سالے تھانے کو ترجیح دی ۔ تم کیسے آدمی ہو میں نے کہا بھائی صاحب باغ لے کر نہال ہو گئے ارمیں تھانے کے مناظر پا کر باغ باغ ہو گیا ۔ ان کو باغ کی چاندی ملی اور مناظر کا سونا میرے ہاتھ لگا ۔ جب میری یہ بات سنی

تو میرے ایک قرابت دار محمد غنی خاں نے جل کر جواب دیا کہ بھائی شبیر حسن خاں شعر ویر ا میں تو خیر باقی تمام باتوں میں تم مہاقسم کے چوتیے ہو۔

سرکاری ملازمت کی پیش کش

یو پی کے گورنر سر ہارکوٹ بٹلر میرے باپ کے بڑے دوست تھے۔ انہوں نے ان کے انتقال کی خبر سنی تو تار بھیج کر مجھ کو نینی تال بلا بھیجا۔ اور تعزیت کے بعد مجھ سے کہا کہ میں آپ کو بی اے سے مستثنیٰ کر کے سرکاری ملازمت دینا چاہتا ہوں آپ ڈپٹی کلکٹر بنیں گے یا سپیشل میجر کورٹ وارڈ میں نے کوئی جواب نہیں دیا خاموش ہو گیا۔ بٹلر صاحب نے گھڑی دیکھ کر کہا وقت کم ہے آپ جلدی انتخاب کریں میں نے کہا آپ میرے باپ کے دوست ہیں اس لیے میرے چچا ہیں میں آپ کا بے حد شکر گزار ہوں کہ آپ مجھ کو نوکری دینا چاہتے ہیں۔ مگر میں کوئی سرکاری نوکری قبول کرنے پر آمادہ نہیں۔ بٹلر صاحب نے کہا آپ سینئر کیمبرج تک پڑھے ہوئے ہیں انگریزی بھی اچھی بولتے اور جانتے ہیں آپ اس کی پروانہ کریں کہ آپ بخوبی کام چلا سکتے ہیں جلدی بتائیے آپ ان دو پیش کشوں میں کس کو ترجیح دیتے ہیں میں نے کہا جناب والا آپ میرے بزرگ ہیں میں آپ کی پیش کش کو سر آنکھوں سے قبول کرتا ہوں مگر آپ کی حکومت غاصبانہ ہے۔ اس لیے آپ کی نوکری کو اصولاً غلط سمجھتا ہوں۔ میرا یہ فقرہ سن کر بٹلر کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ تنتنا کر کھڑے ہو گئے اور مجھ سے کہا باہر آیئے۔ میں سمجھا کہ باہر جا کر وہ مجھ پر حملہ کریں گے اور حملہ کیا تو میں پٹھان ہوں ڈروں گا نہیں۔ ترکی بترکی جواب دوں گا۔

کمرے سے نکل کر وہ مجھے لان پر لے گئے اور انگلی اٹھا کر کہا۔ دیکھیے یہ یونین جیک جو اس چھت پر لہرا رہا ہے جب اس پہرے کے اوپر سے خون کا دھارا گزر جائے گا اس وقت ہندوستان آزاد ہونے کا خواب دیکھ سکے گا۔ میں نے کہا جناب والا کو میں اپنا چچا سمجھتا ہوں اگر گستاخی نہ سمجھے تو جواب دوں بٹلر نے کہا دیجیے جواب میں نے کہا ہندوستان کی

رگوں میں اس قدر خون ہے کہ اس کے صرف ایک صوبے کا نہیں فقط ایک ضلع کا خون اس پہریرے کو آسانی کے ساتھ غرق کر کے رکھ دے گا۔

۱؎ اس شعر و یر میں تو خیر کی داد نہیں دی جا سکتی خدا بخشے محمد غنی خاں نے کتنی سچی بات کہی تھی ۲؎ یو پی کے موسم گرما کا پایۂ تخت۔

یہ سن کر وہ اور بھی سرخ ہو گئے۔ اور کہا آپ میرے دوست کے لڑکے ہیں اور نوجوان آدمی ہیں۔ اس لیے میں آپ کے ساتھ کوئی سختی نہیں برت سکتا۔ لیکن آپ کو معلوم ہونا چاہیے کہ آپ کی قوم کو ہر فرد ایک جنس فروختنی ہے۔ وہ جس کو چاہتے ہیں پل بھر میں خرید لیتے ہیں۔ میں نے کہا میں اس بات کو تسلیم کرنے پر آمادہ نہیں انہوں نے غصے میں آ کر میرے صوبے کے تین نہایت مقتدر آدمیوں کے نام لے کر مجھ سے کہا ہم آپ کی قوم کے ان تین بڑے آدمیوں کو خرید چکے ہیں۔ آپ ہیں کس خیال میں؟

ان تین اکابر کے نام سن کر مجھ کو پسینہ آ گیا میں گھبرا گیا کہ اب کیا کہوں لیکن پھر سنبھل کر جواب دیا کہ کم سے کم مجھے خریدا نہیں جا سکتا۔ بٹلر یہ سن کر غصے میں بھرے اور مجھ کو غور سے دیکھتے ہوئے کمرے میں چلے گئے اور میں ان سے رخصت ہوئے بغیر گورنمنٹ ہاؤس سے باہر نکل گیا۔

گم نام خطوں کی بھرمار

نینی تال سے میں سیدھا ملیح آباد گیا۔ اپنی اور رئیس احمد کی جائے داد..... بھائی صاحب کی سپردگی میں دے کر رئیس و ابرار سمیت پھر آگرے چلا گیا کہ تعلیم کی تکمیل ہو جائے۔

تھوڑے ہی دن کے بعد گم نام خطوں کا تانتا بندھ گیا۔ کہ آپ اپنی جائیداد اپنے بھائی کے سپرد کر کے بڑی خطرناک غلطی کی ہے۔ وہ آپ کی جائیداد کو خرد برد کر رہے ہیں آپ کے حصے کے درخت کٹوا کر اپنے کام میں لا رہے ہیں اور آپ کے اچھے

اچھے کاشت کاروں کے اپنے محال میں بسا رہے ہیں۔ اور آپ کی آمدنی جوان کے پاس بطور امانت جمع ہو رہی ہے اس سے ہات اٹھا لیجیے وہ آپ کو کبھی نہیں ملے گی۔ اول اول تو میں نے ان خطوط کو کوئی اہمیت نہ دی اور یہ سمجھتا رہا کہ جیسی ملیح آباد کے پٹھانوں کی عادت ہے وہ ہم بھائیوں کو لڑا کر اپنا الو سیدھا کرنا چاہ رہے ہیں۔

لیکن مقیم چچا نے بھی جب اسی نوعیت کا خط لکھا ان گم نام خطوں کی تصدیق کر دی تو مجھے بڑی تشویش پیدا ہو گئی۔ اور مقیم چچا کے خط کے ساتھ تمام گم نام خط بھی ابرار کو دکھا دیے۔

خطوں کو پڑھ کر ابرار نے کہا قرآن مجید کی قسم ان خطوں کا ایک ایک حرف صحیح ہے اتنا کہہ کر ابرار اپنے منہ پر طمانچے مارنے لگے۔ میں نے پوچھا یہ کیا کر رہے ہو؟ انہوں نے کہا اپنے پر لعنت بھیج رہا ہوں کہ جب آپ شفیع احمد خاں کے سپرد اپنی جائیداد کر رہے تھے تو اس وقت میں نہ جانے میرا جی کس کوٹھے میں تھا۔ اور میری عقل کس پھٹکی میں بند ہو گئی تھی کہ میں اس وقت آپ کو اس فعل سے نہیں روکا اپنی اس کوتاہی پر مجھے ایک پرانی بات یاد آ گئی۔ سنتے میں کوٹھا طوائف کسی شادی کی محفل میں گا رہی تھی کہ:

مجھ کو جنگل میں اکیلا چھوڑ کر
قافلہ مضطر روانہ ہو گیا

تو یہ شعر سن کر ایک ہینگ بیچنے والا کابلی پٹھان دھاڑیں مار مار کر رونے اور رو رو کر یہ کہنے لگا کہ جب یہ عورت اتنا زیور پہنے جنگل میں اکیلا رہ گیا تھا اس درخت ہم کہا جا کر مر گیا تھا اس عورت کو نہیں لوٹ سکا۔

ملیح آباد کا قیام اور جائیداد کا انتظام

اس کے بعد میں رئیس وابرار سمیت ملیح آباد پہنچ گیا۔ رئیس وابرار نے پڑھنے لکھنے کی طرف کبھی مڑ کر بھی نہ دیکھا۔ رئیس موسیقی میں غرق ہو گئے۔ ابرار کورٹ آف وارڈ

کے مینجر ہو گئے۔ میں نے ابرار کے بڑے بھائی خواجہ احسن خان کو ضلع دار بنا کر اپنی جائیداد ان کی نگرانی میں دے دی۔ مولانا قدرت اللہ بیگ سے دوبارہ فارسی پڑھنا شروع کر دی۔ اور شاعری کے ساتھ ساتھ انگریزی ادب کا بطور خود مطالعہ کرنے لگا اسی اثنا میں ایک روز میرے برادر بزرگ تشریف لائے اور تین دستاویزوں پر مجھ سے دستخط کر دینے کی فرمائش کی۔ میں نے ان پر پڑھے بغیر دستخط کر دیے تا کہ بھائی صاحب کو یہ گمان نہ ہو کہ مجھے ان پر اعتماد نہیں ہے۔ اس واقعے کے تیسرے روز یہ معلوم کر کے حیرت و عبرت نے میرا احاطہ کر لیا کہ ان دستاویزوں میں دو رسیدیں تھیں اور ایک ہبہ نامہ۔ پہلی رسید تھی میری جائے داد کے ان باون ہزار روپیوں کی جو ان کے پاس جمع اور ان کے ذمے واجب الادا تھے۔ دوسری رسید تھی ان بہتر ہزار روپوں کی جو میرے باپ نے لالہ مادھو پور کو بطور قرض دیے اور لالہ صاحب اب ان کو ادا کر کے بھائی صاحب سے رسید لے چکے تھے۔ اور تیسری چیز وہ ہبہ نامہ تھا جس کی رو سے میں نے تقریباً آدھی جائے داد بھائی صاحب کے نام لکھ دی تھی۔

مقیم چچا اور ابرار نے جب یہ ہولناک خبر سنی تو ان کے پاؤں کے نیچے سے زمین نکل گئی وہ لکھنو چلے گئے اور جب وکیلوں سے مشورہ کر کے آئے تو انہوں نے کہا کہ تم یہ حلف نامہ لگا کر کہ بڑے بھائی کی مروت کے دباؤ میں آ کر تم نے ان رسیدوں اور اس ہبہ نامے پر دستخط انہیں پڑھے بغیر کر دیے تھے مقدمہ دائر کر دو اور مادھو پور کو بھی نوٹس بھیج دو کہ انہوں نے کل روپیہ بھائی صاحب کے حوالے کیوں کیا جب کہ وہ صرف ایک تہائی کے حق دار تھے..... میں نے مقیم چچا اور ابرار کو ہر چند ٹکا سا جواب تو نہیں دیا۔ لیکن اس قدر ٹال مٹول کی کہ آخر کار وہ دونوں سمجھ گئے کہ میں اس اقدام پر آمادہ نہیں ہو سکتا۔

قصر سحر کی تعمیر ۲

اپنے سوتیلے چچا آصف خاں سے میں نے امانی گنج کے میدان میں غالباً دو بیگھے

زمین خرید کر ایک نہایت خوبصورت دومنزلہ کوٹھی بنوائی چوں کہ یہ کوٹھی صرف اس لیے بنوائی گ تھی کہ اس سے طلوع سحر کا جمال دیکھوں اس لیے اس کا نام قصر سحر رکھ دیا۔

وہ کوٹھی ملیح آباد اسٹیشن کے قریب تھی۔ اس کے دائیں بائیں طرف ایک بڑا خوب صورت تالاب تھا اور داہنے طرف ذرا ساہٹ کر ریلوے لائن تھی۔

بھائی صاحب میری فطرت سے واقف تھے کہ میں فرط سعادت مندی سے اور اظہار عقیدت میں آنکھیں بند کر کے دست خط کر دوں گا..... ۲ صد حیف کہ میری نادان بیٹی نے اس کوٹھی کو شہید کرا کے میرے دل کے ایوان کو ڈھا دیا۔ میری ایک بہت بڑی یادگار مٹوا ڈالی اب میں اسے کہاں سے ڈھونڈ کر لاؤں اور اپنے عنفوان شباب کی وارداتوں کو کس جتن سے جگاؤں۔ اے میری بیٹی سعیدہ تو نے میرے دل کو تباہ کر ڈالا

کرم کردی الٰہی زندہ باشی!!

میرے تقشّف کا آغاز

یہ دنیا لفت عجائب سے زیادہ حیرت ناک اور اس کم بخت کے امکانات کا دائرہ کائنات کے دائرے سے بھی وسیع تر ہے۔

ارے ذرا خیال تو کیجیے کہ غالباً سنہ ۱۹۲۰ء میں قصر سحر آتے ہی خدا کا کرنا یہ ہوا کہ میرے سے مادرزاد معصیت کار پر دورہ پڑ گیا اور اس چیز کو جس کو نادان تقویٰ اور دانا بزدلی کا نام سے پکارتے ہیں۔

اس تقوے کا ہلکا سا دورہ سینٹ پیٹرز کالج میں بھی پڑا تھا۔ لیکن اس مرتبہ تو اس میں اس قدر شدت آ گئی تھی کہ میں بڑی سختی کے ساتھ نمازیں پڑھنے اور روزے رکھنے لگا۔

نمازوں کے وقت میں کمرہ بند کر کے عود اور اگر سلگاتا اور اس قدر طویل رکوع و سجود کے ساتھ نمازیں پڑھتا تھا کہ قرون اولیٰ کے سچے مسلمانوں کی روح وجد کرنے

لگتی تھی۔ اور پرہیز گاری کی یہ لے یہاں تک بڑھ گئی کہ قیمتی لباس ترک کر کے موٹے جھوٹے کپڑے پہننے لگا۔ گوشت کھانا اور چارپائی پر سونا ترک کر دیا۔ اور مجھ پر اس حد تک خدا کا قہر نازل ہوا کہ میں نے ڈاڑھی کی سی چیز بھی رکھ لی۔ اور بالکل مولوی خدا بخش نظر آنے لگا۔

قیامت ہے کہ سن لیلی کا دشت قیس میں آنا
کہا حیرت سے اس نے یہ بھی ہوتا ہے زمانے میں

ارے کس بے پایاں حیرت کی بات تھی کہ میرا سا دیوانہ کاکل و رخسار اور سجہ و سجادہ میں گرفتار۔ میرا سا فریفتہ چنگ و عود اور مشق رکوع و سجود..... مجھ سا مرد خواہش اوقات اور گرفتار صوم و صلوۃ..... میرا سا امیر کاخ و کو اور اسیر مسواک و وضو! تفو بر تو اے چرخ گرداں تفو۔

کس قدر سچ کہا ہے میر تقی میر نے

دیر سے اٹھ کے کعبے آیا میر
جس کو چاہے خدا خراب کرے

میں اس زمانے میں پو پھٹنے سے بہت پہلے بیدار ہوا کرتا تھا۔ حافظ کا دیوان گنگنا گنگنا کر پڑھتا پھر نماز فجر ادا کرتا اور تاروں کی سہانی چھاؤں میں نکل جاتا امانی گنج کے لق و دق میدان میں وہاں پہنچ کر چکاروں کی طرح چٹختا چھلانگیں مارتا' صدر پور[۲] کے پودوں کو گلے لگاتا۔ حافظ کے اشعار گنگناتا۔ درختوں پر چڑھ جاتا۔ اور پھر ان سے یہ کہہ کر اتر آتا کہ معاف کرنا میں نے بڑی تکلیف پہنچائی تم کو۔ اور اسی عالم میں گل رنگ آسمان کی جانب جب نظر اٹھاتا تو کیا دیکھتا کہ بڑی لانبی لانبی داڑھیوں کے فرشتے میرے سر پر منڈلا منڈلا کر اسلام علیکم یا لسان الصباح سلام علیکم یا لسان الصباح کے نعرے لگا رہے ہیں۔

اور فرشتے جب سلام کر کر کے بلندیوں کی طرف اڑنے لگتے تھے تو عجیب قسم کی

گھنٹیاں سی بجنے لگتی تھیں چاروں طرف اور فضا میں تیرنے لگتی تھیں یہ آواز۔

دعائے صبح و آہ شب کلید گنج مقصود است
بایں راہ و روش می رو کہ بادل دار پیوندی!

بیعت

اسی زمانے میں کاکوری کے فرشتہ صورت سجادہ نشین حضرت حبیب[3] حیدر شاہ کے ہاتھ پر میں نے بیعت بھی کر لی تھی..... سالانہ عرس کے زمانے میں وہاں بڑی دھوم دھام ہوا کرتی تھی۔ دور دور سے مرید اور قوام آتے تھے۔ اور کھیا قوال جب

---

[1] اور یہ رسم اب بھی جاری ہے [2] ایک مولہ جو میرے مکان سے ڈیڑھ دو میل کے فاصلے پر ہے۔ [3] شاہ صاحب آل رسول کے علاوہ اور کسی کو خاطر میں نہ لاتے تھے۔

گاتا تھا تو در و دیوار جھومنے لگتے تھے۔ اور تاروں کی ہلکی روشنی اور رات کی چھٹتی ہوئی تاریکی میں جس وقت آزادوں[1] کی ٹولی اونچی اونچی ٹوپیاں اور لانبی عبائیں پہنے حضرت تراب علی شاہ کے مزار پر روبرو صفیں باندھ کر حضرت علی کی منقبت میں

اے بادشاہ اولیاء مستاں سلامت می کنند

گانا شروع کر دیتے تھے تو ایسا نظر آتا تھا کہ حجتہ الوداع کے موقع پر رسالت مآب حضرت علی کی مولائی کا اعلان فرما رہے ہیں۔

---

[1] فقراء کا ایک گروہ جو تمام قیود سے آزاد رہ کر مستانہ زندگی بسر کرتا ہے۔



روح ادب

اسی دور میں تصوف و تقشّف میں میری سب سے پہلی سترہ تصویروں والی مصور تصنیف روح ادب[1] غالباً میتھیو ڈسٹ پریس لکھنو سے رفیع احمد خاں کے مقدمے اور حضرت اکبر کی رائے کے ساتھ سنہ ۱۹۲۱ء یا سنہ ۱۹۲۲ء میں شائع ہوئی اور ہاتوں ہات فروخت ہوگئی۔

روح اب پر سب سے پہلے تعریفی تبصرہ کیا تھا میرے اس دور کے اجنبی اور اس دور کے دوست اسرائیل احمد خاں اور میرے اس دور کے مداح اور اس دور کے معترض حضرت مولانا عبدالماجد دریابادی نے..... اور سب سے پہلے اعتراض کیا تھا سجاد انصاری مرحوم نے اس وقت مسٹر عبدالماجد مولانا عبدالماجد کی جانب سفر کر رہے تھے۔ اور کفر سے منہ موڑ کر اسلام کی جانب آ چکے تھے۔ اور سجاد انصاری[2] حلقہ اسلام سے بھاگ کر کفر کی جانب افتاں وخیزاں چلے جا رہے تھے اور فریقین کے مابین یہ غیر تحریری و غیر ملفوظی معاہدہ ہو چکا تھا۔ کہ وہ ایک دوسرے کے خلاف لکھیں اور ایک دوسرے کے ممدوح پر سب وشتم کریں گے۔

اور چوں کہ مولانا عبدالماجد نے اپنی محبت کی بنا پر مجھ کو غالب و ٹیگور کی صف

---

[1] اس کتاب پر لاگت آئی تھی چار روپے فی جلد اور فروخت کی گئی تھی تین روپے فی جلد میں نئی قسم کا تھا بیوپاری۔

[2] میں نے کبھی ان کو دیکھا ہی نہیں حتیٰ کہ ان کا انتقال ہوگیا۔ لیکن ان کے مضامین سے یہ اندازہ ہوا کہ وہ اور زندہ رہتے تو اردو کے فکری ادب میں بہت اچھا اضافہ ہو جاتا۔

میں بٹھا دیا تھا۔ اس لیے سجاد انصاری پر یہ فرض ہوگیا کہ وہ مجھے شیاطین کے

زمرے میں شامل کر دیں۔

اسی زمانے میں میرے محترم بزرگ حضرت اقبال نے بھی ایک طویل خط لکھ کر میری شاعری کی مدح سرائی کی تھی و ر دل کھول کر داد دی تھی۔ اور پنجاب یونیورسٹی سے روح ادب کے تین سو نسخوں کا آرڈر بھی بھجوایا تھا..... اور اسی کے ساتھ ساتھ یہ بھی تحریر فرمایا تھا کہ ہر چند میرے ساغر بالکل نئے ہیں اور ایسے نئے کہ انہیں دیکھ کر غبطہ پیدا ہوتا ہے لیکن ان میں شراب بھری ہوئی ہے وہی پرانی اس لیے مجھ کو چاہیے کہ حافظ اور ٹیگور کی پیروی ترک کر کے فکری شاعری کی طرف آ جاؤں اور حافظ اور خیام کی طرح تھپک تھپک کر سلانے کے عوض انسان کو جگانے کی جانب مائل ہو جاؤں۔

لیکن اس وقت میری تخیل کا دھارا بڑے زور و شور سے تصوف کی پراسرار وادیوں کی جانب دھڑا دھڑ بہہ رہا تھا۔ ان کی نصیحت پر عمل پیرا نہیں ہو سکا تھا۔ لیکن شنیدہ اترے دارد کے طور پر ان کی نصیحت غیر محسوس طریقے سے مجھ پر اثر کرتی رہی اور جب چند ماہ و سال کے بعد میری طبیعت روح ادب کے مزاج سے مختلف ہونے لگی تو تصوف سے روگردانی کر کے میں سیاسی شاعری کرنے لگا۔ اور سیاست سے مڑ کر جس وقت میری شاعری تجسس و تشکک کی جانب گام زن ہو گئی تو میرے ناصح حضرت اقبال کی شاعری اقوال روایات اور عقائد کی طرف چل پڑی..... اور یہ دیکھ کر حیرت ہو گئی کہ جس تصوف اور مابعد الطبیعیات سے انہوں نے مجھے روکا تھا۔ اس پر حرکی کا لیبل لگا کر وہ خود ہی اس کی طرف چلے گئے۔ اور عقل کو بولہب اور عشق کو مصطفٰے کا خطاب دینے لگے اور

السلام اے عشق خوش سودائے ما

کے نعرے لگانے لگے۔

چوں کہ وہ اعلیٰ درجے کے پڑھے لکھے تھے۔ اور بلا کے ذہین انسان تھے۔ اس لیے شروع شروع میں انہوں نے مغرب کے الحاد اور مشرق کے مابین مصالحت کی

بڑے خلوص کے ساتھ کوشش کی۔ لیکن جب ان کی سعی مشکور نہیں ہوئی تھی تو انہوں نے نیٹشے کے مافوق البشر کو مشرف باسلام کر کے شاہین بچہ بنا دیا قرآن کے مرد و لفظ عشق کو آسمان پر چڑھا کر اسے تمام انسانی شرف و مجد کا مرکز تسلیم کیا اور قرآن کے محبوب لفظ عقل کو خاک میں ملا کر اس کو تمام مفاسد کا سرچشمہ ٹھہرا دیا۔ اور میں چیخ اٹھا

چیست یاران طریقت بعد ازیں تدبیر ما؟

میرے تقشّف کا انجام

میں نے تقشّف سے روگردانی کیوں کی؟ اگر آپ یہ ماجرا ایک کٹھ ملا کی طرح سنیں گے تو مجھ پر ہزار صلوتیں بھیجنے لگیں گے۔ اور اگر ایک انسان دوست آدمی کی طرح سنیں گے تو مجھے امید ہے کہ کم از کم میرے دل کی گداختگی کی داد دینے پر ضرور مجبور ہو جائیں گے۔

وہ ماجرا سن کر آپ یہ تو کہہ سکتے ہیں کہ جذبات کی رو میں بہہ کر اور مصلحت خداوندی پر نگاہ نہ کر کے میں نے بہت بڑی ٹھوکر کھائی ہے۔ پرائے شگون پر خاک کٹائی اور اپنی عاقبت خراب کر لی ہے' لیکن اگر آپ کے سینے میں دل ہے۔ اور دل میں دردمند انسانوں کی محبت ہے تو آپ یہ فیصلہ ہرگز نہیں کر سکیں گے کہ ترک عبادت میں میری نیت کافتوریا میرے عدوان کا مادہ کارفرما تھا۔ اب وہ ماجرا سنیے۔

میں ایک روز حسب معمول امانی گنج کے میدان میں ٹہل رہا تھا..... دسمبر کی برفانی ہوائیں اونی واسکٹ کو توڑ کر سینے میں چبھ رہی تھیں۔ فضا اپنی کالی کملی کو اوڑھ لینے کے واسطے جھٹک رہی تھی۔ تھکی ماندی چڑیاں بسیرا لے رہی تھیں دور دور تک اداسی چھائی ہوئی تھی۔ اور آفتاب کے ڈوب جانے کی کراہ فضا پر تھرتھرا رہی تھی۔ کہ میں نے دیکھا کہ ایک کوزہ پشت بڑی بی' لکڑی ٹیکتی اور ریلوے لائن عبور کرتی ہوئی انتہائی دردمندی کے ساتھ میری طرف رینگتی چلی آ رہی ہے۔

ان کا یہ عالم دیکھ کر میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے..... سوچنے لگا کہ یہ چلے کے

جاڑے یہ برف میں جھلا جھپٹیا یہ ہڈیوں کو تراشنے والی ٹھنڈی ہوا یہ اونگھتا چٹیل میدان اور یہ ضعیفہ؟..... آخر کیا بپتا پڑی ہے ان پر کہ یہ اس وقت گرم سفر ہیں..... اس وقت تو کتے بھی گھر سے باہر نکلنے کی جرات نہیں کرتے۔ تیز تیز قدم رکھتا میں ان کے قریب گیا تو دیکھا کہ جس لکڑی کے سہارے وہ چل رہی ہیں اس پر ان کا ہات کانپ رہا ہے اور ان کے ہاتھ کی لٹکتی ہوئی کھال چلنے میں ہچکولے کھا رہی ہے۔ میں نے آگے بڑھ کر کہا بڑی بی سلام انہوں نے میرا سلام سن کر جھکے جھکے جیتے رہو بیٹا کہا اور بڑی دشواری کے ساتھ کمر سیدھی کر کے پوچھا بیٹا تم کون ہو؟ میں نے اپنا نام بتایا انہوں نے میرے نام کو اپنے حافظے میں ٹٹول کر پوچھا بیٹا اپنے باپ کا نام بتاؤ؟ اور جیسے ہی میں نے اپنے باپ کا نام بتایا ان کی بے نور و خشک آنکھوں سے دفعتہً نمی آ گئی۔ انہوں نے اپنے دونوں کانپتے ہاتھوں کی انگلیاں اپنے ماتھے پر چٹخا کر دور سے میری بلائیں لیں اور ہچکیاں لے لے کر رونے لگیں۔ میری آنکھوں میں بھی آنسو بھر آئے اور میں نے دردناک آواز میں پوچھا آپ رونے کیوں لگیں؟ انہوں نے کہا بیٹا کیسے نہ روؤں اللہ بخشے میرے خاوند تمہاری دیوڑھی کے سپاہی تھے..... اللہ کرے خاں بہادر (میرے باپ) کی کروٹ کروٹ حوریں ہوں، ان کی سرکار سے عید بقرعید اور شبرات کے انعام واکرام کے ساتھ ساتھ جڑواں کے نام سے اتنا مل جاتا تھا کہ ہم سب چین سے رہتے تھے۔ ہائے خاں بہادر صاحب کے چھ مہینے کے بعد میرے سرتاج بھی سدھار گئے اور لے دے کے ایک جوان جہان بیٹا تھا وہ بھی خالی کے مہینے میں دغا دے گیا..... بڑی بی سینے پر ہاتھ رکھ کر رونے لگیں اور ان کے چہرے کی جھریوں میں آنسو دوڑنے لگے۔

میں نے کہا بڑی بی آپ میرے گھر چلیں مجھ سے جو کچھ ہو سکے گا آپ کی خدمت کروں گا۔ اور ہر مہینے خدمت کرتا رہوں گا۔ انہوں نے کہا نہیں بیٹا بختیار نگر! میں میری چھوٹی بہن رہتی ہے۔ وہ ہر مہینے مجھے سات روپے دیتی ہے۔ ان روپوں سے

میرا

ملیح آباد کے ایک محلے کا نام

خرچ پانی چل جاتا ہے۔ ایک بوڑھی جان کا پالنا ہی کیا وہ غیور بڑی بی جب کانپتے ہاتھوں سے دعائیں دے کر چلی گئیں تو میرے ایمان کی پنڈلیاں کانپنے لگیں اور یہ سوچ کر کہ یہ ہڈیوں کی مالا بڑھیا فقط سات پلیوں کی خاطر مہینے ڈگ ڈگ کرتی بختیار نگر جاتی ہے میری سانس گلے میں اٹکنے لگی۔ اور اس دردانگیز لمحے میں میری نظر دوڑ گئی اس طرف اللہ کے کروڑوں بندے دردر کی ٹھوکریں کھاتے پھرتے بھوک سے ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مرتے یتیم بچے ایک ایک کا منہ دیکھتے رہتے' بوڑھے باپ جوان بیٹوں کے جنازوں اٹھاتے کم سن بیواؤں کو رنڈ سالے پہنائے جاتے۔ بوڑھی اور بے آسرا بیواؤں کے جوان اور کماؤ بچے ان کی آنکھوں کے سامنے دم توڑتے سانپ انسانوں کو ڈستے درندے ان کی ہڈیاں بھنبھوڑتے سیلابوں میں شہر کے شہر بہہ جاتے' قحط کی شدت سے مائیں جائے بچوں کو بھون بھون کر کھا جاتیں وبائیں سینکڑوں گھروں کو بے چراغ کر دیتیں' زلزلوں کی کروٹوں میں ہزاروں شہر دب دب کر رہ جاتے۔ اور آتش فشاں پہاڑ بے شمار آبادیوں کو راکھ میں تبدیل کر کے رکھ دیا کرتے ہیں۔ اور پھر یہ خیال آ کر میرا سر چکرانے لگا کہ اللہ کی بنائی ہوئی اس دنیا کا یہ عالم ہے کہ یہاں قدرت نے طاقت کو یہ لائسنس دے رکھا ہے کہ وہ ناطاقتی کو کچل ڈالے۔ میری چشم تصور نے یکا یک پھر یہ تماشا دیکھنا شروع کر دیا کہ یزید' شمر' نادر' ہیرو' چنگیز' ہلاکو' مسولینی' اور ہٹلر خون انسانی کے دریاؤں میں اپنی رنگینیوں کے جہاز چلا رہے ہیں فاتح اپنے مفتوحوں کی لاشوں پر قالین بچھا بچھا کر فتح کے جشن منا رہے ہیں۔ جواں مرد احتیاط سے تنگ آ کر بزدلوں کے روبرو جھک رہے ہیں۔ اور بڑے بڑے

اکا طر کو دن سلاطین کے درباروں میں پیٹیاں باندھے کھڑے ہوئے ہیں۔ اور جاہلوں کے دروازوں پر بڑے بڑے علماء بھیک مانگ رہے ہیں..... سقراط کو زہر کا پیالہ دیا جا رہا ہے مسیح کو صلیب پر لٹکا دیا گیا ہے..... محمدؐ کے دانت شہید ہو جانے کے بعد خون بہہ رہا ہے اور محمدؐ کے نواسے حسینؓ کو اس کے بچوں اور ساتھیوں سمیت تپتی زمین پر لٹا لٹا کر پیاسا ذبح کیا جا رہا ہے..... اور یہ سارے تماشے ہو رہے ہیں اس خدائے بزرگ و برتر کی آنکھوں کے سامنے..... جو عادل ہے حکیم ہے، رحیم ہے، رؤف ہے رب ہے اور رزاق ہے۔ اور جو اپنے بندوں سے ستر ماؤں سے بڑھ کر محبت کرتا ہے..... اور اس کے باوجود ٹس سے مس نہیں ہوتا، اور ٹک ٹک دیدم دم نکشیدم کے فشار میں گرفتار ہے.....؟؟ اور ان تمام باتوں پر ایک سانس میں غور کرنے کے بعد زندگی میں وہ پہلا دن تھا کہ خدا کے عادل و حکیم اور رب و رزاق و ہنے سے میرے دل میں شدید بدگمانی پیدا ہو گئی۔ اور جھوٹ کیوں بولوں مجھ کو خدا پر اس قدر غصہ بھی آ گیا کہ میں نے چاروں طرف نظر دوڑائی کہ اگر آس پاس کوئی مسجد ہو تو اسے آگ لگا دوں..... مسجد وہاں تھی ہی نہیں ریلوے لائن کے شوالے پر نظر پڑ گئی۔ میں غصے سے بھرا ادھر گیا اور شوالے کے دروازے پر کھڑے ہو کر اول فول بکنے لگا۔

اسی عالم میں گھر آیا نماز مغرب کا وقت قضا ہو چکا تھا۔ نماز کی عادت نے دل میں انگڑائی لی میں نے کہنی مار کر اس کی انگڑائی توڑ دی۔ اتنے میں باپ کا ایمان لاٹھی چارج کرنے لگا۔ برے جی سے وضو کیا، مصلے پر نظر ڈالی دل نے کہا اٹھا کر پھینک دے اس کو اب باپ اور دادا دونوں مل کر مجھ پر لاٹھی چارج کرنے لگے..... مین ن ے بادل ناخواستہ نماز شروع کر دی۔ رکوع میں خم ہوا تو وہ کوزہ پشت بڑھیا سامنے آ کر کھڑی ہو گئی۔ اب خوب خدا نے ڈانٹ پلائی کہ جھک جا مردود میں جھک گیا اور جوں توں کر کے بوجھل دل کے ساتھ آسمان کو دیکھنے لگا۔

کیا میرا دماغ کفر کی جانب پرواز کر رہا تھا۔ میں یہ سوچ کر لرز گیا پھر میں نے

اپنے دل سے پوچھا کیا میں نعوذ باللہ خدا کے وجود سے انکار کرسکتا ہوں؟ دل نے کہا نہیں ہرگز نہیں۔

اسی کشمکش کے عالم میں کئی مہینے تک اپنے دل و دماغ کو ایک اڑیل ٹٹو کی طرح ڈنڈے مار مار کر نمازیں پڑھتا لیکن ع حالتے رقت کہ محراب بفریاد آمد کی سی کیفیت مفقود ہوگئی۔

بندوں کی دردمندی اور اللہ کی بے مہری کا تصور قومی سے قوی ہوتا چلا گیا۔ اور اسی تناسب سے میری نمازیں بے لطف بے خضوع اور کھوکھلی ہوتی چلی گئیں..... اور میرے ایمان میں اس طرح تنزل ہونے لگا جس طرح رات کی تیرگی منہ اندھیرے کی روشنی میں آہستہ آہستہ کم ہوتی چلی جاتی ہے۔

اس عالم میں جب نماز پڑھتا تو بے شمار انسانوں کی آہیں میرے کانوں میں گونجنے لگتی تھیں۔ اور اس کے ساتھ ساتھ آوازیں آنے لگتی تھیں۔

کیا وہ نمرود کی خدائی تھی
بندگی میں مرا بھلا نہ ہوا

☆☆☆

یا خداوند کارے افتادست
کہ سر بندہ پروریدن نیست

☆☆☆

زندگی اپنی جو اس طور سے گزرے غالب
ہم بھی کیا یاد کریں گے کہ خدا رکھتے تھے

☆☆☆

اس میر سید کہ بر غالب ناکام چہ رفت؟
می تو آں گفت کہ ایں بندہ خداوند نہ داشت

☆☆☆

کفن بیادر و تابوت و جامہ نیلی کن
کہ روزگار طبیب است و عافیت بیمار
مرا زمانہ طناز دست بستہ و تیغ
زند بفرق و ..... گوید کہ ہاں سرے می خوار

☆☆☆

رونا تو اپنی آنکھوں کا دستور ہو گیا
حق نے تو دی تھی آنکھ پہ ناسور ہو گیا

☆☆☆

زندگی ہے یا کوئی طوفان ہے
ہم تو اس جینے کے ہاتھوں مر چلے

☆☆☆

چنداں کہ خدا غنیست مامتاجیم

اور ہر بار میرا جی چاہتا تھا کہ احتجاج کے طور پر نماز توڑ دوں ..... مگر ہمت نہیں پڑتی تھی آخر کار کہاں تک اپنے سے لڑنا ..... ایک روز نماز پڑھ رہا تھا کہ خیال آیا ..... ایسی نمازیں جن میں لب پر آئتیں ہوں اور دل میں شکائتیں کس مرض کی دوا ہو سکتی ہیں۔ یہ خیال آتے ہی ایک توپ سی چلی میرے دل پر دھائیں سے۔ میری کھوپڑی میں ایک چٹاخا پیدا ہا۔ میری عقل میرے سر سے نکل کر پڑی اور میرے سامنے کھڑے ہو کر مجھ کو چونچ دکھانے لگی ..... اور میں نے چٹ سے نماز توڑ ڈالی۔ حجرہ نماز سے دیوانہ وار باہر آیا۔ حجام کو فوراً بلایا داڑھی منڈوا دی۔ موٹے جھوٹے کپڑے اتار کر پھینک دیے اچھا لباس پہن لیا ٹمٹم منگائی اور آدھ گھنٹے میں لکھنو پہنچ گیا لکھنو پہنچتے ہی دن دہاڑے ایک

نازنین کے کمرے میں چلا گیا اور گانا سننے لگا۔ گانا سن کر کھانا کھایا..... ٹنڈے کبابی کے کباب نوش فرمائے وہیں پڑ کر سو گیا..... شام کے قریب حمام کیا گویا عقل کا غسل صحت ہو گیا..... اور آسمان کی طرف آنکھیں اٹھا کر کہا۔

لو بندگی' کہ چھوٹ گئے بندگی سے ہم

اور رات کے گیارہ بجے جب اس نازنین کی گدگدی مسہری پر لیٹا تو وہ کچودارھی کا کہیں تر شاملا جو میرے حجلہ دل میں آ کر بس گیا تھا اپنا مصلے اور اپنے وضو کو بدھنا بغل میں داب کر کھڑا ہو گیا اور مجھ سے تجھ پر خدا کی مار اے مردود کہتا ہوا چلا گیا۔ اور اس ملا کے جاتے ہی میری خواب گاہ میں میرا گم کردہ شاعر

پس از مدت گزر افتاد برما کاروانے را

کے مانند ہنستا ہوا ایا اور آتے ہی اس نے دور کر میرے گلے میں بانہیں ڈال دیں اور گانے لگا

مژدہ اے دل کہ مسیحا نفسے می آید
کہ ز انفاس خوشش بورے کسے می آید

آغاز بادہ خواری

دنیا کی تمام باتوں میں سے دو باتیں خصوصیت کے ساتھ ایسی تھیں کہ لڑکپن ہی سے مجھ کو ان سے شدید نفرت تھی۔ ایک تو ان میں سے تھی بادہ خواری دوسری تھی دروغ گفتاری..... دروغ گفتاری سے اب تک نفرت ہے لیکن بادہ خواری اختیار کر چکا ہوں۔

اس سے پیش تر کہ میں اپنے آغاز بادہ خواری کا ماجرا بیان کروں مناسب یہ معلوم ہوتا ہے کہ بادہ خواری اور دروغ گفتاری کے باب میں چند نکات پیش کر دوں تا کہ آپ کو میرے نظریات کا علم ہو جائے۔

جہاں تک کہ بادہ خواری کا تعلق ہے میں یہ عرض کر دینا چاہتا ہوں کہ ہر چند بادہ

خواری اب میری زندگی کا جزو لاینفک بن چکی ہے۔لیکن اگر بدقسمتی سے میں کسی ریاست کا آمر ہو جاؤں تو اس حقیقت کو پیش نظر رکھ کا شراب کا سا جوہر ناب عوام کے لیے زہر اور خواص اور وہ بھی دیوتا قسم کے خواص کے واسطے اب حیات ہے' میں اس پر اسلحہ کے لائسنس کے مانند یہ کڑی شرط عاید کر دوں کہ جب تک درخواست گزار.....

(۱) اس نوعیت کا میڈیکل سرٹیفکیٹ پیش نہ کر دے کہ اس کی صحت میں اس قدر دم خم ہے کہ وہ شراب کی ایک مقدار معین کا بار کا متحمل ہو سکتا ہے اور اسی کے ساتھ ساتھ کسی ماہر نفسیات کا اس مضمون کا صداقت نامہ بھی حاصل نہ کر لے درخواست گزار کے مزاج میں ہوگا ارحد سے متضاوز ہو جانے کا میلان نہیں ہے۔اور وہ اس قدر دانا پاکیزہ نفس اور شریف انسان ہے کہ پینے کے بعد وہ صحت کی پارے داری اپنی اخلاقی و معاشی حالت کی استواری' اپنی خانگی زندگی کی خوش گواری' اپنے ذہن کی سلیت کی بیداری' اپنے حقوق نفس (مع حقوق عباد) کی آب یاری' اور اپنے معاشرے کی پرسکون ہمواری کو باحسن الوجوہ قائم رکھنے کی بدرجہ اتم صلاحیت رکھتا ہے۔اس وقت تک اس کے نام بادہ خواری کا لائسنس منظور نہ کیا جائے۔

اب رہی دروغ گفتاری سو اس کے باب میں بڑی جسارت سے کام لے کر یہ عرض کرتا ہوں کہ جو لوگ حقیقت کذب سے واقف نہیں۔وہ ہر خلاف واقعہ بیان پر کذب کا لیبل لگا دیا کرتے ہیں۔

میں سمجھتا ہوں کہ ہر دانا انسان کو میرے اس خیال سے اتفاق ہوگا کہ ہر خلاف واقعہ بیان کو جھوٹ کے زمرے میں شمار نہیں کیا جا سکتا اور کلمات حکمت آمیز کو حرف دروغ کا خطاب دینا انسانیت پر بڑا ظلم دھانا ہے میرے نزدیک جھوٹ فقط اسے کہا جائے گا جو سامعین کو دھوکا دے کر کسی شخصیت یا جماعت کو بے جا نقصان یا اپنے ناروا فائدہ پہنچانے یا زیٹ کا مزا اڑانے کے واسطے بولا جاتا ہے۔

لیکن اگر ایسے خلاف واقعہ بیانات پر ہم دروغ گفتاری کا لیبل چسپاں کر دیں

گے تو بڑی احتیاط آمیز نیک نیتی اور انتہائی جذبہ حب انسانی کے ساتھ اس غرض سے زبان پر لائے جاتے ہیں کہ (۱) نادان اور ضدی کی بیماروں کو موت کے چنگل سے بچا لیں..... (۲) فتنوں کا سد باب کر دیں..... (۳) گم راہ یا معاشرے کو صراط مستقیم پر لے آئیں۔ اور (۴) کسی معصوم کے دل کو ٹوٹنے سے بچا لیں تو اس کے یہ معنی ہوں گے کہ ہم تمام محسنان انسانیت اور تمام مصلحین عالم کے تمام عظیم کارناموں پر پانی پھیر دیں گے اور یہ ایک ایسی خطا ہو گی کہ جس کو خیر کی تاریخ اور مصلحین و مبلغین کی روح کبھی معاف نہیں کر سکے گی۔

سو اگر میری جھوٹ کی یہ تعریف تسلیم کر لی جائے تو میں دعوے کے ساتھ یہ کہہ سکتا ہوں کہ میں نے زندگی بھر میں کبھی ایک بار بھی دروغ بانی کا ارتکاب نہیں کیا

اور اگر غیر مفکر عوام میں جس کو جھوٹ کہا جاتا ہے۔ اس کو مان لے تو مجھے اعتراف ہے کہ اپنے اٹھارہ معاشقوں کے دور متلاطم میں اپنی بیوی کے دل کو ٹوٹ جانے سے بچا لینے کی خاطر میں نے اپنے سر پر قرآن رکھ رکھ کر ایک بار نہیں اٹھارہ ہزار بار جھوٹ بولا اور بڑے دھڑلے کے ساتھ بولا۔

اور لوگوں کے معمولی اشعار پر سبحان اللہ ماشاءاللہ کیا خوب فرمایا ہے آپ نے کے نعرے لگا لگا کر اور احباب کی مروت کے دباؤ میں ان کے کلام پر مبالغہ آمیز تبصرے لکھ لکھ کر بڑے زناٹے کے ساتھ آج بھی جھوٹ بولتا رہتا ہوں۔

ہاں تو میں اس توضیحی عبارت آیا اس جملہ معترضہ کے بعد اب سنیے کہ میری بادہ خواری کا آغاز کیوں کر ہوا..... یہ واقعہ غالباً سنہ ۱۹۱۸ء یا سنہ ۱۹۱۹ء کا ہے کہ میں اپنی نانہال دھول پور گیا ہوا تھا اور وہاں میرے ایک دوست سردار مہابیر سنگھ نے میری دعوت کی تھی اور کہا تھا کہ میں چراغ میں بتی پڑتے ہی وہاں پہنچ جاؤں۔

وقت مقررہ پر میں وہاں پہنچ گیا۔ اپنے دوست سردار روپ سنگھ اور سردار تارا چرن کو وہاں موجود پایا۔ میرے آتے ہی بوتل کھول دی گئی۔ اور پیالے بھر بھر کے سب

کے سامنے رکھ دیے گئے۔

چوں کہ مجھ نافہم کو شراب سے سخت نفرت تھی میں پیانے کی میز سے اٹھ کر صوفے پر جا بیٹھا۔ سب نے میری طرف نگاہ اٹھائی اور صوفے پر جا کر بیٹھ جانے کی علت دریافت کی۔ میں نے کہا میں شراب نہیں پیتا۔ تینوں دوستوں کے منہ سے بیک وقت ایک طویل ارے کی آواز نکل گئی۔ رن بیر نے کہا ''ارے شاعر ہو کر تم شراب نہیں پیتے'' می نے کہا شاعر کے واسطے شراب پینا کوئی لازمی امر نہیں میرے اس جواب سے سب کے منہ کھلے کے کھلے رہ گئے۔

روپ سنگھ نے اپنی ناک میں انگلی رکھ کر کہا۔ جمیری جان تم کو یہ بھی آج تک خبر نہیں کہ دیوتاؤں نے سمندروں کو متھ کر یہ سوم رس نکالا تھا۔ فقط کو یوں شاعروں کے لیے۔ ارے کوئی ہو کر شراب نہ پینا پاپ بلکہ مہا پاپ ہے۔ تم کو پینا پڑے گی۔ میں انکار اور وہ تینوں اصرار کرنے لگے۔ بڑی دیر تک جھک جھک ہوتی رہی۔ شور رہا منتیں رہیں ہاتھ جوڑے گئے لیکن جب میں پینے پر کسی طرح آمادہ نہیں ہوا تو میرے میزبان مہابیر سنگھ نے جلدی جلدی بڑے بڑے چار پانچ گھونٹ پی کر سردار روپ سنگھ اور سردار تاراچرن سے کہا تم لوگ شبیر کی چوتیا پنتھی میں وقت برباد نہ کرو اٹھاؤ اپنے جام اور میں ابھی ان کو مہاراج کا تیا پانچا کیے دیتا ہوں۔

یہ کہہ کر انہوں نے اپنا گلاس خالی کر دیا اور میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بڑی دھمکی دے کر پوچھا کیوں جھوٹے کوی صاحب نہیں پیو گے۔ میں نے کہا مہابیر تیرے سر کی قسم مر جاؤں گا پیوں گا نہیں۔ انہوں نے بڑے زعم کے ساتھ اپنے سر کو جھٹکا دے کر کہا اچھا بچا جی ابھی مزا چکھا ئیدیتا ہوں تم کو..... یہ کہا اور کسی بڑے مضبوط ارادے کے ساتھ وہ کھٹ کھٹ کرتے ہوئے سامنے کے کمرے میں داخل ہو گئے..... ان کے جانے کے بعد روپ سنگھ نے میری طرف اشارہ کر کے تاراچرن سے کہا پارٹنر! دیکھ لو گاؤدی ایسے ہی ہوتے ہیں۔ میں نے ان کو گالی دی وہ ہنسنے لگے۔

کوئی پندرہ منٹ کے بعد مہابیر کمرے سے نکلے انہوں نے لپک کر دو جام بنائے ایک جام آدھا ختم کر کے وہ اپنے کمرے کی طرف دیکھنے لگے اور جب چھم کی آواز سنی تو انہوں نے پردہ اٹھایا اور ایک سیکنڈ کے اندر پردے کے تانے بانے سے ایک روشنی سی پھوٹنے لگی اور دوسرے سیکنڈ میں کیا دیکھتا ہوں کہ پیکر انسانی میں ڈھلی ہوئی ایک کڑکتی ہزاروں انوٹوں کے ساتھ چم چھم کرتی اور پتلی کمر یا لچکاتی چلی آ رہی ہے.....اور میرے دل میں فسبح الرعدو بحمدہ کی صدا گونج رہی ہے۔

اف.....وہ سولہ سترہ برس کا سن۔وہ مرادوں کی راتیں مرادوں کے دن۔وہ چھلا سی کمر وہ صراحی دار گردن' وہ کسمسا تا بدن' وہ کھد بداتا جوبن.....وہ سینے کا پاپی ابھار وہ ریشمی پلو کی سطح ناہموار.....گالوں کی وہ کندنی کاغذی جلد' جلد کے نیچے چھنتا اور چہکتا ہوا گلابی رنگ وہ ستواں ناک سجل نقشہ.....دمکتی پیشانی دمکتی پیشانی پر وہ بولتا قشقہ.....نکلتا قد چیختا پنڈا.....سرخ انکھڑیوں سے وہ اٹھتی رنگین گھٹائیں۔لانبی نکیلی پلکوں کی جھپک میں وہ کجری کے کٹتے بول.....سرمے کے دنبالے میں وہ کجلائی ہوئی دھنک.....سانسوں کی موجوں میں وہ کوکتی جوانی.....بکھری زلفوں میں وہ جھولتی ہوئی' بندرابن کی برکھا راتیں.....ہیرے کے باریک قلم سے ترشے ہوئے لب لبوں میں وہ چوم لیے جانے کی تمنا کا ابھار.....اور جھل جھل کرتی چست انگیا کی کٹوریوں میں وہ زیر تعمیر تاج محل کی ہمکار.....ارے دہائی گنبد گردوں کے پروردگار.....اس کو دیکھ کر زلزلہ آ گیا میرے دیا رو جود میں.....خون کی گردش میں ایسا جوار بھاٹا آیا کہ کانوں میں شائیں شائیں کی آوازیں آنے لگیں۔بھاپ سی اٹھنے لگی میرے مسامات سے اور

اِتاش کے رفیق

سر پر آوازمنڈلانے لگی اڑھنیری ساون آیا اڑھنیری ساون آیا۔

اتنے میں وہ بھرے ہوئے ساغر کی طرف گئی پتلی پتلی اور لانبی لانبی سرخ انگلیوں سے اس نے ساغر اٹھایا۔ ایسا معلوم ہوا کہ گویا بلوریں جھاڑ کے قلموں کے حلقے میں قمقمہ روشن ہو گیا۔ ساغر کے خطوں کی نبض چلنے لگی اور صہبا کی موجوں میں بھنور پڑنے لگے۔

پیانے سے منہ لگا کر اسنے دو چار گھونٹ پیے اور اس کے بعد اس نے میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں اس کی مدبھری انکھڑیاں میرے سینے کو توڑ کر میرے دل میں تیر گئیں۔ اور اسیا لگا کہ کوئی چیز میرے گلے سے اتر رہی ہے پھر اس نے آنکھیں جھکا لیں میرے دل مین دونوں وقت گلے ملنے لگے۔ اس نے اپنا ساغر خالی کر کے دوسرا ساغر لب ریز کر لیا۔ اس لب ریز ساغر سے چند قطرے پیے۔ کن انکھیوں سے مجھ کو انکا آنک کر شکاری نظر سے دیکھا اور پیانہ ہاتھ میں اٹھا کر بڑھنے لگی اس کے قدم میرے سینے مین بجنے لگے..... میرے دل میں ٹن ٹن خطرے کی گھنٹی بجی اور آواز آئی ارے بڑا زبردست طوفان ا رہا ہے..... خاں صاحب ہوشیار سونے پر سہاگہ یہ ہوا کہ میری طرف بڑھتے ہوئے اس نے گانا بھی شروع کر دیا۔

اری میں تو لٹ گئی بیچ بجار..... ترکوا نے لوٹ لیا۔ اس کے گاتے ہی تارا چرن نے ستار چھیڑ دیا۔ جھنن جھنن جھن جھان عود کی لپٹوں ستار کے جھالوں اور اس فتنہ دوراں کی تانوں سے در و دیوار جھومنے لگے۔ اور وہ ظالم مجھ سے قریب سے قریب تر ہونے لگی۔ یہاں تک کہ جھالوں اور تانوں میں پیرتی ہوئی وہ بالکل میرے سر پر آ کر کھڑی ہو گئی۔ اور پھر اس قدر قریب آ گئی کہ اس کی ابلتی ہوئی جوانی کی آنچ مجھ کو چھونے لگی اور اس کی کچی عمر کی مہکتی سانس میرے سینے میں چبھنے لگی..... میرے دل سے پھر آواز آئی خاں صاحب..... ہوشیار ہوشیار دشمن سر پر آ پہنچا بغلی ڈوب جاؤ۔ میرے ہاتھ پیر سنسنانے لگے چاہا کہ اٹھ کر بھاگ جاؤں کہ یکا یک وہ ظالم چھپ سے میرے زانو پر آ کر بیٹھ گئی..... ستار پر اور بھی تیزی کے ساتھ جھالا بجنے لگا۔ اور اس

نے جھوٹی شراب کے ساغر کو میرے لبوں سے پیوست کر کے پھر گانا شروع کر دیا ارے پی لے تر کو اشراب میری جھوٹی شراب میری جھوٹی شراب میری جھوٹی شراب ۔اور میں نے آؤ دیکھا نہ تاؤ الا اللہ کا نعرہ مار کر پورا گلاس ایک سانس میں خالی کر دیا میرے ہاتھ سے گلاس لے کر چوما اور پھر اس نے میرے گلے میں بانہیں ڈال دیں ۔ اور اپنے لب میرے لب سے چسپاں کر کے اس طرح الٹی سانسیں لینے لگی گویا وہ میرے تمام وجود کو پی جائے گی۔

جھر جھر جھر تالیاں بجانے لگے تاراچرن' روپ سنگھ' اور مہابیر سنگھ..... ہپ ہپ ہرا کرتے سب میری طرف دوڑ پڑے ۔رن بیر نے سر جھکا کر کہا خاں صاحب بہادر آداب بس رہ گئی ساری شیخی اور پھر دور شروع ہو گیا ستار کے جھالوں میں ۔

بالا بلند ' سرو قدے' سرو نازمن
کوتاہ کرد' قصہ زہد دراز من!

۱ارے میں تو بازار کے بیچوں بیچ لٹ گئی ۔ترک نے لوٹ لیا مسلمان کو ترک کہا جاتا پھر لفظ معشوق کے معنی میں مستقل ہو گیا۔

☆☆☆

میرے عنفوان شباب تک کا ہندوستان

میرے حالات کے ساتھ ساتھ میرے اس ہندوستان کے تہذیبی و معاشرتی حالات بھی سن لیجیے جس نے مجھ کو متاثر کیا اور سانچے میں ڈھالا تھا۔

تہذیبی اعتبار سے اس وقت ہندوستان کے دوراہے پر کھڑا ہوا سوچ رہا تھا کہ مشرقیت پر قائم رہے یا مغربیت کی طرف مڑ جائے؟ ملک اس وقت خالص مشرقی نیم مشرقی اور مغربی ان تین گروہوں میں بٹا ہوا تھا۔

خالص مشرقی گروہ کی اکثریت تھی نیم مشرقی گروہ کی تعداد کم تھی اور مغربی گروہ اقلیت میں تھا۔

خالص مشرقی گروہ کے چہروں پر لانبی یا خشخشی داڑھیاں تھیں اور سروں پر پٹے پٹوں پر عمامے دستاریں شملے یا دوپلی اور چوگوشیا ٹوپیاں۔ پاؤں میں گھتلے یا سلیم شاہی جوتے۔ بڑے پائنچوں کے پائے جامے یا اوربی گھٹنے۔ عبائیں قبائیں انگرکھے دگلے شانوں اور کمروں پر بڑے بڑے رومال چکن کے کرتے روئی کی صدریاں اور ہاتوں میں خاک شفا کی تسبیحیں، انگلیوں میں فیروزے کی انگوٹھیاں ہولا اور شام لگی جریبیں۔

نیم مشرقی گروہ داڑھی منڈاتا شیروانیاں چست پائے جامے پمپ جوتے استعمال کرتا اور جیبوں میں گھڑیاں رکھتا تھا جن کی زنجیریں دونوں جیبوں کے درمیان میں لٹکتی رہتی تھیں۔

اور مغربی گروہ سوٹ بوٹ اور ہیٹ میں غرق رہتا تھا۔ لیکن داڑھی کے ساتھ مونچھیں نہیں منڈاتا تھا۔

فرنگیوں کے نقیب پنڈت مدن موہن مالویہ اور سرسید احمد خان اپنے اپنے چپلی چاپڑوں کے ساتھ مغربیت کے فروغ کے لیے سعی کر رہے تھے۔ لیکن اس وقت ت مشرقیت اس قدر چھائی ہوئی تھی کہ مغربیت ہر چند ابھرنے کے لیے ہاتھ پاؤں مار

رہی تھی۔ مگر قومی مشرقیت اس کا گلا دبائے ہوئے تھی۔ اور سوٹ پہنے جوانوں کو پہلی صاحب کہا جاتا تھا۔

کھیلوں میں بھی ہندوستانی کھیل یعنی گلی ڈنڈا، پتنگ، آتی پاتی، چھلچلی کبڈی، آنکھ مچولی، ست گھڑا، گیل، گولیاں، اندھا مرغا، لنگی گھوڑی، شطرنج اور چوسر..... تیراکی، بانک بنوت، پٹا کشتی ڈنڈ، اور مگدر..... مرگ بازی اور بٹیر بازی اور تیتر بازی کا عام رواج تھا۔ اور فٹ بال ہاکی ٹینس، پنگ پانگ، بیڈمنٹن، تاش اور کرکٹ کو کوئی منہ نہیں لگاتا تھا۔

اسی طرح ڈولیوں پالکیوں، نالکیوں، فنسوں، میانوں، ہواداروں، گھوڑوں، بند گھوڑا گاڑیوں اور ہاتیوں کی سواریوں کے آگے لیندوئیں، ٹمٹمیں، فٹنیں، موٹریں اور سائیکلیں وغیرہ غیر ثقہ سواریاں سمجھی جاتی تھیں مشرقی و مغربی لوگوں کی راتیں بھی ایک دوسرے سے مختلف ہوتی تھیں..... ادھر شام ہوتے ہی نوابوں اور رئیسوں کے محلوں میں جھاڑ فانوس شمعیں اور اکے روشن کر دیے جاتے تھے۔ عود سلگتا عطر دان کھلتے خاص دانوں میں گلوریاں آتیں چاندی سونے کی چمٹیوں سے اٹھا اٹھا کر پان کھائے جاتے معطر حقے اور سٹکیں گڑگڑاتیں..... علمی مباحث، مشاعرے اور مجرے ہوا کرتے تھے۔

ادھر کلبوں میں تاش کھیلے جاتے بیڈمنٹن کی اچھل کود ہوتی پیانو بجتا گراموفون کھڑکھڑاتا۔ سگرٹوں کی بو اڑتی..... کالی پیلی مس سکورایا مسز لیچر مغربی دھنوں میں شور و غوغا کیا کرتی تھیں۔ اور جب پیڑوں سے پیڑو رگڑواتا ڈانس شروع ہوتا تو تو بینڈ چیخنے لگتا تھا اور عمدہ بجانے والوں کو زور زور سے تالیاں بجا کر داد دی جاتی تھی۔ اور ہماری زبان میں وہ سب تالی پٹے ہوئے لونڈے گھیرے بن جایا کرتے تھے ادھر فرش یا چوکیوں پر دسترخوان بچھا کر ہاتھوں سے اور ادھر میزوں پر کانٹے اور چھری رکھ کر چھری کانٹے سے کھانا کھایا جاتا تھا۔ چوں کہ فرنگی تہذیب اس وقت تک مغرب پسندوں کو ہضم نہیں کر سکی تھی۔ اس لیے چھری کانٹوں سے برابر کھٹ کھٹ کی آوازیں

آتی رہتی تھیں گاہ گاہ وہ آلات خوراک تڑ سے فرش پر بھی گر جایا کرتے تھے۔ یا بے گلی مرغ کی ٹانگ اڑ کر کسی کی ناک سے ٹکرا جایا کرتی تھی۔ دونوں کھانوں میں بھی زمین آسمان کا فرق تھا ادھر کے کھانے تھے (۱) قورمہ، قلیا، کوفتے، شامی کباب، سیخ کباب، بوٹی کباب، لگن کباب، آنت کباب، مچھلی کباب، دم پخت کباب، نرگسی کباب، ران کباب مرغ تیتر، کبوتر، بٹیر، شب دیگ، کلے پارے، کھیری سری، بھیجا، کلیجی، گردے، دم پخت بکرے، قیمہ، قیمہ بھرے کریلے، دھوئی ماش کی دال کھڑے مسور کی دال، خاگینہ، چلے ستارے، بھنی رانیں، بریانی، پلاؤ، مرغ پلاؤ، تیتر پلاؤ، بٹیر پلاؤ، بوٹ پلاؤ، اور چکتی پلاؤ وغیرہ۔

---

۱ انگریز ہندوستانیوں کے کلبوں میں آنا توہین سمجھتے تھے اور اپنے کلبوں میں ہندوستانیوں کے داخلے کو خلاف شان خیال کرتے تھے۔ اس لیے دیسی انگریزی کے کلبوں میں اینگلو انڈین لڑکیاں اور عورتیں ہی شریک ہوتی تھیں۔

---

(۲) مٹھائیوں میں حبشی حلوا سوہن پڑی حلوہ سوہن، زردہ، انارکا زردہ، پستے بادام کا زردہ، مزعفر، کھیر، شیر خرما، بچھے، بالائی، میٹھے سموسے، قفلیاں، بالائی کے آب خورے، نمش، پینڈیاں، رساول، گڑ مبا، پیوسی، برفی جلیبیاں، امرتیاں، لڈو، باجرے کا ملیدہ، قلاقند، گلاب جامن، پیڑے، پیٹھا، اندرسے، دندان مصری، شکر پارے، لوز، چٹنیاں اور مربے

(۳) دہی رائیتا، پھلکیاں، دھی دہی بڑے، تلی دالیں..... چلے، تکونے، سموسے، سہال، پاپڑ، نمک پارے، کھچڑیاں، دال موٹ، سیوتلی، اروی، بھرتے، ساگ، تہری، قبولی، خشکہ، گوجھے، منگچیاں اور کھوٹے، چپاتی ورقی چپاتی، دہری چپاتی، پھلکے گردے، خمیری، شیر مال، دوسے لے کر اٹھارہ اٹھارہ پرتوں کے پراٹھے، روغنی روٹی بیسنی روٹی باقر خوانی۔

اور ادھر کا کھانا تھا سوپ، چاپ، کٹلٹ، ابلی مچھلی، ابلا مرغ، ابلے آلو ابلا متر، ابلی ترکاریاں، ڈبل روٹی، مکھن پڈنگ، پیسٹری، آئیس کریم، جیلی، ساس، اور کیک بس اللہ

اللہ خیر سلا۔

ہر چند سر سید گریزہ انگریزی خوانوں میں فرنگی کی نقالی اور پرستاری کا ذوق روبترقی تھا۔ مگر ان کی عورتیں ٹھیٹ ہندوستانی تھیں اور مورے کالا پانی پینے والوں[1] سے ان کو شدید نفرت تھی۔

گھروں میں مغربی فرنیچر کا کہیں نام بھی نہیں تھا۔ وہی پرانے زمانے کی مسہریاں وہی چھپر کٹ وہی نیچے پایوں کے تختوں کے چوکے چوکوں پر مسندیں' قالین' چاندنیاں' گاؤ تکیے میر فرش اگالدان' الائچی دان' پان دان' اور خاص دان' لباس میں بھی وہی قدیم تراش خراش قائم رہی۔ وہ پائنچوں کے کلی دار پاجامے جن کے گوشے چلتے وقت خادمائیں اٹھا لیتی تھیں۔ وہی انگیا وہی کرتی وہی انگیاؤں کی چڑیاں وہی شلوکے وہی دوپٹے وہی دلائیاں اور وہی رضائیاں وہی پرانا تیل پھلیل تھا' وہی کاجل دہی مسی' وہی سرمہ' وہی مہندی' اور وہی افشاں دچلی آ رہی تھی ..... صابون کا رواج بہت کم تھا کھلی بیسن اور ابٹن سے کام لیا جاتا تھا۔

کنواریوں کو بے کلیوں کے سیدھے پاجامے پہنچائے جاتے تھے۔ ان کی ناک میں ایک موتی کی چھوٹی سی نتھنی ہوتی یا نیم کا تنکا۔ اور ان کو پان کھانے مسی لگانے اور افشاں چھڑکنے کی اجازت نہیں تھی۔ اور مانگ نکالنے کے بدلے' ان کے سروں پر مینڈھیاں گوندھی جاتی تھیں۔ جس سے چوخانہ سا بن جاتا تھا۔ اس دور کے زیوروں کے نام بھی سن لیجیے۔

---

[1] شراب کو عورتیں کالا پانی کہتی تھیں۔

---

(۱) سر پر چھپکا (۲) ماتھے پر سراسری ٹیکا سمیت (۳) کانوں میں پتے بالیاں' جھمکے' بالے' بجلی' مگر' بندے' جھالے' انتیاں اور کرن پھول (۴) ناک میں نتھنی بلاق اور کیل (۵) گلے میں طوق گلوبند بدھی زنجیر چنن ہار' دھکدکی' چمپا کلی اور ہیکل (۶) بانہوں میں جوشن نونگے' بازو بند' اکا' اور چھوٹا سا عطر دان (۷) کلائیوں میں کڑے'

چوہے، دتیاں، بانکیں، چوریاں، کریلیاں، پہنچیاں، سمرنیں، کنگن، اور جہاں گیریاں (۸) انگلیون میں چھلے انگوٹھیاں آرسی اور علی بند (جس میں سونے چاندی کی زنجیریں ہوتی تھیں) (۹) پاؤں میں چھاگل، جھانجیں، رام جھول، بچھوے، کڑے، چھلے، لچھے اور پازیب (۱۰) پاؤں کی انگلیوں میں چھلے (جن میں انگوٹھے سے لے کر چھنگلیا تک سونے یا چاندی کی زنجیر ہوتی تھی)۔

نواب صاحب کی بیگم ہوں یا بیرسٹر صاحب کی بیٹر ہاف (Better Half) دونوں بڑی سختی سے پردے کی پابند تھیں۔ ڈولی اور پالکی کے سوا کوئی بی بی گھر سے باہر قدم نہیں رکھتی تھی۔ اور تو اور عورتوں کی آوازیں اور انکا وزن بھی پردہ نشین تھا۔ یعنی کوئی بی بی اس قدر زور سے نہیں بولتی تھی کہ مردانے تک اس کی آواز جا سکے۔ اور جب کوئی خاتون پالکی میں سوار ہوتی تھیں تو پتھر کا ٹکڑا یا سل، پالکی میں رکھ دی جاتی تھی کہ کہاروں کو اس کے جسم کا صحیح اندازہ ہو سکے اور بیبیاں تو بیبیاں مامائیں اور اصیلیں اور لونڈیاں باندیاں تک پردے کی پابند تھیں۔

زنانے میں آنے جانے والے بیرونی بچوں سے بھی جب کہ وہ دس گیارہ سال کے ہو جاتے تھے پردہ شروع کر دیا جاتا تھا۔ اور مشکوک چال چلن کی عورتوں سے بھی پردہ کیا جاتا تھا۔ اروتو اور باپ دادا نانا چچا اور پھپا کے سامنے بھی عورتیں سروں پر پلو ڈال کر جایا کرتی تھیں اور کسی عورت کی یہ مجال نہیں ہوتی تھی کہ وہ اپنے بزرگوں کی موجودگی میں اپنے بچے کو گود میں لے لے۔

زنانے مکان کی فضا کو مقدس رکھنے کا یہاں تک اہتمام کیا جاتا تھا کہ کسی ترکاری والی عورت کو یہ اجازت نہیں تھی کہ وہ لانبی لانبی ترکاریوں مثلاً لوکی، ترئی، کریلے، چچینڈے وغیرہ کو ٹکڑے ٹکڑے کیے بغیر سالم حالت میں اندر لے جائے اس لیے کہ صورت کے لحاظ سے ان ترکاریوں کو فحش ترکاری خیال کیا جاتا تھا۔

اپنے لڑکپن کا ایک واقعہ بیان کرتا ہوں۔ ملیح آباد کے ایک صاحب کے لڑکے کی

شادی پر ناچ ہو رہا تھا کہ بالا خانے سے ایک عورت جھانک کر ادھر دیکھنے لگی۔ اور صاحبان محفل میں سے ایک صاحب نے اس کو بندوق ماردی۔ صاحب خانہ دیگوں کے حلقے میں کھڑے تھے کہ انہوں نے گولی چلنے کی آواز سنی اور دوڑے ہوئے صحن میں آئے۔ گولی مارنے والے خاں صاحب نے ان سے کہا ''بھائی آپ کی بیوی اوپر سے جھانک رہی تھی۔ مجھ سے یہ بے حیائی برداشت نہیں ہوئی میں نے گولی ماردی'' صاحب خانہ نے ان کی پیٹھ ٹھونک کر کہا بہت اچھا کیا آپ نے۔ اور فوراً اندر چلے گئے تھوڑی دیر میں ایک لاش گھسیٹتے ہوئے آئے اور کہا بھائیوں دیکھ لیجے میری بیوی نہیں لونڈی جھانک رہی تھی۔ اللہ نے میری آبرو اور میری جان دونوں چیزیں بچالیں۔

۲۔ سیاسی اعتبار سے اس وقت سناٹا چھایا ہوا تھا۔ پو پھٹنے میں بہت دیر تھی رات کے دو یا تین بجے کا وقت تھا لوگوں کی اکثریت خراٹے لے رہی تھ کچھ بستروں پر پڑے کروٹیں لے اور کنمنا رہے تھے اور بہت تھوڑے لوگ تلک اور گھوکھلے کے گجر سن کر بیدار ہو گئے اور دھیمے سروں میں آزادی کے چرچے کر رہے تھے اور بھارت ماتا چوکنا ہو کر ادھر ادھر دیکھ کر دل ہی دل میں سوچ رہی تھی کہ

از کجامی آید ایں آواز دوست

فرنگی کے کان تک بھی وہ آوازیں پہنچ رہی تھیں۔ اس کا غرور کہہ رہا تھا کہ

یہ ہوا میرے چراغوں کو بجھا نہیں سکتی

لیکن مہاتما گاندھی جس وقت لنگوٹا باندھ کر میدان میں کود پڑے تو پو پھٹ گئی۔ اور ہر طرف سے یہ آوازیں آنے لگیں کہ تخت یا تختہ..... آزادی یا موت..... یا ایوان فرنگی مسمار یا تختہ دار۔

گاندھی کی اندھی نے حکومت کے اوسان اڑا دیے۔ حکومت یہ سوچ کر ہاتھ ملنے لگی کہ ہم نے مسلمانوں کے ایک فرقے کو دوسرے فرقے اور ہندوؤں کے ایک فرقے کو دوسرے فرقے اور پھر بحیثیت مجموعی ہندوؤں اور مسلمانوں کو ایک دوسرے

سے ٹکرا دینے کے سلسلے میں جو لاکھوں روپیہ پانی کی طرح بہایا وہ بے کار گیا' اور سارے مسلمان اور ہندو مل کر آج ہمارے مقابلے کے واسطے آ گئے۔ یہ علامت نہایت خطرناک ہے کیا تدارک کی اجائے اس فتنۂ عظیم کا؟

آخر کا حکومت نے ایک منصوبہ تیار کرلیا..... پولیس اور فوج کے حلقے میں بگل بجا دیا گیا۔ ایک طرف تو جیلون کے دروازے کھول دیے گئے لاٹھیاں برسنے اور گولیاں چلنے لگیں۔ اور دوسری طرف پکڑ بلوایا گیا ہندوؤں اور مسلمانوں کے دینی رہنماؤں یعنی مہامہوپدھیاؤں اور شمس العلماؤں کو جن کو ہندو مسلم فسادات برپا کرا دینے کے لیے برسوں سے گھر بیٹھے وظیفے مل رہے تھے۔ اور بری طرح پھٹکارا گیا ان کو کہ انہوں نے ایسی غفلت کیوں برتی کہ ہندو مسلم اتحاد کا فتنہ برپا ہو گیا۔

اور اس کے ساتھ ساتھ پکارا گیا ان تمام نوابوں رائٹ آنریبلوں خان بہادروں' رائے بہادروں' رئیسوں تاجروں سیٹھوں' سود خواروں' زمین داروں' جاگیر داروں' تعلقہ داروں اور دیسی ریاستوں کے شہریاروں کو' جن کو حکومت سانڈوں کی طرح پالے تھی..... کہ اے پٹھوؤ کانگریس کی طرف اپنی توپوں کے منہ موڑ دو' اور آزادی کے دیوانوں پر اپنے کتے چھوڑ دو۔

اب کیا تھا ہر طرف پکڑ دھکڑ کا ایک طوفان برپا ہو گیا۔ جیلیں بھری جانے لگیں' سولیاں کھڑی کر دی گئیں اور ہر جانب سے غلغلے بلند ہونے لگے۔ کہ خاک میں ملا کر رکھ دو انگریز بہادر کے غداروں کو یہاں تک کہ آگے چل کر جلیاں والے باغ کی زمین خون میں ڈوب گئی۔ اور تڑپ تڑپ کر ٹھنڈی ہونے لگیں لاشیں محبان وطن کی اور آسمان سے آنے لگیں صدائیں

کسے نہ ماند کہ اور اتیغ ناز کشی
مگر کہ زندہ کئی خلق راؤ باز کشی

☆☆☆

قومی تحریک سے وابستگی

یہ واقعہ غالباً سنہ ۱۹۱۸ء کا ہے کہ سب سے پہلے محمد مستقیم[۱] نے مجھ کو گاندھی جی کی شخصیت اور تحریک آزادی کی اہمیت سے آگاہ کر کے کانگریس کے سالانہ اجلاس میں شریک ہونے کے واسطے احمد آباد بھیجا تھا۔ شام کے وقت احمد آباد[۲] پہنچا۔ ایک خیمے میں جا کر ٹھہر گیا۔ تھکا ماندہ تھا کھانا کھا کر سو گیا۔ پچھلے پہر یہ خواب دیکھ ہی رہا تھا کہ میں تخت سلیماں پر بیٹھا آ رہا ہوں کہ میرا خیمہ تانوں سے گونجنے لگا آنکھ کھل گئی۔ گھڑی دیکھی۔ سوا چار کا وقت تھا خیمے کا پردہ الٹ کر باہر آ گیا۔

باہر آتے ہی دیکھا کہ میرے خیموں کے شہر پر سلونی سی گلابی روشنی برس رہی ہے اور سینکڑوں زہرہ جمال گجراتی لڑکیاں پتلی پتلی کمروں میں سرخ سرخ پیٹیاں باندھے اور ہاتھوں میں شمعیں اٹھائے قومی ترانے گا رہی ہیں، اور پوری دنیا چھما چھم ناچ رہی ہے

چہ مبارک سحرے بود و چہ فرخندہ شبے

میں صبح ہوتے ہی مولانا ابو الکلام آزاد کے پاس پہنچا ان کے ساتھ چائے پی انہوں نے ہنس کر کہا ملیح آباد میں آپ نے جو لطیفہ[۳] آپ نے سنایا تھا آج تک اس کا مزا لے رہا ہوں۔

---

[۱] وہ نسلی اعتبار سے انگریز دینی اعتبار سے مسلمان آگرے میں میرے سوتیلے ماموں کے ٹیوٹر، اور بعد کو میرے بھائی محمد یوسف خاں کے سیکرٹری کی حیثیت سے ملیح آباد گئے تھے۔ [۲] اس سفر میں مشیر احمد خاں رام پوری چھوٹے دادا، اور جگنو خدمت گار میرے ساتھ تھا [۳] وہ لطیفہ یہ ہے کہ ایک ایرانی ہندوستان کے آم کھا کر جب شیراز پہنچا تو اس نے وہاں جا کر آموں کی تعریف کے پل باندھ دیے تو اہل شیراز نے پوچھا کیا وہ پھل انگور سیب سے بھی اچھا ہے؟ اور اس ایرانی نے کہا کہ بھرا حمل بہتر تو لوگ اس

کے پیچھے پڑ گئے کہ اس کا مزا بتاؤ۔ مزا بتانے کی چیز ہی کب ہے کہ وہ بتاتا تقاضوں سے تنگ آ کر اس نے کہا آم اس قدر لذیذ تھے کہ کھانے کے بعد یہ محسوس ہوتا تھا کہ گویا علی مرتضیٰ ہیں کہ زبان سے گلے میں اترتے چلے جا رہے ہیں" نعرہ صلوۃ بر محمد و آل محمد۔

مہاتما گاندھی سے پہلی ملاقات

مولانا آزاد کے ساتھ گاندھی جی سے ملا۔ ان کی صورت نے میرے ذوق جمالیات کے منہ پر تڑاق سے تھپڑ مار دیا..... اور میرے دل میں اس وقت یہ بات آئی کہ اس قدر ٹوٹے ہوئے جسم اور اس قدر بگڑے ہوئے چہرے کا آدمی' دنیا میں کر ہی کیا سکتا ہے..... ہندوستان کی آزادی اور گاندھی؟ یہ منہ اور مسور کی دال؟ مایوسی نے مجھ کو ڈھانک لیا۔

لیکن جب مختلف مسائل پر انہوں نے زبان کھولی تو ان کی رائے کی صحت و اصابت اور ان کے لہجے کی پختگی و صلابت نے یقین دلایا کہ ہندوستان کو جس مرد میدان کا انتظار تھا وہ آ گیا ہے۔ اب ہمارے دن بہر جائیں گے۔ گاندھی جی کے پاس پنڈت موتی لال کی صاحب زادی وجے لکشمی سر جھکائے ہوئے بیٹھی تھیں..... اس وقت تک میں نے حسن مغموم دیکھا نہیں تھا۔ میرا دل کانپ اٹھا اور اس سوچ میں پڑ گیا کہ اگر سید حسین سے ان کی شادی ہو جاتی تو کون سی قیامت آ جاتی ہم سب چھپ بھیے ہیں۔ آزادی کے بعد ہم بھی کتوں کی طرح آپس میں لڑتے اور ایک دوسرے کو بھنبھوڑتے رہیں گے

اتنے میں مولانا محمد علی' مولانا شوکت علی مولانا آزاد سبحانی اور پنڈت جواہر لال نہرو آ گئے نہرو نے مجھے گلے لگا لیا۔ اور مجھ کو وہ زمانہ یاد آ گیا جب میں لڑکپن میں اپنے باپ کے ساتھ ان کے باپ کے مکان میں ٹھہرا اور وہاں سب سے پہلے ان کو دیکھا

تھا۔اس وقت وہ بھی قیامت تھے اور میں بھی۔

اس کے بعد ہم سب پنڈال جانے کے لیے باہر آئے..... اللہ اللہ وہ ہندو مسلم اتحاد کا جوش وخروش وہ کوثر و گنگا کی موجیں دوش بدوش..... آنکھوں میں عزائم کے وہ ہونکتے گرداب اور وہ سورماؤں کے گرجتے شباب..... وہ گجراتی والنٹیر لڑکیوں کے جوشیلے گیت' گیتوں میں وہ پیت کی ریت..... وہ امنگوں کا زور وہ ترنگوں کا شور..... وہ جیالوں کی سج دھج وہ نعروں کی گونج گرج..... وہ تمناؤں کے طوفان..... وہ لودیتے ارمان..... وہ گونجتے یمین و یسار..... وہ ٹوٹتی زنجیروں کی جھنکار ایسا محسوس ہورہا تھا کہ ہندوستان کی زمین آسمانوں کی طرف ہمک رہی ہے ہر طرف ایک بجلی ہے کہ لپک رہی ہے۔فرنگی کھڑے سینے کوٹ رہے ہیں۔غرور حکومت کے شیشے چھناچھن ٹوٹ رہے ہیں۔طوفان بن کر آرہا ہے سوراج اور ہندوستان کے سربرہنہ جاں بازوں کے قدموں کی طرف بہتا چلا آرہا یہ برطانیہ کا تاج۔

بکوئے مے کدہ یارب ' سحر چہ مشغلہ بود
کہ شور شاہد و ساقی و شمع مشغلہ بود
حدیث عشق کہ از حرف و صوت مستغنیست
بنالہ دف ونے در خروش و ولولہ بود
مباحثے کہ در آں حلقہ جنوں ری رفت
درائے مدرسہ و قال و قیل مسئلہ بود

کانگریس پنڈال میں قدم رکھا تو حاضرین کے جوش وخروش کو دیکھا اور خون میرے بدن میں تین کروڑ میل فی لمحہ کی رفتار سے گردش کرنے لگا۔

اور تھوڑی دیر میں ہندو مسلم فساد کے سرکاری ایجنٹ مدن موہن مالویہ جب تقریر کرنے کھڑے ہوئے تو تمام پنڈال بپھر گیا اور ہر طرف سے آوازیں آنے لگیں نہیں سنیں گے نہیں سنیں گے بیٹھ جاؤ بیٹھ جاؤ بیٹھ جاؤ۔

آل انڈیا خلافت کمیٹی کا اجلاس

رات کے وقت جب خلافت کمیٹی کے اجلاس میں شریک ہونے کے لیے روانہ ہو کر پنڈال کی پشت سے گزرنے لگا۔ (جہاں روشنی اور آمد و رفت بہت کم تھی) تو میں نے ایک والنٹیر لڑکی کا دیوانہ وار بوسہ لے لیا اور میرے بوسہ لیتے ہی پنڈال سے آواز بلند ہوئی نصر من اللہ و فتح قریب۔

میں نے اس نعرے کو بہت اچھا شگون سمجھا۔ تھوڑی دیر کے بعد خلافت کے پنڈال میں گیا دیکھا کہ مولانا حسرت موہانی اور مہاتما گاندھی کے درمیان بڑی رسہ کشی ہو رہی ہے۔ ایک طرف گاندھی جی اور ان کے دیگر رفقاء اس بات پر مصر تھے کہ سر دست برٹش تاج کے زیر سایہ آزادی طلب کی جائے اور دوسری طرف مولانا حسرت موہانی ہیں جو آزادی کامل کا ریزولیشن پاس کرانا چاہ رہے ہیں۔

حضرت حسرت موہانی کو سب نے لاکھ لاکھ سمجھایا لیکن وہ نہیں مانے ..... اور سیدھے سٹیج کی طرف روانہ ہو گئے۔ اپنا آزادی کامل کا ریزولوشن لے کر ..... اسٹیج اونچا تھا اور حسرت پستہ قد آدمی تھے۔ میں نے سہارا دے کر ان کو اسٹیج پر چڑھا دیا اور جب انہوں نے آزادی کامل کا ریزولوشن پیش کیا تو پنڈال میں ایک ہنگامہ برپا ہو گیا اور میں اس ہنگامے سے اکتا کر اس والنٹیر لڑکی کے پاس پہنچ گیا جو پنڈال کی پشت پر کھڑی میرا انتظار کر رہی تھی۔

جب میں احمد آباد سے روانہ ہونے لگا تو چھوٹے دادا نے (جن کا ذکر آگے آئے گا) کہا بھائی شبیر حسن خاں مجھ کو اجمیر شریف کی زیارت کرا دو ایسے موقعے روز روز نہیں آتے۔ میں نے ان کی بات منظور کر لی ..... اجمیر سے دو چار سٹیشن پہلے ہی ڈسٹنٹ سگنل ڈاؤن نہ ہونے کی وجہ سے گاڑی ایک جگہ رک گئی۔ میں نے دیکھا کہ ایک بلا کی حسین لڑکی سامنے کھڑی ہوئی ہے۔ اس کے حسن نے مجبور کر دیا کہ اس کو پاس سے جا کر دیکھوں۔ میں گاڑی سے اتر کر اس کے نزدیک پہنچ گیا۔ اور اس قدر

مبہوت و مسحور ہو گیا کہ گاڑی رینگنے لگی چھوٹے دادا نے گلا پھاڑ پھاڑ کر آواز دی۔

میں نے پکار کر کہا کہ آپ جائیں اجمیر کے ویٹنگ روم میں ٹھہر جائیں میں دوسری گاڑی سے آجاؤں گا دوسری گاڑی سے شام کے وقت میں اجمیر پہنچ گیا۔ ارجب کھانا کھا کر لیٹنے لگا تو چھوٹے دادا نے کہا بھائی شبیر حسن خاں آؤ زیارت کر آئیں..... میں نے کہا آپ جائیں میں خواجہ صاحب کا مہمان ہوں..... اور

ارمیری نظم جنگل کی شاہ زادی اسی رومانی سفر کی یادگار ہے (وہ بھی اب بوڑھی ہو چکی ہے اف رے سفاک وقت)

جب تک خود میزبان بلانے نہیں آئیں گے میں نہیں جاؤں گا۔ چھوٹے دادا نے مجھ کو اس طرح گھور کر دیکھا جیسے میں کفر بک رہا ہوں۔ اور منہ بنا کر درگاہ چلے گئے۔

حسب دستور کوئی چار بجے میری آنکھ کھلی میں نے شیروانی پہنی اور چاہا کہ جنگو کو جگا کر ٹہلنے کے لیے نکل جاؤں..... لیکن خلاف دستور نیند کا ایسا جھونکا آیا کہ جوتہ اور شیروانی اتارے بغیر چارپائی میں دراز ہو کر سو گیا..... اور اسی عالم میں یہ خواب دیکھا کہ ایک مرد بزرگ میرے سرہانے کھڑے بڑی دل داری کے ساتھ مسکرا رہے ہیں میں نے پوچھا آپ کا اسم گرامی انہوں نے عجیب مشفقانہ انداز سے کہا میرا نام ہے معین الدین اور میزبان کی حیثیت سے آپ کو بلانے آیا ہوں شرط آپ کی پوری ہو گئی اب تو آیئے گا نا؟

میری آنکھ کھل گئی چھوٹے دادا کو جگا کر خواب سنایا ان کو حیرت ہو گئی۔ کہنے لگے بھائی شبیر حسن خاں آپ تو چھپے رستم نکلے..... اس کے بعد ہم دونوں درگار چلے گئے۔

اجمیر سے پلٹ کر جب لکھنو پہنچا غلغلہ سنا کہ ٹیگور ائے ہوئے ہیں۔ ان سے ملنے گیا۔ انہوں نے مجھ کو سر سے لے کر پاؤں تک دیکھنے کے بعد انگریزی میں پوچھا کیا

یہ بات سچ ہے کہ میں ایک نوجوان شاعر کے چہرے کو دیکھ رہا ہوں؟ میں نے سر جھکا کر انگریزی میں جواب دیا شاید انہوں نے میرا نام پوچھا..... جب میں نے اپنا تخلص بتایا انہوں نے ہاتھ بڑھا کر مصافحہ کیا۔ اور کہا یہ عجیب اتفاق ہے کہ کل ہی سروجنی ٹائیڈو نے آپ کی ایک نظم طلوع سحر کا ترجمہ سنایا تھا اور آج آپ سے ملاقات ہوگئی۔ آپ کی نظم لاجواب ہے اور اس کے سننے کے بعد میں اپ کو فرزند سحر گاہ کہہ سکتا ہوں۔

اس کے بعد انہوں نے بتایا کہ میرے باپ فارسی کے بڑے سکالر تھے۔ اور دیوان حافظ ان کے سرہانے رکھا رہتا تھا۔

جب میں رخصت ہونے لگا تو انہوں نے کہا کہ کیا یہ ممکن ہے کہ آپ شانتی نکیتن آ کر کچھ روز کے لیے میرے ساتھ رہیں اور حافظ کی سپرٹ سے مجھ کو بخوبی آگاہ کر دیں؟ میں نے بڑی خوشی کے ساتھ ان کی دعوت قبول کر لی۔ اور جگنو خدمت گار کو لے کر وہاں پہنچ گیا..... اور مطالعے کے لیے بہت سی کتابیں بھی ساتھ لے لیں۔

ٹیگور نے میری بڑی آؤ بھگت کی اور اپنے ایک طالب علم برنی صاحب کے کمرے میں مجھ کو ٹھہرا دیا۔

وہاں کی زندگی بے حد سادہ تھی لیکن گوشت وہاں ہیں کھایا جا سکتا تھا۔ اس کی تکلیف ضرور تھی پھر بھی جگنو چوری چھپے گوشت کرا انتظام کر دیا کرتا تھا۔

صبح کی مشی دونوں وقت کا غسل صبح و شام کی موسیقی اور گھنے درختوں کے سائے میں تدریس وہاں کی زندگی کے اجزائے لاینفک تھے۔

لڑکیوں اور لڑکوں کے میل جول کے معاملے میں ٹیگور کس قدر وسیع القلب تھے اس کا اندازہ اس واقعے سے لگایا جا سکتا ہے کہ ایک روز کسی بوڑھے پروفیسر نے آ کر ایک لڑکی اور ایک لڑکے کے مابین حدود سے متجاوز تعلقات کی جب شکایت کی تو انہوں نے اس سے پوچھا یہ صورت جبر یا تراضی طرفین سے پیدا ہوئی تھی؟ اور جب

اس پروفیسر نے بتایا کہ اس صورت حال میں جبر کا کوئی دخل نہیں تھا تو ٹیگور نے قہقہہ مار کر کہا تو پھر اس میں اعتراض کی کوئی بات نہیں قدرتی تقاضوں کے دھاروں پر بند باندھنا فطرت انسانی کے خلاف نا انصافی ہی نہیں بغاوت بھی ہے۔ آپ شاید بھول گئے لیکن مجھ کو اب تک یاد ہے کہ میں بھی ایک زمانے میں نوجوان تھا۔ یہ باسن کر میں بھی لڑکیوں سے کھل کر ملنے جلنے لگا۔

ہر چند میں تصوف کے دائرے سے نکل کر فکر کی جانب آہستگی کے ساتھ مڑ رہا تھا مگر ٹیگور کی شاعری اس کے باوجود مجھ کو بے حد متاثر کیا کرتی تھی اور میں ان کے ترجمے پڑھ پڑھ کر سر دھنا کرتا تھا۔ اور اب بھی میرے دل میں یہ چور ہے کہ گاہ گاہ صوفیانہ شاعری پر میں وجد کرنے لگتا ہوں۔ اور اس کی شاید یہ علت ہو کہ شاعر کسی منزل میں بھی خشک اور کھردرا فلسفی نہیں بن سکتا۔ اگر میں بنگالی زبان سے واقف ہوتا تو ٹیگور کی شاعری کو سمجھنے کی طرح سمجھ سکتا۔ لیکن مجھے اس کا بے حد افسوس ہے کہ میں نے ان کی شاعری کو انگریزی ترجموں کی وساطت سے پڑھا اور بنگالیوں کی طرح سمجھ نہیں سکا۔

میرا یہ دعویٰ ہے کہ شاعری ایک ایسا جادو ہے جس کا ترجمہ ہو ہی نہیں سکتا۔ شاعری آب گینہ ہے اور ترجمہ گھن شاعری شیشہ ہے اور ترجمہ پتھر شاعری حباب ہے اور ترجمہ ہوائے تند کا تھپیڑا۔

جب شاعری کا ترجمہ کیا جاتا ہے تو اس کا کندن مٹی کا ایک ڈھیر بن جاتا ہے۔ اس کے لالہ وگل پلاسٹک کے پھولوں کا لباس پہن لیتے ہیں اور اس کا شعلہ جوالہ راکھ میں تبدیل ہو کر رہ جاتا ہے۔ میں یہاں تک مان لینے پر تو اپنے اپ کو آمادہ کر سکتا ہوں کہ فکری اور آفاقی مسائل کی شاعری کا تو کسی حد تک ترجمہ نہیں ہو سکتا۔ لیکن شاعری کے اس کھنکتے طلسمی دائرے میں ترجمہ باریاب نہیں ہو سکتا؟ جہاں الفاظ کو ان کے لغوی معنی سے جدا کر کے استعمال کیا جاتا ہے۔ اور ان کے سروں پر بالکل جدید معنی کے

تاج رکھے جاتے ہیں۔ جہاں لہجوں کی ایک ایک کروٹ اور الفاظ کی ایک ایک پرت کے نیچے سے نئے نئے مطالب کے صدہا چشمے پھوٹا کرتے ہیں۔ جہاں مختلف النسل لفظوں کے نقطہ ہائے اتصال سے خیالات کی ایک نئی نسل پیدا کی جاتی ہے۔ جہاں طوائف حرم کو رقص اور رقص کو طواف حرم کے سانچے میں ڈھالا جاتا ہے۔ جہاں اکائی کے میدان میں اعداد کے میلے ہوا کرتے ہیں۔ جہاں دو دو مل کر چار نہیں ہوتے ایک ہو جاتے ہیں..... جہاں دوش نفی پر علم اثبات لہرایا جاتا ہے۔ جہاں تلوار کی دھار سے مرہم ٹپکتا ہے۔ جہاں نشتروں کی نوک سے زخموں میں ٹانکے لگائے جاتے ہیں۔ جہاں سبو کے دستے سے کعبے کا در کھٹکھٹایا جاتا ہے۔ جہاں کانٹے گنگناتے اور پھول کراہتے ہیں۔ جہاں موتیوں سے آنسو اور آنوؤں سے موتی برسائے جاتے ہیں۔ جہاں نازک حبابوں کے گھن سے چٹانیں توڑی جاتی ہیں۔ جہاں بولوں کے کٹاؤ میں کٹاریاں مچلتی ہیں..... جہاں اولوں کے مسامات سے چنگاریاں برستی ہیں..... جہاں ڈوب جانے کے بعد سفینے ابھرتے ہیں جہاں تانوں کے تیشوں سے مجسمے تراشے جاتے ہیں۔ جہاں نوحون کی گود میں راگنیاں پروان چڑھتی ہیں۔ جہاں پلکوں کی نوک پر آسمان تولے جاتے ہیں۔ جہاں ٹکوروں سے فولاد برمایا جاتا ہے۔ جہاں ذہن کے سوپ میں اجرام پھٹکے جاتے ہیں۔ جہاں شعور کی چھلنی میں کائنات چھانی جاتی ہے۔ جہاں فکر کے پروں پر ذات وصفات کو اسایا جاتا ہے۔ جہاں اوس کی بوندوں میں الاؤ روشن کیے جاتے ہیں۔ جہاں آنچ کی لہروں میں زہرا کی کمر لچکتی ہے جہاں ہواؤں کو دیکھا اور صداؤں کو چکھا جاتا ہے۔ جہاں تتلیوں کی دھاریوں پر کرہ ارض کو نچایا جاتا ہے۔ جہاں ایک ایک آن کی ہتھیلی پر کروڑوں صدیاں تھرکتی ہوئی نظر آتی ہیں۔ اور جہاں جزویت اپنے ماتھے پر کلیت کا تاج کج کر کے آفاق کو اپنے چوڑے میں لپیٹ لیتی ہے۔

مترجم جب اس دائرہ رقصاں کی جانب نگاہ اٹھاتا ہے تو اس کے الفاظ کی ہدیاں

بولنے لگتی ہیں۔ اس کی تخیل کے اوسان خطا ہو جاتے ہیں۔ اور اس کے وجود کا ڈورا چٹ سے ٹوٹ کر رہ جاتا ہے۔

کاش نوبل پرائز کے ارباب حل وعقد سے کوئی یہ جا کر کہہ دے کہ اے سخن نا آشنا سو اور اے قدامت پست اندھو! اگر تم ادب کے قدر دان ہو تو شاعر کے کلام کو اسکی زبان میں پڑھو۔ خود نہیں پڑھ سکتے تو اس کے ہم زبان اکابر کی ایک کمیٹی بنا کر اس کے سپرد کر دو کہ وہ اپنی رائے سے تم کو مطلع کرے۔

تمہیں آکر یہ کون سا دماغی مرض لاحق ہو گیا ہے کہ تم شاعری کے جیتے جاگتے جسم کی جانب تو کوئی اعتنا نہیں کرتے۔ اور جب ترجمہ اس گرم جسم کو ٹھنڈی لاش میں تبدیل کر دیتا ہے تو اس لاش کو لم کلیجے سے لگا لیتے ہو..... اے جسم بیزار و لاش نوازو لوگو..... ادب کی دیوی تمہاری بے سوادی پر ماتم کر رہی ہے۔

بات کہاں سے کہاں تک پہنچ گئی ہے۔ خیالات کے دھارے کبھی یوں بھی بہتے ہیں۔ اب پھر آجایئے ٹیگور کی طرف اور چند کلمات ان کی شخصیت کے بارے میں بھی سماعت فرمالیجیے۔

جس طرح بنگالی سے نا آشنا ہونے کی بنا پر میں نے ان کی شاعری کے باب میں ایک مستند نقاد کے مانند کوئی جامع تبصرہ نہیں کر سکتا اسی طرح میں ان کی شخصیت کے بارے میں کوئی بھی قطعی رائے قائم نہیں کر سکتا۔ شخصیت شناسی بڑی جان لیوا چیز ہوتی ہے۔ اور سالہا سال کی بے تکلف ہم نشینی کے بعد بھی اس کا شرمیلا پن کم نہیں ہوتا..... جناب والا ٹیگور یا کسی اور کا تو ذکر ہی کیا مجھ سے اگر آپ یہ پوچھیں کہ تو اپنے کو بھی جاننے کی طرح جانتا ہے؟ تو میں یہ جواب دوں گا کہ ہر چند بچپن سے لے کر اس پرانہ سالی تک علی الاتصال و بہر دقیقہ اپنے ساتھ رہا ہوں لیکن قطعیت کے ساتھ یہ نہیں کہہ سکتا کہ درحقیقت میں ہوں کیا

ہمارے حال کو دنیا بھلا کیا جان سکتی ہے

بسا اوقات جب ہم خود غلط اندازہ کرتے ہیں

اور پھر میں ٹیگور کے ساتھ رہا بھی کتنا۔صرف چھ مہینے اس لیے عرض ہی کیا کر سکتا ہوں۔البتہ اس قدر ضرور کہہ سکتا ہوں کہ وہ بڑے ہی وسیع المشرب، نہایت زندہ دل بے حد شریف حد سے زیادہ بے تکلف، حساس اور جمال پرست انسان تھے۔

لیکن ایک چیز ان میں ایسی تھی جو میرے دل میں کھٹکا کرتی تھی۔اور وہ تھی ان کی نمود و نمائش کی عادت۔میں نے ہمیشہ اس بات کو بری نظر سے دیکھا ہے کہ جب کوئی غیر ملکی انٹرویو کے واسے ان سے ملنے آتا تھا تو اس کے آنے سے بیشتر وہ بن سنور کر ایک نمایاں مقام پر بیٹھ جاتے تھے عود ان کی پشت پر سلگا دیا جاتا تھا۔اور وہ حسین لڑکیوں کو اپنے گرد و پیش کھڑا کر کے یوں انٹرویو دیا کرتے تھے کہ آنے والے کو یہ گمان ہونے لگے کہ وہ کسی پراسرار دیوتا کو دیکھ رہے ہیں۔

بیوی میری مفارقت برداشت نہیں کر سکیں۔شانتی نکیتن ایک تار بھیجا کہ میں اس ہفتے کے واسطے ملیح آباد چلا آؤں۔اس لیے میں نے وہاں اپنا سارا سامان اور ساری کتابیں چھوڑ کر آ گیا ملیح آباد آ گیا اور بیوی نے پھر اسی بری طرح گھیرا کہ میں دوبارہ شانتی نکیتن جا ہی نہ سکا۔اور وہ میرا تمام سامان پھر مجھے کبھی نہیں ملا۔

☆☆☆

ایک خواب

یہ سنہ ۱۹۲۲ء کا ذکر ہے کہ ایک روز شام کے وقت جب میں قصر سحر میں بیٹھا ہوا تھا۔ سامن کی پھولی ہوئی شفق کی رنگینی کی طرف اشارہ کر رہا تھا تو میری بیوی نے مجھ سے کہا دن رات تمہیں انہیں باتوں کی دھن لگی رہتی ہے۔ بھوے سے بھی اپنے گاؤں گراؤں کی خبر نہیں لیتے..... خواجہ حون کو تم نے ضلع دار بنایا ہے اور وہ ایسا دند مچائے ہوئے ہیں کہ اللہ دے اور بندہ لے۔ دونوں ہاتھوں سے لوت رہے ہیں تمہاری رعایا کو۔ ہر طرف مادھولوٹ مچی ہوئی ہے گاؤں گراؤں کا نہ حساب ہے نہ کتاب۔ اور جب تم حساب مانگتے ہو تو وہ باتوں کے طوطے اڑانے لگتے ہیں اور زبانی حساب بتا کر الٹے کچھ روپے تمہارے ہی ذمے نکال دیتے ہیں۔ تم کو دس ہزار دے کر بیس ہزار اپنے ڈب میں رکھ لیتے ہیں۔ یہ کاغذ کی ناؤ آخر لچے گی کب تک؟ میں نے کہا اچھا اشرف جہاں اب میں خود ہی کام کروں گا۔ انہوں نے تنک کر کہا ارے تم اس قابل ہوتے تو پھر یہ رونا کیوں ہوتا۔ تم تو اپنی جائے داد کا ایک بڑا حصہ اور ڈیڑھ لاکھ روپے نقد آنکھیں بند کر کے اپنے بڑے بھیا کی نذر کر چکے ہو۔ اور جو بچا کھچا رہ گیا ہے اس کو بھی کسی کی بھینٹ چڑھا دو گے۔ ڈھاک کے تین پات رہ جائیں گے..... نہ لڑکی کا بیاہ ہو سکے گا نہ لڑکے کی پڑھائی۔

میں نے کہا اشرف جہاں اتنا دل چھوٹا نہ کرو میرے پاس جو کچھ بچ رہا ہے وہ بھی خدا کے فضل سے اس قدر ہے کہ ہم تم بڑے آرام سے زندگی بسر کر سکتے ہیں انہوں نے بگڑ کر کہا سدا اپنے ہی بارے میں سوچتے ہو۔ ارے یہ بھی تو سوچو کہ ہمارے بچوں کا کیا حشر ہوگا؟ میں پوچھتی ہوں کیا ہمارے بچے اپنے باپ دادا کا بھرم قائم رکھ سکیں گے؟

بیوی کی باتیں سن کر میں سناٹے میں آ گیا۔ دل میں کہا کہتی تو ٹھیک ہیں۔ اور وہ پہلا دن تھا کہ عقل معاش میرے سینے میں کسمسائی اور سوچنے لگا۔ اپنی آمدنی اور اپنے

جائے داد کیوں کر بڑھاؤں اور جب خاک کچھ سمجھ میں نہیں آیا تو دل اداس ہو گیا اور چہرے پر بڑی بے کسی برسنے لگی۔

بیوی نے مجھے اداس دیکھا ان کے دل پر چھری چل گئی۔ اور آنکھوں میں آنسو بھر کر کہنے لگیں تم گھبراؤ نہیں..... تم جانتے ہو کہ باوا کو اپنے ہاتھ سے کھانا پکانے کا کتنا شوق ہے اللہ کا دیا سب کچھ ہے۔ مامائیں ہیں اصیلیں ہیں باورچنیں ہیں۔ مگر جب تک وہ اپنے ہاتھ سے کوئی نہ کوئی چیز خود نہیں پکا لیتے' انہیں چین نہیں پڑتا انہیں دیکھ دیکھ کر مجھے اس قدر اچھا پکانا آ گیا ہے کہ میں لکھنو میں کھانے کا ایک ہوٹل کھول لوں گی اور اس سے اتنا پیدا کر کے دکھا دوں گی کہ پشتون تک کاٹے نہیں کٹے گا۔ ہمارے تمہارے بزرگ خالی ایک تلوار لے کر یہاں آئے تھے اور اس تلوار کے زور سے اتنے بڑے محل کھڑے کر کے اپنی بہادری کا لوہا منوا دیا اور میں اللہ نے چاہا تو کف گیر سے سونا اگلوا دوں گی۔

بیوی نے ڈھارس بندھائی..... میرا دل اور بھی مغموم ہو گیا۔ اور دوسرے کمرے میں آ کر بچوں کے مستقبل پر غور کرنے لگا۔ اتنے میں خدا جانے یکا یک کیا لہر آئی کہ میں نعت کہنے لگا۔

اے کہ ترے جلال سے ہل گئی بزم کافری
رعشہ خوف بن گیا ' رقص بتان آذری

نعت کہہ کر کھانا کھایا اور بستر پر دراز ہو کر لحاف اوڑھ لیا۔ نعت سر میں گونجنے لگی بیوی کے خراٹوں نے میرے پپوٹے بوجھل کر دیے۔ فاران کی ہواؤں نے لوری دی اور دو چار کروٹیں بدل کر سو گیا

سو گیا تو پچھلے پہر ایک انوکھا خواب دیکھا..... سچا خواب یا میرے تصورات کا گرداب میں کیا فیصلہ کروں یہ دنیا بڑی حیرت ناک اور پراسرار ہے۔

ہاں تو یہ خواب دیکھا کہ ایک تابناک چہرے کے مرد بزرگ میرے سامنے

کھڑے ہوئے ہیں اور میں چاندان کا طواف کر رہا ہوں۔ میں نے ان کی طرف نگاہ اٹھائی آنکھوں میں خیرگی آئی بار بار میں نے آنکھیں ملیں غور سے ان کو دیکھا۔ پل بھر میں حافظہ جگمگا اٹھا میں پہچان کر ان کے قدموں میں گر گیا اور منہ ملنے لگا ان کے نعلین پر۔ انہوں نے ہاتھوں کا سہارا دے کر مجھے اٹھالیا۔ میں نے روتے ہوئے پوچھا۔ کیا آپ وہ میرے رسول ہیں جنہوں نے اپنا دیدار لڑکپن میں[1] مجھے دکھایا تھا۔ یہ سن کر وہ مسکرائے اور فرمایا ہاں میں وہی تمہارے پہلے خواب کا محمدؐ ہوں۔ یہ سنتے ہی میں ان کے قدموں پر گر پڑا اور ان کی نعلین سے منہ رگڑ رگڑ کر رونے لگا۔

میرے محمدؐ نے فرمایا اٹھ کھڑے ہو۔ میں ہات باندھ کر ان کے روبرو کھڑا ہو گیا۔ انہوں نے کہا تم ہنسنے کے لیے بنے ہو روتے کیوں ہو۔ اور یہ کہتے ہی میری پائنتی کی جانب اشارہ کر کے فرمایا کہ تم اس شخص کے پاس چلے جاؤ میں نے ادھر نگاہ اٹھائی وت یہ دیکھا کہ ایک بادشاہ سر جھکائے اور ہاتھ باندھے کھڑا ہے میں نے کہا یا رسول اللہ یہ کون ہے؟ انہوں نے ارشاد فرمایا..... یہ نظام دکن ہے تم کو دس برس تک اس کے زیر سایہ رہنا ہے۔

یہ سن کر میرا دل یکا یک اس طرح دھڑکنے لگا کہ اس کے ضربات پیہم سے میری آنکھ کھل گئی اور روتے روتے میری ہچکیاں بندھ گئیں۔

---

[1] ایک اسی قبیلے کا خواب پہلے بھی دیکھ چکا تھا جس کا ذکر اوپر آچکا ہے۔

جی بھر کے رو چکا تو بستر سے اٹھا منہ ہات دھونے لگا۔ منہ پر دو چار چھپکے زور زور سے مارے تو حواس بجا ہوئے۔ اور حواس بجا ہوتے ہی ایک بے پایاں حیرت نے میرے تمام وجود کا احاطہ کر لیا۔ اور سر پکڑ کر یہ سوچنے لگا کہ میں نے ایسی اوسر زمین پر مکان بنوایا ہے جہاں دور دور تک کوئی باغ نہیں ہے اور ابھی تک میں نے اپنے مکان

کے اردگرد چمن بندی بھی نہیں کی ہے۔ نہ گھانس ہی لگائی ہے نہ خوشبو دار پودے ہی نصب کیے ہیں! اور تو اور ابھی تک اس مکان کو پھولوں کے گملوں سے بھی نہیں سجایا ہے اور اس کے باوجود ایک نرالی خوشبو میرا احاطہ کیے ہوئے ہے..... اور خوشبو بھی ایسی کہ عطر اور پھول بھی اس کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ آخر یہ طلسم کیا ہے؟ کیا یہ خواب کے اثر کا جادو ہے یا سچ مچ کی خوشبو ہے۔ یہ خیال کر کے میں نے بیوی کو جگایا کہ دیکھوں وہ بھی خوش بو محسوس کرتی ہیں یا نہیں۔

بیوی آنکھیں ملتی ہوئی اٹھیں۔ پوچھا ٹہلنے جا رہے ہو؟ میں نے کہا اور کیا نوکر ہی اس اپات کے ہیں کہ جلدی سے گلوریاں بنا دو بیوی نے اٹھ کر کلیاں کیں پاندان کھولا اور جیسں ہی انہوں نے چونے کی چمچی اٹھائی۔ بگڑ کر مجھے دیکھا اور پوچھا سچ سچ بتاؤ یہ رات کو سوتا چھوڑ کر مجھے کہاں چلے گئے تھے۔ کہ ایسے مہکے مہکائے اور پھولوں میں بسے چلے آ رہے ہو۔ میں نے کہا اللہ اللہ کرو اشرف جہاں اس چٹیل میدان میں کہاں جاؤں گا۔ لکھنو ہوتا تو بات بھی تھی۔ اور میں لکھنو میں بھی کبھی ایسا نہیں کرتا۔ کہنے لگیں اللہ ڈھتائی جوتیوں سمیت آنکھوں میں گھسے جا رہے ہو تمہارے پاس سے ایسی خوشبو کی لپٹیں چلی آ رہی ہیں کہ میں تو تمہارے کپڑوں میں عطر نہیں لگایا تھا۔ پھر یہ نگوری خوش بو کیوں آ رہی ہے۔ یہ کس غیبانی کی خاک میں ملی سیج کی خوشبو ہے؟

میں نے کہا تمہیں جگا کر تو میں گناہ گار بن گیا..... آؤ اور سونگھ کر دیکھ لو میرے کپڑوں کو اگر میرے کپڑوں میں خوش بو ہو تو میں گناہ گار ٹھہر جاؤں گا۔

اظہور علی خان کی کہانی کا ایک بار بار دہرایا ہوا فقرہ جس کا اوپر ذکر ہو چکا ہے۔

وہ میرے کپڑے سونگھنے کو اٹھیں اور سونگھ کر کہا تمہارے کپڑوں سے برابر خوش بو آ رہی ہے۔ اب بھی انکار کرو گے.....؟ میں نے کہا دوسرے کمرے میں چل کر میرے

کپڑے سونگھ لو تب ٹھیک ٹھیک پتا چل جائے گا تم کو..... انہوں نے کہا یہ کیا کہہ رہے ہو؟ میں نے کہا چلی تو چلوں دوسرے کمرے میں پھر یہ سارا ماجرا بیان کر دوں گا..... دوسرے کمرے میں جا کر انہوں نے خوب زور زور سے میرے کپڑے سونگھے بار بار سونگھے اور کہنے لگیں میری سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ کیا طلسم ہے؟ وہاں تمہارے کپڑوں میں خوشبو تھی یہاں بالکل نہیں ہے۔ کیا تم نے کوئی جنتر منتر سیکھ لیا ہے؟ اس کے بعد میں نے ان سے اپنا سارا خواب بیان کر کے کہا کہ یہ اس خواب کا کرشمہ ہے۔ انہوں نے پہلے تو اپنے منہ پر تھپڑ مار مار کر اور کان پکڑ پکڑ کر توبہ کی اللہ مجھے معاف کرے کہ میں نے اس خوشبو کو نگوڑی کہا تھا اور پھر مجھ سے کہا۔ تم کو بڑی بشارت ہوئی ہے۔ میں تم کو مبارکباد دیتی ہوں..... میں نے ان سے کہا تم کچھ نہ بولنا میں گلابو کو اوپر بلاتا ہوں دیکھنا یہ ہے کہ وہ کیا محسوس کرتی ہے۔ میں نے گلابو کو آواز دی۔ وہ اوپر آئی تو میں نے کہا حقہ بھر لاؤ۔ وہ تمباکو نکالنے کے لیے الماری کی طرف بڑھی۔ اور دو قدم چل کر اس نے ایک لانبی سانس لے کر کہا بی بی یہ کھس بو (خوشبو) کیسی آ رہی ہے؟ میں نے ہونٹوں پر انگلی رکھ دی اور اس کو خاموش رہنے کا اشارہ کیا ہو بھونچکا ہو کر مجھے دیکھنے لگی۔ اتنے میں نیچے سے چھوٹے دادا کی آواز آئی..... بھائی شبیر حسن خاں آج ٹہلنے کے لیے نہیں چلیے گا۔ میں نے کہا اوپر آ جائیے حقے کے دو ایک کش ل کر چلیں گے۔ چھوٹے دادا حسب عادت قہقہے مارتے ہوئے اوپر آئے اور ٹوپی تڑ سے تخت پر پھینک دی اور کان کھڑے کر کے گہری گہری سانسیں لینے لگے اور پوچھا بھائی شبیر حسن خاں کی بیوی آج تم نے یہ کیسا عطر لگایا ہے کہ سارا کمرہ مہک رہا ہے۔ ایک پھریری ہمیں بھی دو۔ الغرض کوئی آدھ گھنٹے تک وہ خوشبو میرے کمرے کے اندر مچلتی رہی۔

وہ خواب اور خوش بو کا امتزاج آج تک ایک ایسا معمہ بنا ہوا ہے جس کو میں قطعیت کے ساتھ نہیں سمجھ سکا ہوں۔ ممکن ہے کہ وہ خواب اور اس کے بعد کی وہ خوش بو

میرے آبائی عقائد کی ایک محسوس کیفیت یا میرے شاعرانہ تصورات کی ایک حیرت ناک خلاقی ہو۔ ایسی خلاقی جو حواس کو فریب دے سکتی ہے۔ یا جناب والا یہ بھی ہوسکتا ہے کہ وہ انسان کے اس ابتدائی دور کے تمام قیاسات اور اب تک کے تمام سائنسی انکشافات سے قطعاً مختلف کوئی اور ہی چیز ہو..... بابا اس عالم امکان میں وہ کیا ہے جو ہو نہیں سکتا۔ ہماری اس دنیا کا یہ ہوسکنا پن اور اس کی یہ امکانیت ایک ایسا بے کراں میدان ہے جس کی حد بندی کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔

ہر کس نہ شناسندہ راز است وگرنہ
ایں ہا' ہمہ راز ست کہ معلوم عوام است

☆☆☆

سریر امارت سے حصیر ملازمت کی جانب

اس خواب کے بعد میری ضعیف الاعتقاد بیوی میرے پیچھے پڑ گئیں کہ تم کو رسول اللہؐ نے حکم دیا ہے کہ دکھن جانے کا جاؤ اور جلدی کرو۔

بیوی بے چاری کو تو میں نے کھٹ سے ضعیف الاعتقاد کہہ دیا..... لیکن اپنے گریبان میں منہ ڈالکر یہ بات نہیں سوچی کہ اس وقت بھی کون سا بقراط اعظم تھا یہ سچ ہے کہ میں تقشّف کو ترک کر چکا تھا۔ اور انسان کی دردمندی کو دیکھ کر خدا کی شفقت و رافت سے بھی بدگمان ہو چکا تھا۔ لیکن ان دو برجوں کے گر جانے سے ہوتا کیا ہے۔ دین کی پوری عمارت تو مسمار ہو کر نہیں رہ گئی تھی..... اس لیے میں بھی اس بشارت کے امتحان کی خاطر حیدر آباد جانا چاہتا تھا۔ یعنی بیوی ہی کے دل میں نہیں میرے دل میں بھی چور تھا۔ جو رنگ لائے بغیر نہیں رہا۔

یہ واضح کر دینا بھی ضروری ہے کہ سفر دکن خالی ایک معاشی مسئلہ ہی نہیں تھا بلکہ میری ایک رومانی گتھی بھی ایسی تھی جو حیدر آباد جائے بغیر کھل ہی نہیں سکتی تھی۔

؎ حیدر آباد پہنچ کر میں نے تیرے لیے کی سرخی سے ایک نظم کہی تھی جس کے دو تین شعر پڑھ کر آپ کو میرے اس رومان کا پتا چل جائے گا۔

دیکھ کر کیوں جی رہا ہوں دل ربا تیرے لیے
ہر نفس ہے اک حدیث کربلا تیرے لیے
پھیر لیں آنکھیں مناظر سے ملیح آباد کے
لکھنو کی چھوڑ دی آب و ہوا تیرے لیے
مانگتا ہوں بھیک درویشوں سے تیرے واسطے
شاہ کے کوچے میں دیتا ہوں صدا تیرے لیے

(مطبوعہ نقش و نگار سنہ ۱۹۳۶ء)

ہر چند حیدر آباد جانے کی بات میرے دل میں ٹھن چکی تھی مگر سوچتا تھا کہ وہاں مجھے پوچھے گا کون۔ نہ ایم اے ہوں نہ صدر الافضل لے دے کے میری صرف ایک کتاب روح ادب چھپ کر مقبولیت حاصل کر چکی ہے۔ مگر ایک ٹٹروں ٹوں کتاب سے ہوتا ہی کیا ہے..... ایک کتاب..... ایک کتاب کی اشاعت و مقبولیت سے کہیں شخصیت بنا کرتی ہے۔ شخصیت تو بنتی ہے ایک جگ بیت جانے سے اور سالہا سال خون جگر تھو کنے کے بعد۔ اور پھر یہ بھی خیال آتا ہے کہ میرا مزاج بہت ہی نازک نوکری کا ننگ برداشت ہوگا کیوں کر۔ اور اقربا اور احباب بھی یہی مشورہ دیتے تھے کہ اس خبط سے دست بردار ہو جاؤ اور اگر ایک مہینے کے اندر نظام دکن کو گالیاں دے کر واپس نہ آ جاؤ تو جو چور کی سزا ہے وہ ہماری یہ تمام باتیں سچائی کے عنصر سے خالی نہیں تھیں..... لیکن میری بیوی اور خود میرا دل حکم دے رہا تھا کہ حیدر آباد جائے بغیر دم نہ لے۔

الغرض عثمانیہ یونیورسٹی کے پروفیسر وحید الدین صاحب سلیم سے خط و کتابت کر کے اور مہاراجہ کشن پرشاد کے نام حضرت اقبال مولانا عبدالماجد دریابادی حضرت اکبر الہ آبادی اور مولانا سلیمان ندوی سے سفارشی خط حاصل کر کے میں سنہ ۱۹۲۴ء کے اوائل میں حیدر آباد[1] پہنچ گیا۔

---

[1] میرا رخت سفر جب گھر سے باہر جانے لگا تو ایسا معلوم ہوا کہ عزت آباد کا جنازہ اٹھ رہا ہے۔ اور میری ماں نے جب یہ بین کیا کہ اے میرے قبر میں سونے والے سرتاج آؤ دیکھو کہ تمہارا نازوں پر پلا بچہ نوکری کرنے باہر جا رہا ہے۔ تو گھر بھر میں پٹس پڑ گئی۔ اور جب آہ و فغاں کے شور میں سب سے گلے مل مل کر میں رخصت ہونے لگا اور آداب خاندان کے جبر سے بیوی کو گلے نہ لگا سکا تو ان کی ڈبڈبائی آنکھوں نے مجھ سے کہا ہم سے گلے نہیں ملے۔ میں نے اداسی کے ساتھ آنکھیں جھکا لیں اور جب

اپنے دھڑکتے دل پر قدم رکھتا باہر آیا تو تمام نوکر چاکر بھی رونے لگے۔ اور جب ملیح آباد سے ریل چلی۔ باپ کی رندھی ہوئی آواز آئی اے میرے لاڈلے بیٹے اللہ تیرا نگاہبان۔ ہائے کیا کروں۔ موت نے بیکس کر دیا ہے تجھ کو روک نہیں سکتا۔ اور اسی کے ساتھ ساتھ میرے دادا کے باغوں نے جھک جھک کر مجھے سلام کیا۔ اور سرزمین وطن نے گریبان پھاڑ کر خدا حافظ و ناصر کا نعرہ لگایا۔ اور میں کلیجہ مسوس کر رہ گیا اور حزیں کا یہ شعر زبان پر جاری ہو گیا۔

بنو میدِ حزیں از کوئے او بار سفر بستم
خدا صبرے کند روزی دلِ امید وارم را

(میں نے ایک اور نظم اسی زمانے میں الوداع کے نام سے کہی تھی جو نقش و نگار میں موجود ہے اسے پڑھ کر میری اس وقت کی حالت کا صحیح اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔)

1 حیدر آباد میں سب سے پہلے، مہاراجہ کشن پرشاد سے ملا مجھے دیکھتے ہی، انہوں نے کہا جوش صاحب آپ کا مجموعہ کلام ''روح ادب'' دیکھ کر میں نے تمنا کی تھی کہ اللہ اس درویش صفت رئیس زادے سے ملائے، سو میری وہ تمنا آج پوری ہو گئی۔ میں نے وہ سفارشی خط پیش کئے، انہیں پڑھ کر، وہ کچھ سوچنے لگے، اور تخلئے میں لے جا کر، مجھ سے کہا جوش صاحب یہ بات اپنے تک رکھئے گا کہ میں آج کل سرکار کا معتوب ہو چکا ہوں، اگر آپ میرے زمانے میں تشریف لاتے تو میں اسی دن آپ کا انتظام کر دیتا۔ بہر حال میں فنانس منسٹر اکبر حیدری کے نام ابھی خط لکھے دیتا ہوں، وہ مجھے بہت مانتے ہیں، مجھے یقین ہے کہ وہ آپ کی خدمت میں کوتاہی نہیں کریں گے یہ کہتے ہی کوئی تین صفحوں کا لمبا چوڑا خط لکھ کر میرے حوالے کر دیا اور فون کر کے اسی وقت انہوں نے حیدری سے میری زبردست سفارش بھی کر دی اور اسی کے ساتھ ساتھ، سر راس مسعود کو بھی فون پر ہدایت کر دی کہ وہ مجھ کو اپنے ساتھ لے جا کر، حیدری سے ملا دیں راس مسعود مجھے حیدری کے پاس لے گئے اور کہا کہ یہ ہماری قوم کے ایک ابھرتے ہوئے

شاعر ہیں ہمارا فرض ہے کہ ہم ان کی حوصلہ افزائی کریں، آپ کے دوست حضرت اقبال نے بھی ان کی بڑی زبردست سفارش کی ہے، اور مہاراجہ نے بھی یہ خط آپ کو بھیجا ہے۔۔۔۔۔ حیدری صاحب نے خط پڑھ کر کہا ان کے متعلق مہاراجہ مجھ کو فون بھی کر چکے ہیں اور پھر میری طرف منہ کر کے حیدری صاحب نے کہا آپ آئندہ جمعرات کے دن، صبح دس بجے میرے پاس آ جائیے گا میں آپ کو سرکار سے ملا دوں گا۔2

1 حسن اتفاق سے اس وقت مہاراجہ کے دربار میں سید محمد حسین صاحب، صدر محاسب، نواب بہادر جنگ، نواب اکبر یار جنگ، نواب قادر نواز جنگ، نواب مہدی یار جنگ، اور سر امین جنگ موجود تھے جو آگے چل کر میرے بہت گہرے دوست بن گئے اور میرے بہت کام آئے۔

2 ہر چند حیدری صاحب کے اس وعدہ سے مجھ کو بڑی خوشی ہوئی تھی، مگر وہ جو کہاوت ہے کہ بکری نے دودھ دیا، سو وہ بھی مینگنی بھرا، مجھے ان کے لہجے سے بڑی تکلیف ہوئی تھی کہ وہ ''میں'' کے لفظ کو ''یکسرہ میم'' ادا کر کے بکریوں کی طرح ''میں'' ''میں'' کر رہے تھے اور میں دل ہی دل میں کہہ رہا تھا کہ اللہ نے میری کشوکار کی صورت نکالی تو مگر ایک بکری کی معرفت خوب جانتا ہوں کہ درحقیقت لہجے اچھے ہوتے ہیں نہ برے، ان کا اچھا یا برا لگنا مبنی ہوتا ہے کانوں کی موروثی عادت پر، اور ہم جس لفظ کا تلفظ بچپن سے جس

ابھی جمعرات میں دو دن باقی تھے کہ حیدری صاحب نے مجھے بلا بھیجا راس مسعود بھی وہاں موجود تھے نہایت نفیس چائے پلائی اور ادھر ادھر کی باتیں کر کے انہوں نے مجھ کو ان قطعات کا ایک بنڈل دیا، جو شاعروں نے ان کے خطاب ''سر'' کی مبارکباد کے طور پر کہہ کر، ان کی خدمت میں پیش کئے تھے میں وہ قطعات پڑھ چکا تو حیدری نے کہا جوش صاحب آپ بھی ایک ''کتا'' قطعہ کر دیں۔

ایک طرف تو لفظ ''قطعہ'' کو ''کتا'' سن کر میں بھنا گیا، اور دوسری طرف چونکہ میں فرنگی حکومت سے بیزار تھا میرے چہرے کا رنگ متغیر ہو گیا۔۔۔۔

حیدری صاحب نے مجھ سے پوچھا آپ یکا یک اس قدر سیریس (Serious) سنجیدہ کیوں ہو گئے میں نے کہا آپ برا نہ مانیں تو کہوں کہ فرنگی جس شخص کو خطاب دیتا ہے اس پر ماں کی گالی پڑ جاتی ہے یہ سن کر راس مسعود اور حیدری چراغ پا ہو کر کھڑے ہو گئے، مجھ کو تنہا چھوڑ کر، دوسرے کمرے میں چلے گئے، اور میں اپنی قیام گاہ کی جانب روانہ ہو گیا۔1

جب یہ بات سنی تو نواب مہدی یار جنگ میرے پاس آئے اور کہا کہ میں آپ کو اپنے

طور پر سنتے آتے ہیں، جب وہی لفظ بدلے ہوئے لہجے میں سنتے ہیں تو ہم کو تکلیف ہوتی ہے لیکن یہ سب کچھ سمجھنے کے باوجود آج بھی کوئی شخص لفظ ''ادب'' کی دال کو ساکن کر کے ''ادب'' یا گاڑی کو ''گڈی'' کہتا ہے تو بے ساختہ جی چاہتا ہے کہ اس کو اٹھا کر دے ماروں یہ بات فقط لبھوں تک محدود نہیں عقائد کے میدان میں بھی ہمارا یہی عالم ہے کہ جب ہم اپنے موروثی عقائد کے خلاف کوئی بات سنتے ہیں تو بگڑ جاتے ہیں حالانکہ عقائد ذہن انسانی کے موروثی عادات کے سوا اور کچھ ہوتے ہی نہیں۔

یہ دنیا ذہن کی باڑی گری معلوم ہوتی ہے
جہاں جس شے کو جو سمجھو وہی معلوم ہوتی ہے!!

1 ذرا دیکھئے تو میری دانائی، ارے ملازمت کی خواست گاری اور اس پر یہ برہنہ گفتاری سچ کہا تھا خدا بخشے محمد غنی خاں نے کہ بھائی شبیر حسن خاں، شعر، ویر، میں تو خیر، باقی اور تمام باتوں میں تم مہاتما قسم کے چوتیے ہو۔

والد نواب عماد الملک کے پاس لے جانا چاہتا ہوں میرے والد، سفارش کے

معاملے میں اس قدر سخت ہیں کہ جب میں کیمبرج سے امتحان پاس کر کے آیا تھا تو انہوں نے میری سفارش تک سے انکار فرما دیا تھا۔ بہر حال میں آپ کو ان کے پاس لئے چلتا ہوں، ہر چند، مشکل سے، دو فیصد امید ہے لیکن اگر انہوں نے سفارش کر دی تو حیدر صاحب کی لاکھ سفارشوں پر بھاری ہو گی۔

ان کے ساتھ وہاں پہنچا تو دیکھا کہ ایک اسی پچاسی برس کے مرد بزرگ، برآمدے کی بڑی سی آرام کرسی پر دراز ہیں اور ان کے چہرے پر علم و فضل اور مضبوط کردار کا جلال برس رہا ہے مہدی صاحب نے میرا تعارف کیا؟ اعتناء کی ایک دھاری بھی ان کے چہرے پر نہیں دوڑی، میرے دل پر زبردست چوٹ لگی، لیکن پی گیا۔۔۔۔ میری اہمیت ظاہر کرنے کے لئے، مہدی صاحب نے کہا ابا یہ جوش صاحب حسام الدولہ تہور جنگ نواب فقیر محمد خاں گویا کے پوتے ہیں یہ سن کر وہ چونک پڑے اور کہنے لگے شمالی ہندوستان کا وہ ایسا کون باشندہ ہے جو ان کے دادا کے نام سے واقف نہ ہو لیکن ان کی ذات میں بھی کوئی جوہر ہے؟ مہدی صاحب نے کہا یہ بہت اچھے شاعر ہیں، آپ اجازت دیں تو جوش صاحب کچھ سنائیں۔

انہوں نے کہا اچھا۔۔۔۔ مہدی صاحب نے مجھ سے کہا جوش صاحب ارشاد

اور جب میں نے اپنے ایک مسدس کے تین چار بند سنائے۔

تو وہ اٹھ کر بیٹھ گئے اور کہنے لگے اس نوجوان میں تو انیس کی روح بول رہی ہے، یہ عمر، اور اس قدر پختگی۔۔۔۔۔ میں تو سمجھتا تھا کہ آج کل کے نوجوانوں کی طرح یہ بھی آئیں بائیں شائیں کہتے ہوں گے مگر ان کے کلام میں تو روانی بھی ہے، اور معانی بھی مہدی خط لکھنے کا کاغذ لاؤ، مہدی صاحب کی باچھیں کھل گئیں، جلدی سے، اندر جا کر کاغذ و قلم لے آئے آرام کرسی کے دونوں ہتوں پر، ایک تختہ رکھ دیا۔۔۔۔ نواب عماد الملک نے، پورے ایک صفحے کا سفارشی خط لکھا، اور کہا کہ مہدی تم نے یہ خط سر امین جنگ کے حوالے کر کے، میری طرف سے کہہ دینا کہ سرکار کے روبرو پیش کر دیں۔

نواب عماد الملک کے مکان سے گیسٹ ہاؤس آیا ''چھوٹے دادا1'' نے تار دیا تار کھول کر پڑھا تو معلوم ہوا کہ میری بیوی پرسوں شام کی گاڑی سے حیدرآباد آرہی ہیں میں حیران ہوگیا کہ آخر یہ ماجرا کیا ہے ملازمت تو درکنار، میں نے ابھی تک تو نظام کو دیکھا بھی نہیں ہے اور بیوی ہیں کہ چلی آرہی ہیں۔

لیکن میں کرہی کیا سکتا تھا تیسرے دن میری بیوی، دونوں بچوں اور اپنے ماموں کو ساتھ لئے حیدرآباد آگئیں اور گیسٹ ہاؤس پہنچتے ہی، آب دیدہ ہوکر کہنے لگیں کہ میں یہاں اس لئے آئی ہوں کہ تمہارے دونوں بچے تمہارے حوالے کردوں، اور خود اپنی ہیرے کی انگوٹھی نگل کر کھالوں اور اس دنیا سے سدھار جاؤں یہ سنتے ہی میرے ہوش اڑ گئے، اور گھبرا کر پوچھا اشرف جہاں خدا کے واسطے جلدی بتاؤ کہ آخر بات کیا ہے انہوں نے روتے ہوئے کہا ماموں کو بلا کر پوچھ لو۔

ماموں نے آکر جیب سے ایک تار نکالا میں نے تار پڑھا تو معلوم ہوا کہ کسی اللہ کے بندے نے ان کے پاس یہ تار بھیجا تھا کہ آپ کے شوہر عقد ثانی کررہے ہیں فوراً حیدرآباد پہنچ جایئے میں نے کہا اشرف جہاں یہ تار بالکل جھوٹا ہے بیوی نے کہا کہ اگر یہ تار جھوٹا اور تم سچے ہو تو اپنے بچوں کے بازو پکڑ کر قسم کھالو کہ تم دوسرا نکاح نہیں کر رہے تھے اور جب میں نے اپنے بچوں کے دونوں بازو پکڑ کر بڑے ولولے کے ساتھ قسم کھالی تو ان کا چہرہ بحال ہوگیا۔

اتنے میں چھوٹے دادا، ہنستے ہوئے آئے اور میری بیوی کے دل پر اپنی خیر خواہی کا سکہ بٹھانے کی خاطر، انہوں نے کہا بھائی شبیر حسن خاں کی بیوی یہ تار میں نے دیا تھا۔۔۔۔ میں نے، برا مان کر کہا چھوٹے دادا آپ کو ہرگز ایسا نہ کرنا چاہئے تھا انہوں نے کہا میرے بھائی برا نہ مانو، مجھ سے یہ کب ہوسکتا تھا کہ تمہارا گھر بگڑے اور میں بیٹھا تماشا دیکھتا رہوں میں نے کہا آپ کیسی باتیں کررہے ہیں میرا گھر بگڑ کب رہا تھا۔ انہوں نے کہا وہ شوق والی بات یاد کرو جو ایک لڑکی کا پیام لے کر تمہارے پاس

1۔ میں انہیں اور رمضانی باورچی کو، ملیح آباد سے اپنے ساتھ لایا تھا۔

آئے تھے بیوی نے بگڑ کر مجھے دیکھا اور کہا لو اب تو بات کھل گئی، ہائے تم کیسے باپ ہو کہ تم نے اپنے دونوں بچوں کی بانہیں پکڑ کر جھوٹی قسم کھالی۔

میں نے جھلا کر کہا اپنے بچوں کی جھوٹی قسم کھانے والے قصائی پر میں ہزار بار لعنت بھیجتا ہوں، اب پوری بات مجھ سے سن لو یہاں ایک بہت بڑے جاگیردار ہیں ان کی صاحبزادی نے خدا جانے مجھے کیوں کر دیکھ لیا کہ مجھ پر عاشق ہوگئیں، اپنی خادمہ کے ہاتھ خط بھیجا اور لکھا کہ میری ماں نے میرے باپ کو اس بات پر تیار کرلیا ہے کہ وہ آپ سے میری شادی کردیں، کل ابا کے مصاحب شوق صاحب آئیں گے آپ کے پاس چنانچہ اس کے دوسرے روز ہی شوق صاحب نے ان جاگیردار صاحب کا نام لے کر مجھ سے آکر یہ کہا کہ اگر آپ ان کی صاحبزادی سے نکاح کرنے پر آمادہ ہوں تو میں ان کے والد ماجد کو اس بات پر راضی کرسکتا ہوں کہ وہ اپنی صاحبزادی کا آپ سے نکاح کردیں، اور اسی کے ساتھ ساتھ انہوں نے مجھ سے یہ بھی کہا کہ آپ کے رہنے کے لئے ایک کوٹھی اور ایک کار کا انتظام کردیا جائے گا، آپ کے تمام خانگی مصارف جاگیر سے ادا کئے جائیں گے، اور پندرہ سو روپیہ ماہانہ جیب خرچ بھی آپ کو دیا جائے گا۔ بیوی نے بری گھبراہٹ کے ساتھ بات کاٹ کر پوچھا اور تم نے کیا جواب دیا میں نے کہا کہ میں نے یہ جواب دیا کہ شوق صاحب، میری شادی ہوچکی ہے میں دو بچوں کا باپ ہوں" ہم میاں بیوی کو ایک دوسرے سے بے حد محبت ہے اور میں یہ گوارا نہیں کرسکتا کہ ان پر سوت لاؤں یہ کہہ کر میں نے چھوٹے دادا سے کہا کیوں صاحب میں نے آپ سے یہی بات کہی تھی نا یا کچھ اور؟" چھوٹے دادا نے کہا نہیں یہی بات کہی تھی میں نے کہا جب آپ کو یہ معلوم ہو چکا تھا کہ میں سرا سر انکار کر چکا ہوں تو پھر آپ نے میری بیوی کو تار کیوں دے دیا۔۔۔۔۔ چھوٹے دادا نے کہا میرے بھائی آدمی کو بدلتے دیر نہیں لگتی، میں نے سوچا کہ تمہاری بیوی کو بلا

کرتم پر مسلط کر دوں۔

یہ بات سن کر میری بیوی کے دل کا کانٹا نکل گیا کہنیلگیں اس بھڑوے سے شوق کر اب کبھی اپنے گھر نہ آنے دینا علی کی تیغ ٹوٹے اس نگوڑے پر وہ میرا لاکھ کا گھر خاک کرنے آیا تھا مواد وسرے ہی دن بیوی نے مٹھائی منگا کر مولا مشکل کشا کی نیاز دلائی اور گھر کا مطلع صاف ہو گیا۔

ایک روز میں اس بات پر غور کر رہا تھا کہ نواب عماد الملک کے خط کو بھی تقریباً ایک ماہ گزر چکا ہے، لیکن نظام نے اب تک مجھے طلب نہیں کیا ہے شاید وہ تیر بھی خطا کر گیا کہ پل بھر میں غم گیں ہونے کے عوض میرے دماغ میں ایک مسخرگی کی لہر دوڑ گئی اور اس نے کھسٹ سے، ایک بازاری سا مطلع کہہ کر پیش کر دیا۔ اس مطلع پر مجھے، بے ساختہ ہنسی آ گئی۔ میں ہنستا ہوا بیوی کے پاس آیا، لو اشرف جہاں، ایک مطلع سنانے اور یہ بھی بتانے آیا ہوں کہ اس مطلع کے بعد میرے دل سے برابر یہ آواز آ رہی ہے کہ یا تو نظام آج ہی مجھ کو حیدر آباد سے نکال دیں گے یا آج ہی اپنے پاس بلا لیں گے ان دو باتوں کے سوا کوئی تیسری بات ہو ہی نہیں سکتی بیوی نے مسکرا کر کہا مجھ پر تمہاری درویشی کا سکہ نہیں بیٹھ سکتا تم آئے دن تو ''زلف پیچاں'' اور ''روئے خوباں'' بکتے رہتے ہو اور میرے سامنے آئے ہو ولی اللہ بن کر میں نے کہا تم میرے مرتبے سے واقف نہیں حشر کے میدان میں جب تم پوچھو گی کہ ارے یہ کون ہے کہ اللہ میاں کے قدموں کے پاس بیٹھا ہوا گڑ گڑ حقہ پی رہا ہے تو فرشتے جواب دیں گے کہ یہ اصلی حضرت جوش صاحب قبلہ ہیں اور تم بھڑ بھڑا کر میرے قدموں پر گر پڑو گی وہ ہنستے ہنستے لوٹ گئیں اور خوب ہنس چکیں تو کہا اچھا وہ شعر تو سناؤ میں نے کہا مطلع کو شعر کہہ رہی ہو، ماشاء اللہ، انہوں نے کہا زیادہ لیاقت نہ بگھارو، اور مطلع سناؤ میں نے کہا لو سنو

دشمن ہوں، اس زمین پہ، شادہ و زیر کا
لونڈا ہوں، آسمان پہ، جناب امیر کا

مطلع سنتے ہی توبہ توبہ کرکے انہوں نے اپنا منہ پیٹ لیا، کہنے لگیں تم کھڑے دوزخ میں جاؤ گے توبہ توبہ، ارے کہاں جناب امیر، اور کہاں یہ باتیں اور پٹھان ہو کر اپنے کو لونڈا کہتے ہوئے تمہیں شرم بھی نہیں آئی میں نے کہا ارے خاک سمجھتی ہو، تم شاعری کی زبان کو۔۔۔۔ اس شعرے میں ''لونڈے'' کے معنی ہیں ''روحانی چیلا'' اور ''چہیتا'' تمہیں کیا خبر کہ ہم شعرائے کرام، الفاظ کے معنی یوں بدل دیتے ہیں کہ لغات کا منہ کھلا کا کھلا رہ جاتا ہے۔

بیوی نے کہا بھاڑ میں جائے ایسا مسخرہ پن کہ اسی آن، دروازے پر موٹر آ گئی زن زن اور برآمدے میں تالی 1 بجنے لگی ٹھن ٹھن

باہر آیا تو دیکھا نواب قادر نواز جنگ کھڑے ہیں مجھے دیکھتے ہی انہوں نے کہا مبارک ہو، جوش صاحب سرکار نے آپ کو یاد فرمایا ہے ابھی تیار ہو جائیے۔

میں اندر گیا اور بیوی کے سامنے جھک کر کہا آداب بجا لاتا ہوں بیگم صاحب کیا میں نے ابھی یہ نہیں کہا تھا کہ یا تو نظام مجھے آج ہی نکال دیں گے، یا آج ہی بلا لیں گے؟ دیکھا جو اس درویش نے کہا تھا، وہی ہوا نا؟ نظام نے مجھے بلا بھیجا ہے بیوی نے جھینپی ہوئی مسکراہٹ کے ساتھ، کہا بہت شیخی نہ بگھارو، جلدی کپڑے پہنو اور جاؤ۔

کنگ 2 کوٹھی کی، کائی لگی، کالی کالی دیواروں اور اس کے شاہانہ پھاٹک کے بوسیدہ پردے پر عبرت کے ساتھ نگاہ ڈالتا اور بے پایاں دولت کے پیدا کردہ بے کر ان افلاس پر غور کرتا جب محل سرا کے اندر پہنچا تو یہ حسرت ناک تماشا دیکھا کہ وہاں سبزے کا فرش ہے، نہ کیاریاں، پھولوں کے پودے ہیں نہ سرو و چنار۔۔۔۔ سوکھا، روڑھا صحن ہے اور اس بجھے بجھے صحن میں، ہزاروں چیزیں، نہایت بے قاعدگی کے ساتھ ادھر ادھر بکھری پڑی ہیں سامنے ایک نہایت چھوٹا سا تین سیڑھیوں کا برآمدہ ہے برآمدے میں ایک بے

1 اہل حیدرآباد تالی بجا کر اپنے آنے کی اطلاع دیتے ہیں

2ؔ نظام کے محل کا نام اصلی میں کوٹھی تھی کسی کمال خاں کی جس نے چھچھورے پن سے کام لے کر اس کوٹھی کے تمام دروازوں وغیرہ پر K, K یعنی کمال خاں کھدوا دیا تھا جب نظام نے قبضہ کرلیا تو اس کے کے حروف کو ''کنگ کوٹھی'' میں تبدیل کر دیا کیا وہ کمال خان دروازہ پر ک خ نہیں کھدوا سکتا تھا؟ لیکن اس نے اپنے حروف ہجا سے گریز کر کے انگریزی کے حروف کو اس لئے اختیار کیا تھا کہ اس کو ''صاحب بہادر'' سمجھا جائے ڈوب مرا ے چڑیا کے غلام!

پالش، چھوٹی سی کرسی پر، ایک ادھیڑ اور خشک چہرے کا دبلا پتلا آدمی میلے اور پیوند لگے کپڑے پہنے، اکڑا ہوا بیٹھا ہے اور اس کی بے پھندنے کی بوسیدہ ترکی ٹوپی کے کناروں پر میل کی ایک چوڑی تہ جمی ہوئی ہے اور اس کے سامنے تیس چالیس عمائد شہر اور اعیان ریاست، دستار و بکلوس لگائے، اونگھی مرغابیوں کے مانند، دست بستہ و سرنگوں کھڑے ہوئے ہیں اور ان کے پیچھے بہت سے چیڑ کے ناکارہ بکس پڑے ہوئے ہیں۔

میری نذر قبول کر کے انہوں نے اپنے دست بستہ حاضرین سے کہا، انہیں پہچانتے ہو عماد الملک نے لکھا ہے کہ یہ فقیر محمد خاں گویا کے پوتے ہیں اگر اودھ کی سلطنت برباد نہ ہو جاتی، تو یہ دکن کیوں آتے آدھے مسلمانوں کو اودھ سنبھال لیتا، آدھے مسلمانوں کو دکن۔

اس کے بعد نظام نے اپنے استاد، حضرت جلیل مانک پوری کو مخاطب کر کے کہا، استاد ان کے خاندان سے تم 1ؔ تو خوب واقف ہو گے استاد نے ہاتھ 2ؔ جوڑ کر کہا خداوند ان کے والد نواب بشیر احمد خاں نے اس وقت میری امداد کی تھی جب کہ میرے استاد، حضرت امیر مینائی کے انتقال کے بعد کوئی میرا سرپرست باقی نہیں رہا تھا جلیل صاحب کی اس شرافت پر میری آنکھیں ڈبڈبا گئیں نظام نے حضرت جلیل کا یہ اعتراف احسان سن کر اور میری آنکھوں کی نیم ناکی کو دیکھ کر کہا استاد آپ، اور جوش

دونوں بڑے شریف آدمی ہیں آپ نے سب کے سامنے یہ بے بے جھجک کہہ دی کہ ان کے والد نے تمہاری مدد کی تھی اور تمہارا یہ اعتراف سن کر جوش کی آنکھوں میں آنسو آ گئے مجھ کو تم دونوں کی یہ بات بہت پسند آئی اور مجھ سے مخاطب ہو کر نظام نے کہا عماد الملک نے یہ بھی لکھا ہے کہ نوجوان ہونے کے باوجود تمہاری شاعری میں اساتذہ کی سی پختگی پائی جاتی ہے اپنی کوئی چیز سناؤ۔

میں نے مطلع سنایا

1۔ استاد تک کو آپ نہیں تم سے مخاطب کیا جاتا تھا دولت جو چاہے کرے کون بول سکتا ہے

2 پائے اتحاد اور شاگرد سے بات جوڑ کر بات کرے حکومت کی ریت کیا کہنا تیری شرافت کا۔

ملا جو موقع، تو روک دوں گا جلال روز حساب تیرا
پڑھوں گا، رحمت کا وہ قصیدہ، کہ ہنس پڑیگا عتاب تیرا

نظام کے چہرے پر پسندیدگی کا رنگ دوڑ گیا، زیر لب ''واہ'' کہا اور جب میں نے یہ شعر پڑھا:

جڑیں پہاڑوں کی ٹوٹ جاتیں، فلک تو کیا، عرش کانپ اٹھتا
اگر میں دل پر نہ روک لیتا، تمام زور شباب تیرا

تو نظام نے، جھوم کر، کہا بہت اچھا بہت اچھا بہت اچھا اور تمام حاضرین زور زور سے داد دینے لگے اور میری غزل کے اختتام پر نظام نے کہا استاد جلیل ان کے تیور بتا رہے ہیں کہ بوڑھے ہو کر یہ تمہاری سری 1 کے ہو جائیں گے۔

اس کے بعد انہوں نے پوچھا جوش تمہاری شادی ہو چکی ہے؟ میں نے کہا میری شادی ہو چکی ہے اور میری بیوی یہاں آ بھی چکی ہے۔۔۔۔۔ ''یہاں آ چکی ہیں'' انہوں نے حیرت سے کہا اور پھر فرمایا کہ تمہاری ملازمت سے پیش تر، وہ یہاں کیوں

چلی آئیں انہوں نے یہ خیال کیوں نہ کیا کہا گر یہاں تم کو ملازمت نہ مل سکی تو ان کا یہاں چلا آنا بیکار ہو جائے گا۔

میں نے کہا سرکار، میری بیوی کو اس بات کا یقین ہے کہ ایسا ہو ہی نہیں سکتا کہ مجھ کو یہاں ملازمت نہ ملے۔

نظام نے پوچھا تمہاری بیوی کو اس بات کا یقین کیوں تھا کہ تم کو یہاں ملازمت ضرور ہی مل جائے گی یہ سوال سن کر میں چپ ہو گیا سوچنے لگا کہ اس خواب کا ماجرا کہوں یا نہ کہوں۔

میری اس شش و پنج کو دیکھ کر نظام نے کہا بولو جی بولتے کیوں نہیں

اس موقع پر نواب مہدی یار جنگ، ہاتھ جوڑ کر کھڑے ہو گئے اور چوں کہ میں ان سے اپنا خواب بیان کر چکا تھا انہوں نے کہا خداوند کی اجازت ہو تو ذری اس کی علت 1 در ہے کہ آلہ ہم سر

بیان کر دے نظام نے کہا بولو اور جب مہدی صاحب نے میرا تمام خواب بیان کر دیا تو نظام کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے اور کہا تو یہ بولو کہ سرکار دو عالم نے جوش کو میرے سپرد فرمایا ہے یہ کہا اور وہ اپنے دونوں ہاتھ، سینے پر رکھ کر جھک گئے اور تمام دربار پر ایک گہرا سکوت چھا گیا۔

اس باریابی کے ایک ہفتے کے بعد، عثمانیہ یونیورسٹی کے شعبہ دارالترجمہ کے ناظم، عنایت اللہ صاحب نے جو مولوی ذکاءاللہ صاحب دہلوی کے فرزند، اور اکبر حیدری وراس مسعود کے پرستار ہونے کی بناء پر میرے بدخواہ بن چکے تھے مجھے بلا کر کہا جوش صاحب مبارک ہو یہ لیجئے شاہی فرمان سرکار نے پولیٹکل اکانومی کے مترجم کی حیثیت سے آپ کا تقرر فرما دیا ہے۔

میں نے ان سے کہا پولیٹکل اکانومی سے میرا کوئی تعلق نہیں انہوں نے خوش ہو کر کہا تو پھر آپ انکار لکھ دیں۔۔۔ میں نے فرمان کے حاشیے پر یہ لکھ دیا کہ سرکار والا

تبارکا بے حد شکریہ، لیکن چوں کہ پولیٹکل اکانومی میرا سبجکٹ نہیں رہی ہے اس لئے مجھے افسوس ہے کہ میں اس کام کو باحسن الوجوہ نہیں کرسکوں گا البتہ اگر انگریزی ادب کے ترجمے کا کام میرے سپرد کیا جائے گا تو اسے بڑی خوبی کے ساتھ، انجام دے سکوں گا۔

عنایت اللہ نے کہا انگریزی ادب ہی میں پڑھایا جاتا ہے اس لئے اس کے ترجمے کا کوئی جواز ہی نہیں ہے آپ یہ عبارت قلم زرکردیں میں نے کہا کیا مضائقہ ہے رہنے دیجئے کاٹوں گا نوید سنائی پیدا ہوجائے گی۔

عنایت اللہ نے کہا ناظم شعبہ ہونے کی حیثیت سے میرا یہ فرض ہے کہ میں آپ کی عبارت کے نیچے یہ نوٹ لکھ دوں کہ انگریزی ادب براہ راست پڑھایا جاتا ہے اس کا ترجمہ ایک فعل عبث ہوگا آپ کو کوئی اعتراض تو نہیں ہوگا میں نے کہا بڑے شوق سے لکھ دیں آپ۔

اس کے چوتھے پانچویں دن عنایت اللہ خود میرے پاس آئے اور کہنے لگے صاحب مبارک ہو سرکار نے انگریزی ادب کے مترجم کی حیثیت سے آپ کا تقرر فرما دیا ہے یہ لیجئے فرمان، اور لکھ دیجئے اس پر اپنی منظوری۔

میں نے دیکھا کہ فرمان میں یہ لکھا ہوا تھا کہ ہرچند اس نئے عہدے کے قیام کا کوئی جواز نہیں ہے لیکن سردست جوش ملیح آبادی کا مترجم انگریزی ادب کے عہدے پر فوراً تقرر کیا جائے اور جب ان کو ترقی مل جائے تو اس عہدے کو توڑ دیا جائے میں نے شکریئے کے ساتھ، اس فرمان پر دستخط کردیئے۔۔۔۔۔۔اور عنایت اللہ صاحب کے چلے جانے کے بعد میں نے بیوی کو یہ خوشخبری سنائی انہوں نے اپنے دونوں ہاتھوں کی انگلیاں اپنے ماتھے پر چٹکا کر کہا قربان جاؤں اپنے رسول اللہ کے دیکھی تم نے اس خواب کی تعبیر، تم نے تو حیدری سے بگاڑ کر، اپنے پاؤں پر کلہاڑی ماری تھی لیکن اللہ نے تمہاری مدد کی عماد الملک تمہاری پشت پناہی کو کھڑے ہوگئے میں تو کہتی

ہوں پتھر سے پانی نکل آیا۔۔۔۔اور دوسرے ہی دن، بیوی نے بڑی دھوم سے میلاد کی اور محلے بھر میں مٹھائی بٹوائی۔

تقرر کے بعد، شکریئے کی نذر لے کر پہنچا ایک نذر اپنی طرف سے اور دو نذریں بیوی بچوں کی طرف سے پیش کیں نظام نے کہا ابھی کیا ہے، میں تمہیں اس قدر دوں گا کہ گھر میں رکھنے کی جگہ باقی نہیں رہے گی کئے بیویاں ہیں تمہاری؟ میں نے کہا میری تو صرف ایک ہی بیوی ہیں انہوں نے کہا میں نے سنا ہے ''اودھ کے تعلقہ داران کے بہت سے بیویاں ہوتی ہیں'' میں نے کہا سرکار والا پہلی بات تو یہ ہے کہ ہم میاں بیوی ایک دوسرے سے بے حد محبت کرتےہیں اور دوسری بات یہ ہے کہ میری بیوی بھی میری ہی طرح پٹھان نسل کی ہیں اور اس پر یہ طرہ کہ کئی برس سے وہ بے چاری شدید اختلاج میں مبتلا ہیں اگر میں دوسری شادی کرلوں گا تو ان کی پٹھنولی اور ان کا اختلاج، یہ دونوں مل کر انہیں ہلاک کر ڈالیں گے۔

نظام نے اختلاج کا حال سنا تو پوچھا کب سے ہے، میں نے کہا چار پانچ برس سے ہے پوچھا کس کس کا علاج کرا چکے ہو میں نے ان معالجوں کے نام بتا دیئے پھر سوال کیا اب تک علاج پر کس قدر روپیہ برباد کر چکے ہو میں نے کہا کم سے کم پندرہ بیس ہزار تک برباد کر چکا ہوں لیکن مرض ہے کہ جانے کا نام نہیں لیتا۔ یہ سن کر نظام نے سیدھے ہو کر بڑے فخریہ انداز میں کہا کہ میں ڈاکٹری اور طب میں اس قدر دست گاہ رکھتا ہوں کہ ماہر چند میں باقاعدہ مطب نہیں کرتا لیکن بڑے بڑے ڈاکٹروں اور طبیبوں کے لبان نہیں کھلتے ہیں میرے سامنے۔۔۔۔۔یہ کہہ کر وہ اندر گئے اور دو چار منٹ کے بعد آ کر چوب دار کو آواز دی کہ لے یہ پانچ رپاں عیسیٰ میاں کے بازار کے دواخانے سے گاؤزبان اور خمیرہ مروارید لے آ جب دونوں دوائیں آ گئیں تو ان کو میرے حوالے کرتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ یہ دوائیں صبح و شام اپنی بیوی کو کھلاؤں پلاؤں، کسی دن ناغہ نہ ہونے دوں، اور عین مرگ 1 کے دن آ کر بتاؤں کہ اب میری

بیوی کیسی ہیں۔

اس واقعہ کے پندرہ بیس دن کے بعد عین ''مرگ'' کے دن کنگ کوٹھی گیا دو نذریں پیش کیں اشرفیوں کو دیکھ کر ان کے چہرے پر سرخی دوڑ گئی پوچھا یہ دوسری نذر کس کی طرف سے ہے میں نے کہا یہ میری بیوی کی طرف سے ہے انہوں نے پوچھا بتاؤ، میری دواؤں کا اثر، میں نے سفید جھوٹ سے کام لے کر کہا سرکار کی دواؤں نے تو جادو کا اثر کیا ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انہیں کبھی اختلاج تھا ہی نہیں۔۔۔ یہ سنتے ہی، ان کے چہرے اور ان کے تمام بدن میں خوشی اور مناخرت کی لہر دوڑ گئی اور چوب دار کو حکم دیا کہ فلاں فلاں ''طبیباں'' اور ''ڈاکٹروں'' کو فوراً حاضر کردے۔

جب تمام نامی ''طبیب'' اور ''ڈاکٹر'' حاضر ہو کر نذریں پیش کر چکے تو انہوں نے حکم دیا کہ تمام ''طبیب'' میرے داہنے طرف اور تمام ''ڈاکٹر'' میرے بائیں جانب صفیں باندھ کر کھڑے ہو جائے اور جب حکم کی تعمیل ہو گئی تو کوتوال شہر ونکٹا مارا ریڈی کو ان صفوں کے درمیان ''مرج البحرین'' کے طور پر کھڑا کر دیا گیا۔۔۔۔

1 دکن میں پرتگال کے یوم اولیں کو مرگ اور آغاز موسم باروں کا مرگ لگنا کہا جاتا ہے اس واقعہ عجیب کی شہر میں ڈگ پٹ گئی کہ جوش صاحب اس قدر بلند اقبال ہیں کہ سرکار نے ان کی بیوی کے علاج کی خاطر اپنی جیب سے ایک نہیں پورے پانچ روپے صرف کر ڈالے اور مہاراجہ پرشاد نے تو اس خوشی میں میری دعوت بھی کر ڈالی اور کہا ممالک محروسہ سرکار عالی میں آپ وہ پہلے آدمی ہیں جن پر نظام نے پانچ روپے اپنے جیب سے خرچ کر ڈالے ہیں۔

اور عین اس وقت جب کہ حکیم ڈاکٹر ان کی طرف اس امید کے ساتھ دیکھ رہے تھے کہ آج ہم سب پر کوئی نہ کوئی نوازش ضرور کی جائے گی نظام نے کڑک کر ان سے کہا دیکھو یہ جوش ملیح آبادی تمہارے سامنے کھڑے ہوئے ہیں یہ بے چارے اپنی بیوی کے علاج میں پندرہ بیس ہزار روپیہ تم بے ایمان مسخراں کو چٹا چکے ہیں لیکن تم

انہیں تندرست نہیں کر سکے، میں نے دو دوائیں دیں اور بیس دن کے اندر ان کی بیوی کا مرض غائب ہو گیا اب اے سالو اگر تم میرے سامنے حذاقت کا دعویٰ کرو گے تو میں تمہاری ۔۔۔۔۔گا اور فقط یہی نہیں میں تم سب کی ۔۔۔۔۔میں ریل چلا دوں گا اور اس ریل میں بیٹھ کر دھکا دھک کرتا منما ڑ تک چلا جاؤں گا۔

اپنے آقا کی زبان سے یہ فحش الفاظ سن کر ان سب کے رونگٹے کھڑے ہو گئے ان کے گل مچھے لانبی داڑھیاں ہوا میں پھر پھرانے لگیں ڈاکٹروں کی مونچھوں کی کھڑی چونچوں پر بھیروں ناچنے لگا ذلت کے کوے ان کے سروں پر قاؤں قاؤں کرنے لگے اور ان کی جھکی پلکوں کے نیچے لال لال منہ کے بندر جست وخیز کرتے نظر آنے لگے۔

ان کی یہ حالت دیکھ کر ایسا معلوم ہوا کہ جیسے کوئی بہت بھاری پتھر کسی پہاڑی سے ٹوٹ کر دریا میں آ گرا ہے اور ساکن موجوں میں یکا یک بھونچال آ گیا ہے۔

میں نے بڑی عبرت کے ساتھ دیکھا کہ ان معزز ارباب فن کی پنڈیاں کانپ رہی ہیں ان کی گردنیں پتلی ہو ہو کر ان کے سروں کا وزن اٹھانے سے انکار کر رہی ہیں ان کی آنکھیں بجھ گئی ہیں ان کا جذبہ غیرت منہ پیٹ رہا ہے ان کی ناکیں سرخ ہو ہو کر لمبی ہو چکی ہیں اور ان کی خودداری ان کے رخساروں کی دونوں ابھری ہوئی ہڈیوں پر اکڑوں بیٹھی ہوئی لید کر رہی ہیں ہائے انسان تیری مجبوریاں 1

1 اس وقت تو یہ بات سمجھ میں نہیں آئی تھی کہ جب ان میں سے کسی نے بھی میری بیوی کا علاج نہیں کیا ہے تو پھر انہیں ذلیل کیا جا رہا ہے لیکن اس اس کی یہ علت سمجھ میں آ رہی ہے کہ چونکہ نظام اپنے کو تمام طبیبوں اور ڈاکٹروں سے بہتر سمجھتے تھے اور ان کا دل اس بات پر کڑھا کرتا تھا کہ اگر میں مطب کرتا تو جو دولت یہ لوگ مار رہے ہیں میری جیب میں آتی اور منصب شاہانہ کی مجبوری سے

دار الترجمہ مقام دفتر کم اور دار التفریح زیادہ تھا ہم تمام لوگ 1 (سید ابو الخیر مودودی کے علاوہ) روز ہاشمی صاحب فرید آبادی کے کمرے میں جمع ہو کر گپیں اڑاتے

اور شاعری کیا کرتے تھے میں نے وہاں مترجم ادب انگریزی 2 کی حیثیت سے تقریباً ڈیڑھ برس کام کیا اور جب علامہ علی حیدر صاحب طباطبائی کو پنشن مل گئی تو اکبر حیدری اور راس مسعود کے علی الرغم نواب اکبر یار جنگ کے مخلصانہ مساعی کی بناء پر مجھے ترقی مل گئی میرا عہدہ توڑ دیا گیا اور میں علامہ طباطبائی کی جگہ ''مشیر ادب'' کے عہدے پر کام کرنے لگا میری یہ بڑی ادبی نمک حرامی ہوگی کہ اگر میں اس امر کا اعتراف نہ کروں کہ شعبہ دارالترجمہ کی وابستگی نے مجھ کو بے حد علمی فائدہ پہنچایا اور خصوصیت کے ساتھ علامہ عمادی علامہ طباطبائی اور مرزا محمد ہادی رسوا کے فیضان صحبت نے مجھ بے سواد آدمی کو میرے جہل پر مطلع کر کے مجھ کو ذوق مطالعہ پر مامور کر دیا اور صحت الفاظ و نجابت لہجہ کا جو پورا میرے باپ اور میری دادی نے میرے وجود کی سرزمین پر لگایا تھا اگر طباطبائی میرزا محمد ہادی اور عمادی کی مسلسل دس برس کی ہم نشینی کا مجھ کو موقع نہ ملتا تو وہ پوچھا کبھی شاداب اور بارآور نہ ہوتا۔

چونکہ میں ایسا نہیں کر سکتا تو میری مجبوری سے فائدہ اٹھا کر یہ نا اہل مزے اڑا رہے ہیں کیا ہوا اگر ان میں کوئی جوش کی بیوی کا معالج نہیں رہا ہے مگر ان کی بیوی کے معالجوں کے یہ لوگ ہم پیشہ اور ایک ہی ہتھیلی کے چٹے بٹے وہیں وہ معالج میرے ہاتھ نہیں آ سکتے تو پھر ان کو ذلیل کر کے اپنے جی کیوں نہ ٹھنڈا کر لوں؟ ممکن ہے میری یہ رائے غلط اور اس کی علت کچھ اور ہی ہو اس لئے کہ دولت کی ضرورت سے زیادہ فراوانی اور مسخرے مصاحبوں کی حد سے بڑھی قصیدہ خوانی کے بگاڑے ہوئے دماغوں کی اچھل کود اس نوعیت کی ہوتی ہے کہ کوئی ذی عقل اسے گرفت میں نہیں لا سکتا اے اللہ مجھ کو دولت کی فراوانی اور افلاس کی طغیانی سے محفوظ رکھنا، اس لئے کہ ان دونوں حالتوں میں انسانیت کا دم نکل جایا کرتا ہے۔

1 یعنی احسان احمد، علامہ عمادی، مولوی فدا علی محمد ابراہیم، رشید احمد، مرزا طبیب، سنجاے پوری اور گاہ گاہ قاضی غلمذ حسین، مسعودی علی محوی علامہ طباطبائی اور مرزا محمد

ہادی رسوا صاحب امراؤ جان ادا بھی شریک بزم ہو جایا کرتے تھے 2 میرے ذمے حیات بیگن کا ترجمہ تھا۔

میرزا محمد ہادی صاحب میرے پڑوسی تھے میں دکن آ کر پھر ان سے پڑھنے لگا، اور اس بار فارسی کے ساتھ ان سے انگریزی ادب، اور فلسفے کا بھی باقاعدہ درس لینا شروع کر دیا۔ ہر چند 1918ء میں شراب کے لطف سے آگاہ ہو چکا تھا، اس لئے کبھی کبھی کسی دعوت میں تو پی لیتا تھا لیکن اپنی تنخواہ سے خرید کر کبھی نہیں پیتا تھا اور اسی وجہ سے مجھے یہ فرصت حاصل تھی کہ روز رات کے گیارہ بارہ بجے تک اردو فارسی، انگریزی ادب اور فلسفے کا بلا ناغہ مطالعہ کیا کرتا۔

ہائے کیوں کر بیان کروں کہ اس وقت میرا حیدرآباد کیا چیز تھا اوزانی اور اس پر دولت کی فراوانی ہر طرف ایک چہل پہل تھی امراء کے دروازوں پر صبح و شام نوبت بجا کرتی تھی آئے دن جلسے، مجرے، دعوتیں اور مشاعرے ہوتے متوسطین تک غرق نشاط رہا کرتے تھے اور اسکا چوسکی صرف آٹھ روپے میں ملتی اور پانی کی طرح بہائی جاتی تھی۔

وہاں کا علمی و ادبی ماحول، موسمی اعتدال، مجلسی ابھار اور تہذیبی نکھار وہاں کی رامش و رنگ میں ڈوبی شامیں، پہاڑوں پر تھرکتی سجیں، شبستانوں میں ناچتی گاتی راتیں، بانہوں اور بوسوں کی سوغاتیں یاران دلنشیں کی ترنگیں، اٹھتی جوانیوں کی امنگیں، باغ عامہ کی لچکتی ڈالیاں، عثمان ساگر کی، گنگناتی متوالیاں، اونچی اونچی گاتیاں بہکی بہکی مدھ ماتیاں۔۔۔ وہاں کے میلے ٹھیلے پریوں کے ریلے ہر چہرے پر رونق ہر گوشے میں ہو حق بجتی گلیاں تھرکتی رنگ رلیاں، ساحلوں پر براتیں اور وہ خیمہ ہائے جشن کی سنہری قناتیں وہ شاہ زادہ معظم جاہ کا دربار، گویا مصر کا بازار، وہ پریاں قطار اندر قطار، وہ گردنوں کو پیچھے ریلتے ہوئے سینوں کے ابھار، وہ جھمکے، وہ چنن ہار، وہ چٹانوں کے بیوپار، وہ طوفان گیسوئے رخسار، وہ پازیبوں کی جھنکار، وہ بلبلے وہ ستار وہ گیتوں کی ہلکی ہلکی

پھوار وہ غزلوں کے گونجتے اشعار، وہ ابلتے انوار وہ کھنکتے در و دیوار اور وہ چھلکتے شیشہ ہائے سرشار۔

ہائے کن کن باتوں کا ذکر کروں حافظے کا سرہ سفید ہو چکا ہے۔ اور پرانی صحبتیں کجلا چکی ہیں اب شام کے وقت کراچی میں جب اپنے مکان کے کھلے ہوئے مغربی چھجے میں شمالی ناظم آباد کی دور کی روشنیوں کے سامنے تنہا پینے بیٹھتا ہوں تو انسان کی رنگ رلیوں کو دیکھ کر انگاروں پر لوٹنے والی مشیت میری زمانہ ماضی کی سرخوشیوں کی سزا دینے پر کمر بستہ ہو کر میرے بیتے دنوں کو حکم دیتی ہے کہ وہ میرا تعاقب کرنے لگیں جس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ حیدر آباد کی راتوں کی براتوں کے جلوس گم کردہ لمحوں اور گہنائے مکھڑوں کے دروانگیز جلوس دامن شفق کو پھاڑ کر باہر نکل آتے ہیں اور غلغلے مچانے والے یاروں کے چہرے اور آغوش میں مچلنے والے دلی داروں کے مکھڑے، فضا پر تیرتے نظر آنے لگتے ہیں۔ اور میرے پیاسی نظریں، جب انہیں پکڑ لینے کے واسطے، دوڑتی ہیں تو وہ دریائے شفق میں غوطہ لگا کر میری آنکھوں سے پل بھر میں اوجھل ہو جاتے ہیں اور ایک سوگوار دھواں میرے سر پر منڈلانے لگتا ہے۔

اگر میں، کل، جی بھر کے، ہنستا نہ ہوتا، تو آج، دل تھا کریوں نہ روتا، سچ کہا ہے انیس نے

روئے خزاں میں وہ جو ہنسا ہو بہار میں!!

وہ جو کہتے ہیں کہ ہر شہ میں خیرہ اور خیر میں شر کا ایک عنصر ہوتا ہے وہاں کا دوسرا بھیانک رخ بھی ملاحظہ فرمائیے۔

☆☆☆

حیدرآباد سے اخراج

حیدرآباد کے سر پر جاگیرداری اور شہر یاری کا گدھ ٹھونگیں مار رہا تھا ہر طرف درباری سازشوں کے جال بچھے ہوئے تھے نظام کے مصاحب ہر چند لکھے پڑھے نہیں تھے لیکن اس قدر کڑھے، ایسے دربار مسخرے، موروثی مراثی، خاندانی خوش آمد خورے، مشاق بھانجی مار، جھوٹے قصیدہ خواں پختہ دروغ باف، چھٹے تہمت کار، بولی ٹھولی میں اس قدر طاق و مشاق، اور نظام کے اس درجہ مزاج شناس تھے کہ ان کو انگلیوں پر نچاتے، چاپلوسی کے توؤں پر روٹیاں پکاتے، اپنے کو ابھارتے، حریفوں کو گراتے روز ماں بہن کی گالیاں کھاتے اور شربت کی طرح پی جاتے باتوں کے طوطے اڑاتے اور ان طوطوں کو اپنے آقا کی بھوؤں پر بٹھاتے اور ان سے ''بنی جی بھیجو'' کے نعرے لگواتے تھے۔

جس طرح سانپ والے، بانسریوں پر ناگوں کو نچاتے ہیں اس طرح یہ مسخرے بھی اپنے ملائم لہجوں کی گاڑیوں میں اپنی آنکھوں کے گھومتے ہوئے عیار ڈھیلوں کے پیے لگاتے اور اپنی غلط بات کو سچ ثابت کر دینے کی خاطر، اپنے سدھے ہوئے چہروں کے منہ میں لگام لگا کر، اپنی منزل مقصود کی جانب ہنکاتے اور نظام کو اپنے راستوں پر چلاتے تھے اور بڑے سے حاکموں اور جاگیرداروں سے اگر بگڑ جاتے، تو سرور باران کو پٹوا کر نکلوا دیتے، اور ان کے گھروں میں جھاڑو پھروا دیا کرتے تھے۔

ان کی زبانیں ایسی رینگتی ہوئی ناگنیں تھیں جن سے اورتو اور شہزادے تک محفوظ نہیں تھے۔

بہر حال اے حیدرآباد میں تیرا شکر گزار ہوں کہ تو نے مجھ کو دس برس تک اپنے سائے میں پروان چڑھایا تو نے مجھ کو کبھی غیر ملکی نہیں سمجھا تو نے مجھ کو کتب بینی کی دعوت دی تو نے میری شاعری کو آب و رنگ بخشا، تو نے مجھے علم و فکر کا راستہ دکھایا، تو نے مجھے کتاب کائل اور کائنات کے مطالعے پر مامور فرمایا کتاب نے میری آگاہی

میں اضافہ کیا، کاکلوں کی چھاؤں نے مجھ کو جمالیاتی شاعری کا خزانہ بخشا کائنات کے مسائل نے مجھ میں تفکر کا مادہ پیدا کیا تفکر نے میرے علم میں اضافہ کیا علم کے اضافے نے مجھ پر یہ تلخ حقیقت عیاں کر دی کہ میں سراسر جاہل ہوں اور اس عرفان جہل نے مجھ کو وادی حیرت کی جانب موڑ دیا۔

میں نے ''غلط بخشی'' کے نام سے نظام کے خلاف ایک نظم کہی تھی جس کا ذکر آگے

1 یہ بات فقط حیدرآباد ہی سے مختص نہیں تمام دیسی ریاستوں کا یہی عالم تھا ہر جگہ مسخرے مصاحبوں کی ریشہ دوانی، اور پاگل ہزہائی نسوں کی حکمرانی تھی مصاحبوں کی زبانیں ان کی کھیتیاں تھیں اور والیاں ریاست کے کان ان کھیتوں پر برسنے والے ابر تھے اور چونکہ انہیں کبھی ان کی غلطیوں پر مطلع نہیں کیا گیا تھا اس لئے وہ اپنے ہر برے سے برے فعل کو روا سمجھتے تھے اور چونکہ وہ مسلسل وململ فراغت کے آغوش میں رہتے تھے اس لئے ان کے قوائے فکر کو زنگ چاٹ چکا تھا، اور ان کی عقلوں پر چربی چھا گئی تھی اس لئے وہ خطرناک قسم کے پاگل ہو چکے تھے اور اسی وجہ سے ذرا ذرا سی بات پر آب رو داروں کو ذلیل کر دینا، ارباب علم کے سروں پر ٹھوکریں مارنا، بھانڈوں بھگتیوں کو سر چڑھانا اور شریف خاندانوں کی بہو بیٹیوں پر سانڈوں کی طرح چڑھ جانا ان کا آئے دن کا مشغلہ اور آبائی کھیل تھا۔

اور ان سانڈوں ان دیوانوں اور ان کالے ناگوں کو فرنگی حکومت نے اس لئے قائم رکھا تھا کہ جب کبھی ہندوستان میں آزادی کا طوفان آئے گا یہ لوگ اسے روکنے کے واسطے فلک پیا بند تعمیر کر دیں گے اور راجہ پورس کے ہاتھوں کے مانند خود اپنی ہی قوم کو روند کر مار ڈالیں گے۔

آئے گا وہی نظم بظاہر میرے اخراج کا سبب بن گئی لیکن اس نظم کی پشت پر جو اور اسباب بھی کام کر رہے تھے ان کا اب تک کسی کو علم نہیں ہے اس لئے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ان اسباب کو بھی بیان کر دوں۔

مجھ کم بخت گھر پھونک تماشا دیکھنے والے کی یہ افتادمزاج ہے خواہ اسے ہنر سمجھا جائے یا عیب کہ میں عامۃ الناس کے قدموں پر سر جھکا دینے کو انتہائی شرافت اور خدا وندان اقتدار کے تخت کے روبرو گردن میں خم پیدا کرنے کو انتہائی کمینگی سمجھتا ہوں اور میر تقی میر کے مانند:

سر کسو سے، فرو نہیں آتا
حیف بندے ہوئے، خدا نہ ہوئے

کا نعرہ لگاتا رہتا ہوں

اور اس افتادمزاج کے ساتھ، میں جس وقت نظام کے روبرو سراپا انکسار بن کر جاتا ان کو ''سرکار'' کہتا اور ان کی زبان سے اپنے متعلق ''تم'' سنتا تھا تو میرے دل پر ایسی کاری ضرب لگتی تھی کہ بلبلا اٹھتا تھا زبان سے تو کچھ نہیں کہتا تھا لیکن میرے چہرے کا تغیر اور میرے چوٹ کھائے دماغ کی برقی لہریں نظام کے دل پر اس طرح اثر کیا کرتی ہیں جیسے میدان میں سونے والے پر شبنم گرتی ہے اور اسے کچھ بھی خبر نہیں ہوتی کہ میرے سر میں یہ دھمک کیوں ہو رہی ہے۔

اپنے پاش پاش غرور کے ساتھ دربار سے جب گھر آتا تھا تو، بیوی کے سامنے، اپنی اس بےعزتی کا رونا رویا کرتا تھا اور وہ بھی اس بےاحتیاطی کے ساتھ کہ نوکر چاکر سب سن لیا کرتے تھے۔

مجھ کو مطلق یہ معلوم نہیں تھا کہ نظام کی خفیہ پولیس کا گھر گھر میں اس طرح جال پھیلا ہوا ہے کہ کوئی اس کی زد سے بچ کر نکل ہی نہیں سکتا۔ صرف گھر کے نوکر چاکر یا مامائیں ہی نہیں، سودا بیچنے والیاں تک خفیہ پولیس میں بھرتی ہیں۔

مجھ کو اس بات کا پتا کیوں کر چلا، وہ بھی سن لیجئے ایک روز، نواب قادر نواز جنگ بڑا خوفناک چہرہ بنائے میرے پاس آئے اور کہا جوش صاحب آپ اپنے محل میں جس بات کا رونا رویا کرتے ہیں سرکار والا تک وہ بات پہنچ گئی ہے اور مجھ کو اس بات کی بڑی

خوشی اور انتہائی حیرت ہے کہ یہ بات سن کر سرکار نے مسکرا کر ارشاد فرمایا کہ جوش بڑا مغرور آدمی ہے ملازمت کر رہا ہے مگر اس کے سر سے بوئے امارت ابھی تک نہیں نکلی سنتا ہوں وہ خدا سے بھی گستاخیاں کیا کرتا ہے لیکن کیا کروں سرور کائنات نے اس شخص کو میرے سپرد فرمایا ہے۔

نظام کی سالگرہ وغیرہ پر تمام شعراء قصائد پیش کیا کرتے تھے لیکن میں نے کبھی قصیدہ نہیں کہا ایک سالگرہ کے موقع پر ایک رسالے کے مدیر نے میری ایک بہاریہ نظم "قصیدہ" بنا کر شائع کر دی جس کا یہ مطلع تھا۔

اٹھی وہ گھٹا، رنگ سامانیاں کر
گہر باریاں کر گل افشانیاں کو

اس نظام میں سالگرہ کی جانب کوئی ادنی سا بھی اشارہ یا نظام کی مدح میں کوئی ایک شعر بھی نہیں تھا لیکن میرے اس مقطع پر شاہی عتاب نازل ہو گیا۔

کبھی جوش کے جوش کی مدح فرما
کبھی گل رخوں کی ثنا خوانیاں کر

نظام اس دھوکے میں پڑ گئے کہ اس قطعے کا روئے سخن ان کی طرف ہے اور دوسرے ہی دن فرمان شائع کیا گیا کہ معلوم ہوتا ہے یہ قصیدہ جوش نے کسی خاص وقت ہنگام بادہ نوشی میں کہا ہے ان کو چاہئے کہ وہ ایسے اوقات میں سرکار کو یاد نہ کیا کریں اگر آئندہ وہ ایسا کریں گے تو اچھا نہیں ہوگا۔

اس واقعے کے کوئی دو برس کے بعد ایک روز نواب مہدی یار جنگ بہت گھبرائے ہوئے میرے پاس آئے اور کہا بڑا غضب ہو گیا ہوش بلگرامی نے سرکار عالی تک یہ خبر پہنچا دی ہے کہ آپ کے ۔۔۔۔ شادہ زادی سے بڑے گہرے مراسم ہیں اور یہ بھی انہوں نے کہا ہے کہ ۔۔۔ محل میں جس وقت ۔۔۔۔۔۔۔ شہزادی جوش کو روک رہی تھی اور جوش عذر کر رہے تھے اس وقت میں نے پردے کے پیچھے سے یہ خود سنا تھا کہ

شہزادی نے بڑے پیار کے لہجے میں ان سے فرمایا تھا کہ ''اگر تم اس وقت نہیں رکو گے تو میں تمہیں مار ڈالوں گی''

نظام کے دل میں یہ متذکرہ بالا چاروں خمیر نامعلوم طریقے سے ابھی اٹھ ہی رہے تھے کہ میں نے وہ اشتعال انگیز نظم جس کا ذکر کر چکا ہوں جاگیرداروں اور وزراء کی بھری محفل میں سنا دی۔ اور تمام محفل پر ایک دہشت ناک سناٹا چھا گیا۔۔۔ نواب نظامت جنگ، وزیر سیاست نے میرے کان میں کہا کلہاڑی مار لی آپ نے اپنے پاؤں میں۔۔۔۔ اولاً تو آپ کو ایک ملازم سرکار عالی کی حیثیت سے ایسی نظم کہنا ہی نہیں چاہئے تھی اور کہہ بھی دی تھی تو پھر یہ چاہئے تھا کہ اس کو سات پردوں میں چھپا کر رکھتے حد کر دی آپ نے ناعاقبت اندیشی کی خیر میں تو اس پر کوئی کارروائی نہیں کروں گا خفیہ پولیس والوں نے یہ نظم لکھ لی ہے یقین رکھئے کل تک یہ کنگ کوٹھی پہنچ جائے گی اس نظم کے چند اشعار یاد ہیں آپ بھی سماعت فرمالیں یہ نظم میرے کسی مجموعے میں طبع ہو چکی ہے۔

الٰہی اگر ہے، یہی روزگار
کہ سینے رہیں اہل دل کے فگار
وناحت کو حاصل ہوں سرداریاں
شرافت کرے کفش برداریاں
سر بزم جہل آئیں، اہل نظر
بشکل غلامان زریں کمر
لیموں کی ہر شب ہو، غرق شباب
بناز نگاروں بصورت رباب
رہیں فضل باراں میں بھی تشنہ کام
خرابات کے اولیائے کرام

سر محفل ممسک بد خصال
کریم آ کے پھیلائیں دست سوال
ہنر ہو اور اس درجہ بے آب رو
تفو بر تو اے چرخ گرداں تفو!!

دوسرے ہی دن وہ نظم نظام تک پہنچ گئی کوئی دوسرا ایسی زبردست گستاخانہ نظم کہتا تو جن بچوں سمیت کولہو میں پیل دیا جاتا لیکن ان کی شرافت دیکھئے کہ انہوں نے بڑے خفیہ طور پر میرے ہم نوال و ہم پیالہ دوست آغا جانی نائب کوتوال کو میرے پاس بھیجا کہ وہ مجھے اپنے ہمراہ، کنگ کوٹھی لے آئیں آغا نے مجھ سے کہا مجھ کو اس بات پر بڑی حیرت ہے کہ رہ چند آپ نے اس قدر سخت نظم کہی ہے پھر بھی سرکار آپ کے خلاف کسی قسم کا اقدام پسند نہیں فرماتے ہیں اور انہوں نے یہ ارشاد فرمایا ہے کہ اگر جوش مجھ سے معافی طلب کر کے، اس بات کا عہد کر لیں کہ وہ آئندہ میرے خلاف کچھ نہیں کہیں گے تو میں انہیں دل سے معاف کر دوں گا اس لئے ابھی ابھی میرے ساتھ چلئے اور اس معاملے کو رسیدہ بود بلائے بنا دیجئے میں نے ان کی بات سن کر سر جھکا لیا آغا نے کہا، ارے دیر نہ کیجئے کپڑے پہنئے اور میرے ساتھ ہو لیجئے میں نے کہا آغا معافی مانگنے پر میں تیار نہیں ہوں وہ یہ سن کر دنگ ہو گئے مجھ سے کچھ نہیں کہا زنانے دروازے پر جا کر آواز دی بھابی ذرا ایک بات سن جایئے اور جب میری بیوی پٹ کی آڑ میں آ کر کھڑی ہو گئیں تو انہوں نے کہا بھابی آپ کے شوہر نام دار سرکار سے معافی مانگنے پر تیار نہیں ہیں بیوی نے آغا سے کہا ذرا انہیں بلا لیجئے آغا نے مجھے پکارا میں پہنچ گیا اور بیوی نے بڑے تحمل کے ساتھ ڈانٹ کر مجھ سے کہا ارے کیا تمہارا دماغ چر گیا ہے آدھی سے زیادہ جائیداد تباہ کر کے یہاں آئے ہو اور ابھی چھ مہینے بھی نہیں ہوئے ہیں کہ اس آدھی جائیداد کو بھی ملیح آباد جا کر تین برس کے لئے خواجہ حسن کو ٹھیکے پر دے آئے ہو اور وہ سارا روپیہ بھی بالا بالا بمبئی جا کر برباد کر آئے ہو معافی نہیں مانگو گے تو کیا جھنے

جھاڑے پھرو گے؟ اور پھر یہ بھی تو سوچو کہ لڑکی لڑکے کو لکھانا پڑھانا، اور ان کی شادیاں کرنا ہے جاؤ اس گھڑی جاؤ، اور سرکار سے جا کر معافی مانگ لو نہیں تو مجھ سے برا کوئی نہیں ہوگا سن رہے ہو تم؟

میں نے کہا اشرف جہاں یہ بات سچ ہے کہ ہم تم سے ڈرتے ہیں، مگر یہ بھی سن لو کہ اس قدر نہیں ڈرتے ہیں کہ بھیگی بلی بنے جائیں اور معافی مانگ آئیں یہ سن کر بیوی ہکا بکا ہو کر رہ گئیں دیر تک مجھے گھورا اور پھر آنکھیں جھکا لیں اور آغا جانی یہ کہتے ہوئے چلے گئے کہ جو شخص خودکشی پر تل جائے اسے کوئی نہیں روک سکتا۔

آغا کے چلے جانے کے بعد میں نے ڈر کے مارے گھر میں قدم نہیں رکھا اور دوسرے دن جلدی جلدی استعفےٰ لکھ کر اپنے محکمے کے سیکرٹری نواب ذوالقدر جنگ کے پاس چلا گیا۔

ذوالقدر نے کہا جوش صاحب آپ یہ کیا کر رہے ہیں جذبات میں نہ بہئے عقل سے کام لیجئے جایئے اور سرکار سے معافی مانگ لیجئے آپ کو معلوم نہیں ملازم کی کھال کو موٹا ہونا چاہئے سرکار مجھے گالیاں تک دے چکے ہیں یہ آپ سے کہہ رہا ہوں لیکن میں پی گیا استعفیٰ نہیں دیا اور آپ کی بات تو قطعی اس کے برعکس ہے آپ نے خود سرکار پر لعن طعن کی ہے اور اس کے باوجود الٹے استعفے دے رہے ہیں۔

دیر تک وہ مجھے سمجھاتے رہے دیر تک بڑی روقدح رہی اور جب میں نہیں مانا تو انہوں نے غصے میں آ کر میرا استعفےٰ کنگ کوٹھی روانہ کر دیا۔

میرا استعفیٰ، جنگل کی آگ کے مانند نظام تک پہنچ گیا اور نظام چیخ چیخ کر کہنے لگے" بڑا غضب ہوا جوش مجھ سے جیتے جا رہے جوش مجھ سے جیتے جا رہے ہیں، نواب سر امین جنگ نے کہا خداوند سے کون جیت سکتا ہے کہاں جوش اور کہاں شاہ دکن جوش کی سری (مرتبے) کے تو سینکڑوں شاعر لکھنو کی گلیوں میں جوتیاں چٹخاتے پھرتے ہیں نظام نے کہا امین تم بات کی نزاکت نہیں سمجھ رہے ہو مزا تو جب تھا کہ ان کے استعفے سے

پیش تر ہی میں ان کو برطرف کر دیتا۔ لیکن اس عالم میں جب کہ وہ خود مستعفی ہو رہے ہیں بات الٹ گئی ہے اور میں ہارا جا رہا ہوں۔''

نواب امین جنگ نے دست بستہ عرض کیا خداوند اس استعفے کو خانہ زاد کے حوالے فرما دیا۔ فدوی ابھی معاملے کو پلٹ دے گا نظام نے میرا استعفیٰ ان کی طرف پھینک دیا امین جنگ نے اسے اٹھا کر فوراً چاک کر دیا اور ہوا میں اس کے پرزے اڑا کر کہا سرکار والا اس استعفے کا اب وجود ہی باقی نہیں رہا ہے اب سرکار فرمان جاری کر دیں میرے استعفے کے چاک ہو جاتے ہی نظام کا چہرہ دمک اٹھا اور کہنے لگے امین تم نے مجھ کو جتا دیا، ہمارے سیکرٹری کو ایسا ہی قابل ہونا چاہئے لکھو فرمان کہ جوش ملیح آبادی کو ممالک محروسہ سرکار عالی سے خارج کیا جاتا ہے پندرہ دن کے اندر وہ روانہ ہو جائیں اور تا حکم ثانی یہاں قدم نہ رکھیں۔

فرمان لے کر آغا جانی میرے پاس آئے اور کہنے لگے اس فرمان کو سمجھے بھی؟ میں نے کہا اس میں سمجھنے کی کیا بات ہے؟ انہوں نے کہا میں سرکار والا کا مزاج شناس ہوں اس لئے فرمان کے دو نکتے بتانے آیا ہوں پہلا نکتہ تو یہ ہے کہ سرکار جب کسی پر عتاب فرماتے ہیں تو اسے چوبیس گھنٹے کے اندر نکال دیتے ہیں آپ کو چوبیس گھنٹے کے عوض پورے پندرہ دن کی مہلت دی گئی ہے اور وہ اس مقصد سے کہ آپ صورت حال کو ٹھنڈے دل سے سمجھ کر معافی مانگ لیں اور یہ فرمان واپس لے لیا جائے دوسرا نکتہ یہ ہے کہ اس میں تا حکم ثانی لکھ کر آپ کی واپسی کو ناممکن نہیں بنایا گیا ہے دیکھئے اب بھی کچھ نہیں گیا ہے ابھی میرے ساتھ سرکاری کی خدمت میں حاضر ہو کر معافی مانگ لیجئے اگر اس وقت یہ فرمان منسوخ نہ کر دیا جائے تو میری ناک کاٹ لیجئے گا۔

میں نے آغا جانی کو گلے لگا کر ان کی پیشانی چوم لی اور کہا آپ واقعی میرے سچے دوست ہیں لیکن میں کسی طرح معافی طلب نہیں کروں گا۔

آغا نے سر پکڑ کر کہا بھائی راج ہٹ بالک ہٹ تریا ہٹ تو سنی تھی آج معلوم ہوا

کہ چوتھی ہٹ، بھی ہوتی ہے جس کو شاعر ہٹ کہنا چاہئے

اندر جا کر میں نے بیوی سے کہا اب رخت سفر باندھو، ہم یہاں پندرہ دن کیوں پڑے رہیں، تین چار دن ہی میں کیوں نہ چلے جائیں بیوی نے کہا یہ تو سوچو جاؤ گے کیسے جانے کا دم درود بھی ہے؟ تمہاری بہن بہنوئی ان کے بچے اور پھر ہم لوگ اور چھوٹے دادا اور دونوکر اتنے آدمیوں کا کرایہ بھاڑا کہاں سے آئے گا اور پھر تمہاری یہ ضد بھی ہے کہ ہم اپنی موٹر اور اپنے دونوں کتے بھی ساتھ لے جائیں گے اور ان کو یہاں کی گلیوں میں مارا مارا نہیں پھرنے دیں گے ان سب کے لئے روپیہ کہاں سے آئے گا اسی دن کے لئے میں تم سے کہا کرتی تھی کہ روز دعوتیں نہ کرو، غول کے غول آدمیوں کے روز شرابیں نہ پلاؤ اتنے اللے تللے نہ کرو اب بتاؤ کیا کرو گے اور کیسے جاؤ گے نہ تو من تیل ہوگا نہ رادھا جی ناچیں گی۔

بیوی کی باتیں سن کر میں چکرا گیا اور یہ بات سمجھ میں آ گئی کہ ان حالات میں سفر نا ممکن ہے میں نے کہا پھر اشرف جہاں کیا کیا جائے؟ انہوں نے کہا جاؤ اور شہزدے اور مہاراجہ کشن پرشاد سے جا کر قرض مانگو میں نے کہا میں قرض مانگنے نہیں جاؤں گا یہ تو ان دونوں کا فرض تھا کہ وہ کسی کو میرے پاس بھیج کر خود پچھواتے کہ ہم اس موقع پر کیا امداد کر سکتے ہیں جب انہوں نے اپنا فرض ادا نہیں کیا تو میں بے غیرتی لاد کر ان کے پاس کیوں جاؤں بیوی نے کہا ہاں سچ کہتے ہو لیکن میں پوچھتی ہوں کہ اب سبیتا کیا کیا جائے میں نے کہا کوئی بات میری سمجھ میں نہیں آ رہی ہے الغرض ایک ایک کر کے دن گزرنے لگے اور اخراج کی تاریخ قریب سے قریب تر آنے لگی اور کوئی تدبیر سمجھ میں نہیں آئی اور میرا عالم اس مسافر کا سا ہو گیا جو راستہ بھول کر جنگل میں سر ٹکراتا اور چیختا پھرتا ہے۔

شب تاریک و بیم موج و گردابے چنیں مائل
کجا دانند، حال ما، سبک ساران ساحل ہا

ایک روز، اسی ربودگی و بے چارگی کے عالم میں سر جھکائے بیٹھا تھا کہ حکیم آزاد انصاری نے آ کر کہا کچھ خیال بھی ہے کہ یہاں سے جانے میں اب فقط چار دن باقی رہ گئے ہیں؟ میں نے کہا آزاد صاحب اب اس کے سوا کوئی چارہ کار نہیں ہے کہ اخراج کے دن میں بڑے اطمینان سے اپنے پھاٹک کے سامنے آرام کرسی پر بیٹھ جاؤں اور نظام کی نافرمانی کے جرم میں اپنے کو گرفتار کرا کے جیل چلا جاؤں لیکن میرے بال بچے کیا کریں گے؟

آزاد نے کہا گرفتار ہوں آپ کے دشمن، میں ایک ایسی تدبیر نکال کر آیا ہوں جو پٹ پڑی نہیں سکتی آپ کو اس بات کا علم نہیں کہ خاندان آصفیہ کی یہ ایک قدیم روایت چلی آ رہی ہے کہ شاہی معتوبوں کو تا حیات وظیفہ دیا جاتا ہے آپ بھی معتوب ہیں اس لئے آپ کو بھی وظیفہ دیا جائے گا اس لئے آپ اللہ کا نام لے کر اس مضمون کی درخواست کے ساتھ اکبر حیدری کے پاس جائیں کہ آپ کو خزانہ عامرہ سرکار عالی سے پانچ ہزار کی رقم بطور قرض دے دی جائے اور اس رقم کو وظیفہ عتاب میں سے بالاقساط وضع کر لیا جائے۔

میں نے کہا تدبیر تو آپ نے ایسی نکالی ہے جو تیر بہدف ہے لیکن کیا منہ لے کر حیدری کے پاس جاؤں انہیں تو ان کے خطاب کے معاملے میں ذلیل کر چکا ہوں۔۔۔۔۔ آزاد نے کہا اس سے کیا ہوتا ہے آپ حیدری سے تو قرض نہیں مانگ رہے ہیں آپ کو تو خزانہ عامرہ سے قرض ملے گا میں نے کہا بہت اچھا میں تیار ہوں لیکن درخواست لکھنا تو مجھے آتا نہیں آزاد نے اپنی جیب سے ٹائپ شدہ درخواست نکال کر میرے حوالے کر دی اور کہا اسی خیال سے میں آپ کے پاس مسلح ہو کر آیا تھا کہ درخواست لکھنا آپ کے بس کا روگ نہیں۔

اپنے مزاج کو لاکھوں کوڑے مار مار کر میں حیدری کے پاس گیا انہوں نے بڑی نرمی کے ساتھ پوچھا جوش صاحب میں آپ کی خدمت کر سکتا ہوں لفظ خدمت کے

زہر کو پی کر میں نے کہا آپ کو معلوم ہے کہ میرے اخراج میں اب صرف چار روز باقی رہ گئے ہیں اور خدا کے فضل و کرم سے میرے پاس اس قدر روپیہ نہیں کہ میں سفر کر سکوں اس صورت میں آپ مجھ پر دو عنایتیں کر سکتے ہیں پہلی عنایت تو یہ ہو گی کہ آپ میری اس قرض کی درخواست کو منظور فرمالیں اور یہ ممکن نہ ہو تو پھر دوسری عنایت کریں کہ مجھ کو بجرم سرتابی گرفتار کرا سے جیل بھجوا دیں۔

انہوں نے میری درخواست اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے یہ کہا آپ گرفتاری کی بات نہ کہیں اگر آپ کو گرفتار کر لیا گیا تو لٹریچر کی ہسٹری حیدرآباد کو کبھی ''مان'' معاف نہیں کر سکے گی۔

میری درخواست پڑھ کر وہ داڑھی کھجانے لگے میں نے کہا حیدری صاحب آپ اپنے دماغ پر بار نہ ڈالیں میں ہر مصیبت کے لئے بخوشی تیار ہوں انہوں نے کہا جوش صاحب یہ فنانس کا معاملہ ہے اس میں پانچ چھ مہینے لگیں گے میں نے کہا مجھے تو صرف چار دن کی فرصت ہے۔

یہ سن کر انہوں نے سر جھکا لیا سوچنے لگے پھر اپنی خشخشی داڑھی کھجائی عینک صاف کر کے دوبارہ لگائی اور آخر کار گردن کے ایک فیصلہ کن جھٹکے کے ساتھ میری درخواست منظور کر کے اس پر دستخط کر دیئے اور دوسرے ہی دن مجھ کو پانچ ہزار مل گئے۔

جاتا ہے آسماں لئے کوچے سے یار کے
آتا ہے جی بھرا، در و دیوار دیکھ کر!

ہائے کیسے بتاؤں کہ حیدرآباد سے روانگی کے وقت۔ میرے دل کا کیا عالم تھا ایک طرف غم دوراں تھا اور ایک طرف غم جاناں میری معاش کی شمع بجھ کر دھواں دے رہی تھی اور میرے معاشقے کا چاند گہنا کر اداسی برسا رہا تھا بیوی ریل کے ڈبے میں اداس بیٹھی تھیں اور محبوبہ، اسٹیشن کے ویٹنگ روم میں، پچھاڑیں کھا رہی تھیں اور میرا یہ عالم تھا

کہ بیوی کی نظر بچا بچا کر بار بار ویٹنگ روم جاتا محبوبہ کو گلے لگا کر روتا، اور آنسو پونچھ پونچھ کر باہر آتا اور سید علی اختر مرحوم، سید ابو الخیر مودودی اور سید ابو الاعلیٰ مودودی سے (جو مجھے رخصت کرنے اسٹیشن آئے تھے) باتیں کرنے لگتا تھا۔

میں اسی عالم میں تھا کہ نواب ذوالقدر جنگ آ گئے اور ایک کاغذ میری طرف بڑھا کر کہا یہ میرے نام کا شاہی فرمان ہے اسے پڑھ لیجئے فرمان حرف بحرف یاد نہیں لیکن اس کا مفہوم یہ تھا کہ جوش ملیح آبادی آج ہندوستان جا رہے ہیں ان سے کہہ دو کہ ہندوستان جا کر وہ اپنے قلم کو ہمارے خلاف استعمال نہ کریں اور اگر معافی پر تیار ہوں تو ہنوز گنجائش باقی ہے میں نے کہا نواب صاحب اعلیٰ حضرت کی خدمت میں میرا شکر یہ عرض کر کے یہ کہہ دیجئے کہ میں ان کی ہدایت پر عمل کروں گا لیکن معافی طلب کرنے پر آمادہ نہیں ہوں نواب ذوالقدر جنگ نے کہا کیا آپ یہ چاہتے ہیں کہ آپ سرکار والا کو برا کہیں اور سرکار والا الٹے آپ سے معافی طلب کریں اتنے میں ریل رینگنے لگی، میں دوڑ کر سوار ہو گیا سب کو سلام کیا میری محبوبہ ویٹنگ روم سے نکل آئی اس نے آنسو سے ڈبڈبائی آنکھوں کے ساتھ مجھے رخصتی سلام کیا، سلام کر کے لڑکھڑا گئی میں نے آنکھوں ہی آنکھوں میں اسے گلے لگا لیا اور گاڑی کی رفتار تیز ہو گئی۔

ہر چند اس عالم پر اب ایک جگ بیت چکا ہے لیکن آج بھی جب کبھی اس کی یاد آ جاتی ہے کلیجہ تھام کر رہ جاتا ہوں جو لوگ یہ کہتے ہیں قیامت کے دن ایک متنفس بھی زندہ نہیں رہے گا وہ مجھے دیکھیں کہ مجھ پر قیامت گزر چکی ہے اور آج تک زندہ ہوں لیکن ایسی زندگی بھی کس کام کی کہ جیتا جاگتا آدمی اپنے کو ''مرحوم'' لکھنے لگے ہائے وہاں سے کوچ کے وقت زلفوں سے مہکتی اور طبلوں سے گمگتی سرشار، راتیں، عثمان ساگر کی سہانی صبحیں، پہاڑوں کی رنگین بدلیاں سکندر آباد کی البیلی شامیں اور یاران دکن کی چہکتی صبحیں میرے سامنے کھڑی ماتم کر رہی تھیں معظم جاہ کا دربار آنکھوں میں آنسو بھرے مجھے دیکھ رہا تھا اور کسی کی حریم ناز سے ہائے ہائے کی آوازیں آ رہی

تھیں اور اس پر طرہ یہ کہ میں خود اپنے ارادے سے فردوس دکن کو تج دینے پر آمادہ ہو گیا تھا۔

تجھ سے رخصت کی وہ شام اشک افشاں ہائے ہائے
وہ اداسی وہ فضائے گریہ ساماں ہائے ہائے
یاں لبوں پر جنبش آہ تنک جاں وانصیب
واں مژدہ میں لرزش اشک گریزاں ہائے ہائے
یاں کف پا چوم لینے کی بھنچی سی آرزو
واں بغل گیری کا شرمایا سا ارماں ہائے ہائے
میں سراپا ساز عشرت اور وقف درد و غم
تو مجسم ناز کی اور بار حرماں ہائے ہائے
وہ مرے ہونٹوں میں کچھ کہنے کی حسرت دل شوق
وہ تری آنکھوں میں کچھ سننے کا ارماں ہائے ہائے

میں اپنے ڈبے میں سر جھکا کر بیٹھ گیا غم دوراں اور غم جاناں کی پر شور موجوں نے میرے تمام وجود کو ڈھانک لیا اور میں سوچنے لگا کہ اب مجھے کیا کرنا ہے آبائی جائیداد نے پکار پکار کر مجھ سے کہا جب تک تین برس کا ٹھیکہ موجود ہے مجھ سے کسی فائدے کی امید نہ رکھنا پھر ان احباب کے چہروں پر تصوری نگاہ ڈالی جن کی بارہا عقدہ کشائی کر چکا تھا وہ ہچکچاتے نظر آئے اقرباء کا خیال آیا تو دیکھا کہ وہ میری بربادی پر مسکرا رہے ہیں اور آخر کار جھانسی تک آتے آتے میں نے یہ بات طے کر لی کہ اپنے قدر شناس قاضی سر عزیز الدین کے پاس چلا جاؤں جو دتیا کے وزیر اعظم ہیں۔

☆☆☆☆

دربدری

جھانسی پہنچ کر میں نے بیوی کو جب اپنے ارادے سے آگاہ کیا تو انہوں نے کہا اچھا یہ بھی کر کے دیکھ لو، وہ بڑی اداسی کے ساتھ ملیح آباد کی طرف روانہ ہو گئیں اور میں ریاست دتیا جانے کے لئے جھانسی اسٹیشن پر اتر گیا۔

دتیا پہنچ کر قاضی صاحب کو میں نے اپنی ساری داستان سنا دی انہوں نے کہا جوش صاحب آپ شخصی حکومت کا بار اٹھانے کے واسطے بنے ہی نہیں ہیں اللہ تعالی نے آپ کو بہت بڑا جوہر عطا فرمایا ہے میری رائے ہے کہ آپ آگرے کو اپنا ہیڈ کوارٹر بنا کر وہاں سے ایک ہفتہ وار اخبار نکالنا شروع کر دیں پرچے کا نام رکھئے ''سلطنت۔۔۔۔۔'' آگرے میں آپ کو رہنے کی دشواری اس لئے نہ ہو گی وہاں آپ کے نانا کا عالی شان محل موجود ہے۔

میں نے کہا قاضی صاحب رائے تو بہت اچھی ہے مگر کس برتے پر اخبار نکالوں انہوں نے جواب دیا کہ آپ ریاست دتیا کے برتے پر اخبار نکالیں سر دست، ریاست آپ کو ساڑھے چار سو فی ہفتہ کے حساب سے سولہ سو روپے ماہانہ دے گی اور سال آئندہ کے بجٹ سے یہ رقم دگنی کر دی جائے گی منظور ہے آپ کو؟ اندھا کیا چاہے دو آنکھیں میں نے ان کی پیش کش فوراً منظور کر لی اس کے بعد انہوں نے کہا آپ اللہ کا نام لے کر یہ کام شروع کر دیں میں دوسری ریاستوں سے بھی آپ کو امداد دلا دوں گا قاضی صاحب کی اس تجویز سے میرا دل باغ باغ ہو گیا۔ اور رات کو مشاغل سے فرصت پا کر سو گیا صبح جب ان کے ساتھ ناشتہ کرنے بیٹھا تو انہوں نے کہا جوش صاحب آپ کے اخبار کی پالیسی کیا ہو گی میں نے کہا آپ فرمائیں انہوں نے کہا پرو برٹش (فرنگی حکومت کی حمایت) یہ سنتے ہی میرا چہرہ ملگجا سا ہو کر رہ گیا قاضی بھانپ گئے انہوں نے بڑے ولولے کے ساتھ میز پر گھونسا مار کر کہا جوش صاحب برٹش ایمپائر (سلطنت برطانیہ) ایک نعمت ہے اور بہت بڑی نعمت اگر یہ حکومت خدانخواستہ

باقی نہ رہی تو میری یہ بات کان کھول کر سن لیجئے کہ ہندو ہم کو کچا چبا ڈالے گا سرکاری نوکری تو بڑی بری چیز ہے وہ ہم پر عرصہ حیات تنگ کر دے گا، گائیں آپ کی کھیتیاں چر لیں گی، اور آپ گائے پر ہاتھ اٹھائیں گے تو کم سے کم آپ کا ہاتھ توڑ ڈالا جائے گا اور یہ بھی ممکن ہے کہ آپ قتل بھی کر ڈالے جائیں ہندو آپ کے خون سے ہولی کھیلے گا آپ کے ایم اے لڑکوں پر ہندو میٹرک کو ترجیح دی جائے گی، اور آپ کے خاندانوں کو تہ تیغ کر دیا جائے گا فرمائیے کیا آپ اس پر تیار ہیں؟ میں نے کہا قاضی صاحب آپ میرے بزرگ ہیں اور یہ بھی سمجھتا ہوں کہ آپ مجھ کو پھلتا پھولتا دیکھنا چاہتے ہیں میں آپ کی اس ہمدردی کا شکریہ ادا نہیں کر سکتا لیکن اس کو کیا کروں کہ مجھ کو انگریزی حکومت سے نفرت ہے میری بات کاٹ کر انہوں نے کہا آپ اپنے دوست جواہر لال کے بہکانے میں آ گئے ہیں دیکھئے یہ آپ کی روزی، اور تمام مسلمانوں کی فلاح کا سوال ہے آپ فیصلے میں جلدی نہ کیجئے۔

لیکن جب ان کے بار بار سمجھانے کے بعد بھی میں نے فرنگی کی حمایت پر آمادگی ظاہر نہیں کی تو انہوں نے مایوس ہو کر کہا اگر آپ برٹش حکومت کی مخالفت کریں گے تو مجھے افسوس ہے کہ ریاست آپ کا ہاتھ نہیں بٹا سکے گی اور اگر میں ریاست سے آپ کی امداد کروں گا تو میری پرائم منسٹری ہی ختم ہو جائے گی میں نے کہا قاضی صاحب میں آپ کو آپ کے وعدے سے سبکدوش کرتا ہوں۔

اور رخصت ہوتے ہوئے، میں نے کہا قاضی صاحب میں آپ کا بے حد شکر گزار ہوں آپ نے تو دل سے یہ چاہا تھا کہ میری زندگی سدھر جائے لیکن میرے مزاج کی انقاد نے سارا کھیل بگاڑ کر رکھ دیا آپ نے مجھ پر کرم کرنا چاہا لیکن میں اس کرم کا بار اٹھا نہیں سکا خطا آپ کی نہیں میری ہے۔

مہر چہ ہست، از قامت کوتاہ بے ہنگام ماست
ورنہ تشریف تو بر بالائے کس کوتاہ نیست

دھول پور آیا تو دھول پور کے سب سے بڑے جاگیردار، اور اپنے حقیقی ماموں کی حویلی کے عوض اپنے پرانے دوست سردار روپ سنگھ کے وہاں ٹھہرا۔

میں نے اپنی روداد سنائی اور کہا کہ مہاراجہ کے پاس آیا ہوں شاید وہ کوئی ملازمت دے دیں روپ سنگھ نے کہا مہاراجہ بڑا پاپی ہے، مجھے اس سے کوئی امید نہیں جب تک تمہاری کوئی صورت نہ نکلے تم میرے ہی ساتھ رہو ملیح آباد جا کر بھابی کو بلا لاؤ۔ نواب صاحب (میرے ماموں) کے باڑے کی حویلی میں ان کو ٹھہراؤ جب تک کوئی بندوبست نہ ہو جائے میں پانچ سو روپے ماہانہ تم کو دیتا رہوں گا جب اچھے دن آئیں تو ادا کر دینا۔

میں نے کہا میں تمہارا بے حد شکر گزار ہوں کہ میرے بے کہے تم میری امداد پر آمادہ ہو گئے روپ سنگھ نے میری بات کاٹ کر کہا یہ کون سی انوکھی بات ہے کیا ہم دونوں بہت پرانے دوست نہیں ہیں؟ کیا تم نے، اپنے ماموں پر ترجیح دے کر میرے یہاں قیام نہیں کیا ہے؟ کیا ہم میں کوئی غیریت ہے؟ میں راج پوت ہوں تم پٹھان، تم مسلمان راج پوت ہو، میں ہندو پٹھان۔

میں نے کہا بھائی روپ سنگھ میں سوچ کر جواب دوں گا روپ سنگھ نے کہا سوچ کر جواب دینے والے کی ایسی تیسی ابھی ابھی جواب دو ورنہ چھاتی پر چڑھ کر گلا دبا دوں گا میں نے ہنس کر کہا ایسی ہول جول کاہے کی ذرا سوچ تو لینے دو یہ سنتے ہی روپ سنگھ نے جست لگائی مجھ کو فرش پر گرا دیا میرے سینے پر چڑھ بیٹھے اور زور زور سے میرا گلا دبا دبا کر کہنے لگے منظور ہے کہ نہیں یا مار ڈالوں؟ میں نے کہا منظور منظور اے ظالم منظور میری آنکھوں سے شکریئے کے آنسو بہنے لگے۔ کانوں سے سنتے تھے ورنہ ستانی بستم می رسد، آنکھوں سے دکھا دیا روپ سنگھ نے دوست ہو تو ایسا میں نے تار دے کر بیوی کو دھول پور بلا لیا وہ چھوٹے دادا اور سخاوت وظفر 1 کو ساتھ لے کر آ گئیں میں بھی روپ سنگھ کے باڑے سے اٹھ کر ماموں کے باڑے آ گیا اور ان کی خالی حویلی میں رہنے لگا

کئی بار مہاراجہ دھول پور سے ملا، ہر بار انہوں نے ملازمت کا وعدہ کیا لیکن ایفاء کی نوبت نہیں آئی جب اس گومگو میں دو تین مہینے گزر گئے تو مجھے تشویش ہونے لگی کہ آخر ماجرا کیا ہے۔

اسی اثناء میں خواب دیکھا کہ مولوی احمد حسین 2 صاحب فرما رہے ہیں کہ مہاراجہ سے کوئی امید نہ رکھئے آپ ایک رند پاک باطن ہیں، وہ بگلا بھگت صبح ایک تار آئے گا اس پر عمل کیجئے گا میں نے بیدار ہوتے ہی روپ سنگھ کو یہ خواب سنا دیا انہوں نے کہا یہ خواب تو ایسا ہے کہ اس کے سچے جھوٹے ہونے کا تو آج ہی پتہ چل جائے گا۔

اس کے کوئی دو گھنٹے کے بعد جب ہم لوگ ناشتے سے فارغ ہو کر گپ شپ کر رہے تھے کہ مہاراجہ کے پرائیویٹ سیکرٹری آ گئے اور مجھ سے کہا میں آپ سے تخلئے میں کچھ باتیں کرنا چاہتا ہوں اور جب میں ان کو دوسرے کمرے میں لے گیا تو انہوں نے کہا سرکار فرماتے ہیں کہ میرا اور جوش صاحب کا معاملہ تو ایسا ہے جیسا درخت اور چھال کا ہوتا ہے اگر وہ یہاں سے چلے گئے تو میں بے بکل کا درخت ہو جاؤں گا میں جوش صاحب کو ایک اچھا سا عہدہ دینا چاہتا ہوں مگر دو شرطیں ہیں ایک تو کہ وہ شراب ترک کر دیں اور دوسری یہ ہے کہ روپ سنگھ 3 سے ملنا چھوڑ دیں میں نے کہا مہاراجہ سے جا کر کہہ دیجئے کہ انہوں نے میری ذات کے ساتھ جس یگانگی کا اظہار کیا ہے میں اس کا تہہ دل سے شکر گزار ہوں لیکن اس کے باوجود نہ تو میں شراب ہی ترک کروں گا نہ روپ سنگھ ہی کی محبت سے دست بردار ہوں گا۔

روپ سنگھ پردے کی آڑ سے یہ باتیں سن رہے تھے میرا یہ آخری فقرہ سن کر وہ یہ 1 ایک پرزہ وہ دوسرا ملازم 2 آگے ان کا تفصیلی حال آئے گا 3 روپ سنگھ مہاراجہ کے ساتھ کھیلے ہوئے دوستوں میں تھے جو اب معتوب ہو چکے تھے۔

کہتے کمرے میں در آئے کہ سیکرٹری صاحب ٹھہریئے سرکار سے جا کر کہہ دیجئے کہ جوش شراب بھی چھوڑ دیں گے اور روپ سنگھ سے بھی منہ پھیر لیں گے۔ سیکرٹری نے

پوچھا جوش صاحب آپ کیا کہتے ہیں میں نے کہا میں شراب اور روپ سنگھ دونوں کو نہیں چھوڑوں گا مجھے سرکار کی یہ دونوں شرطیں منظور نہیں ہیں روپ سنگھ نے ڈپٹ کر کہا تم کو چھوڑنا پڑیں گی یہ دونوں چیزیں میں نے کہا نہیں چھوڑوں گا نہیں چھوڑوں گا نہیں چھوڑوں گا اور اسی شور وغل میں سیکرٹری صاحب ارے رام ایسی پکی دھن ایسی پکی دوستی کہتے ہوئے رخصت ہو گئے۔

سیکرٹری کے چلے جانے کے بعد روپ سنگھ نے انگلی اٹھا کر کہا تم ڈیم فول ہو، سارا بنا بنایا کھیل بگاڑ دیا میں نے کہا تم ڈیم فول ہو، میں نے سارے بگڑے ہوئے کھیل کو سنوار دیا انہوں نے کہا تم اپنی غلطی تسلیم نہیں کرو گے؟ میں نے کہا تم اپنی غلطی تسلیم نہیں کرو گے؟ انہوں نے کہا میں ہرگز ہرگز اپنی غلطی تسلیم نہیں کروں گا اب میں نے جست کر کے ان کو گرا دیا سینے پر چڑھ بیٹھا، اور ان کا گلا دبا کر کہا تسلیم کرو اپنی غلطی انہوں نے کہا اچھا باوا جان تو چھوڑ دو، میں ہی غلطی پر ہوں میں ان کے سینے سے اتر آیا اور وہ مجھے گلے لگا کر رونے لگے کہ میری خاطر تم نے بہت بڑا ایثار کیا۔

اب ہم پھر برآمدے میں آ کر بیٹھ گئے روپ سنگھ نے کہا تمہارے خواب کا پہلا حصہ تو سچا نکلا کہ مہاراجہ سے قطع تعلق ہو گیا اب اگر تار بھی آ گیا تو پورا خواب سچا ثابت ہو جائے گا۔

☆☆

رسالہ ''کلیم'' کا دہلی سے اجراء

دہلی پہنچا تو مسز نائیڈو برس پڑیں کہنے لگیں ذرا اس کا نام تو بتایئے جس نے آپ کو یہ خبر دی تھی کہ سروجنی مر چکی ہے۔۔۔ میں نے حیران ہو کر پوچھا یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں؟ انہوں نے کہا یہ میں اس لئے کہہ رہی ہوں کہ اگر آپ مجھ کو زندہ سمجھتے تو سیدھے میرے پاس آ کر اپنی بپتا کہتے اور میرا جواب سنے بغیر انہوں نے سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا کہ اگر گھوش مجھ کو نہ لکھتے تو مجھے یہ پتا ہی نہ چلتا کہ آپ دھول پور میں اپنے کسی دوست روپ سنگھ کے وہاں ٹھہرے ہوئے ہیں۔

میں نے معذرت کے واسطے لب کھولے ہی تھے کہ انہوں نے کہا میں آپ کے ٹمپرامنٹ سے واقف ہوں کچھ نہ کہئے میری خواب گاہ میں جایئے میرے تکئے کے نیچے ایک بڑا سا لفافہ رکھا ہوا ہے اسے کھولے بغیر اپنی جیب میں رکھ لیجئے ذرا سنبھال کر رکھئے گا تا کہ گر نہ جائے اب آپ کا یہ کام ہوگا کہ دہلی سے ایک نیم ادبی و نیم سرکاری ماہ نامہ نکالیں گے اور کسی ریاست کی طرف مڑ کر بھی نہیں دیکھیں گے میں اشتہار بھی دلا دوں گی۔

میں رسالے کا نام ''کاخ بلند'' رکھنا چاہتا تھا میرے دوست ذوالفقار علی صاحب بخاری نے رائے دی کہ میں رسالے کا نام کلیم رکھوں کاخ بلند نام مشکل ہے میں نے یہ رائے مان لی اور رسالے کے اجراء کے ابتدائی مراحل میں سرگرم ہو گیا۔

رسالہ نکالنا ایک تجارتی امر ہے میری سات پشتیں بھی تجارت سے واقف نہ تھیں اس لئے ابتدائی مراحل ہی میں بہت سا روپیہ برباد ہو گیا اور اس کے ساتھ ساتھ میرے دہلی کے احباب نے مجھے گھیر لیا روز بوتلیں کھلنے اور دعوتیں ہونے لگیں اور کاتبوں کاغذ والوں بلاک سازوں اور چھاپہ خانے والوں نے بھی یہ سمجھ کر کہ میں سرا سر لر آدمی ہوں مجھے دونوں ہاتھوں سے لوٹنا شروع کر دیا جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ابھی دوسرا پرچہ شائع نہیں ہوا تھا کہ تمام روپیہ تر بھر ہو گیا شرم آئی کہ مسز نائیڈو سے یہ داستان

کہوں اور سوچنے لگا کہ اب کیا کیا جائے اب کوئی بات سمجھ میں نہیں آئی تھی کہ بیمار پڑ گیا بخار اس قدر تیز آیا کہ حواس گم ہو گئے اور نزلہ اس قدر شدید ہوا کہ تمام سینہ رندھ کر رہ گیا اور سانس بھی رک رک کر آنے لگی اور میں سمجھا کہ اب جان برنہیں ہوسکوں گا۔

میں اس زمانے میں فتح پوری کے کراؤن ہوٹل میں ٹھہرا ہوا تھا بڑی مشکل سے ایک پرچہ پر میں نے مسز نائیڈو اور جواہر لال کا نام لکھا اور پرچہ لے کر کراہتا نیچے آیا مینجر کو وہ پرچہ دے کر کہا اگر میں مر جاؤں تو فوراً ان دونوں کو خبر کر دیجئے گا مینجر نے بے حد بدحواس ہو کر مجھ سے کہا جوش صاحب خدا کے واسطے خودکشی نہ کیجئے گا مجھ کو مینجر کی بوکھلاہٹ پر ہنسی آ گئی اور کہا مینجر صاحب میں بزدل نہیں کہ خودکشی کروں میری حالت خراب ہے اس لئے سوچا کہ مسز نائیڈو اور جواہر کو خبر ہو جائے مینجر دوڑا ہوا گیا اور ڈاکٹر سید ناصر عباس صاحب کو جن کا مطب وہاں سے دس قدم پر تھا اپنے ساتھ لے آیا ڈاکٹر صاحب مجھے پہلے سے جانتے تھے میرے سینے کا معائنہ کیا اور مطب جا کر، اپنے آدمی کے ہاتھ دوائیں بھیج دیں۔

دوائیں پی کر ابھی لیٹا ہوا اپنی بے کسی پر غور اور اپنی موت کی آمد کا انتظار کر ہی رہا تھا کہ آہٹ محسوس ہوئی اور پنڈت شیونرائن صاحب (جن کا مطبع ہوٹل سے ملا ہوا تھا اور جن کو مطلبی فرید آبادی مجھ سے ملا چکے تھے میرے کمرے میں داخل ہو گئے) میں نے کہا آیئے شیونرائن صاحب افسوس کہ میں اٹھ نہیں سکتا آپ میرے سرہانے بیٹھ جائیں مزاج پرسی کے بعد انہوں نے کہا جوش صاحب مجھ کو اندازہ ہو گیا ہے کہ آپ رسالہ نہیں نکال سکتے میں کاروباری آدمی ہوں میرے پاس اپنا ذاتی چھاپہ خانہ بھی ہے اس لئے آپ پسند کریں تو میں آپ کا پچاس فیصد شریک ہو جاؤں۔ قلم آپ کا چلے گا روپیہ میں لگاؤں گا اور جب تک رسالہ چلنے نہ لگے پان سو روپیہ ماہانہ آپ کو بطور پیشگی دیتا رہوں گا میں نے اس تجویز کو لطیفہ غیبی سمجھا اور فوراً قبول کر لیا۔

دو چار دن کے اندر پنڈت شیونرائن نے ہوٹل کے سامنے ہی دو کمروں اور کشادہ

صحن کا فلیٹ دفتر اور میری سکونت کے واسطے کرایہ پر لے لیا اور میں ہوٹل سے وہاں اٹھ آیا۔

اس کے کچھ روز کے بعد جب میں نے ان سے کہا کہ میں اپنی بیوی کو بھی یہاں لے آنا چاہتا ہوں تو انہوں نے قرول باغ میں ایک کوٹھی کرایہ پر لے کر اس کو فرنیچر سے آراستہ کر دیا اور میں بیوی کو لے آنے کے لئے دھول پور چلا گیا۔ وہاں پہنچ کر یہ معلوم ہوا کہ میری بیٹی بیمار ہے بیوی اس کو آگرے لے کر چلی گئیں اور کسی ہسپتال میں وارڈ لے کر مقیم ہیں اور میرا بیٹا میرے دوست لطیف الدین کے مکان میں رہتا ہے سخاوت اور ظفر و بھاگ چکے ہیں دوسری ہی گاڑی سے گھبرایا آگرے۔ لطیف کے گھر گیا، دیکھا کہ میرا بیٹا اور اس کا چچا زاد بھائی دونوں ایک نہایت بوسیدہ اور میلی دری پر اداس بیٹھے ہیں میرے بیٹے نے مجھے دیکھا دوڑ کر میرے گلے لگ گیا اور روہانسی آواز میں کہنے لگا ابا ہم یہاں اس دری پر سوتے ہیں ہم کو چارپائیاں بھی نہیں دی گئی ہیں اور ہم روز دس روپے دیتے ہیں تو ہمیں کھانا ملتا ہے اور وہ بھی ابا سلاجی چاہا چیخیں مار مار کر رونے لگوں لیکن اس خیال سے ضبط کیا کہ میرے پرانے دوست لطیف برا مانیں گے غالباً لطیف کی معاشی حالت اس وقت بگڑ چکی تھی۔

لڑکے کو لے کر ہسپتال پہنچا دیکھا بیوی کا منہ اترا ہوا ہے اور بیٹی نڈھال پڑی ہے اس کی چارپائی پر بیٹھ کر میرے منہ سے چیخ نکل گئی اور آنسو جاری ہو گئے بیٹی بھی رونے لگی بیوی نے آنسو پونچھ کر کہا اللہ کے لئے اس طرح نہ روؤ، میرا دل ٹکڑے ٹکڑے ہو جائے گا ارے ہم کیا ہیں بڑی بڑی شہزادیوں پر اس سے بھی برے وقت پڑ چکے ہیں اللہ کا شکر کرو لڑکی کو پلورلیسی ہو گئی تھی اب اچھی ہو چکی ہے بس طاقت آنے کی دیر ہے۔

میں نے بیوی سے کل حالات بیان کر دیئے انہوں نے کہا بس آٹھ دن کی دیر ہے یہاں ٹھہر جاؤ، پھر ہم سب ساتھ دہلی چلیں گے۔

آٹھویں دن دہلی آ گیا، قرول باغ کی کوٹھی آباد ہو گئی۔۔۔۔ ''کلیم'' اچھا خاصہ چلنے لگا، معقول آمدنی ہونے لگی، میری نظموں کے دو مجموعے بھی چھپ گئے حیدر آباد سے عتابی وظیفہ بھی جاری ہو گیا اور زندگی چین سے گزرنے لگی۔

سال دو سال آرام سے گزرنے کے بعد، میری زندگی پھر ایک بحران کی جانب مڑ گئی ایک روز شام کے وقت شیونرائن خشک چہرے کے ساتھ آئے اور کلیم سے اپنی دست برداری کا اعلان کر کے کہہ دیا کہ کل سے آپ اپنا پرچہ خود سنبھالیں۔

یہ سچ ہے کہ شیونرائن صاحب نے اپنے بھائیوں کے دباؤ میں آ کر یہ بات کی تھی، مگر ان کا یہ اخلاقی فریضہ تھا کہ وہ مجھے کم سے کم تین مہینے کا نوٹس دیتے، مگر انہوں نے صرف بارہ گھنٹے کا نوٹس دے کر علیحدگی اختیار کر لی۔۔۔ میں سیدھا اپنے پڑوسی محمود علی خان جامعی کے پاس پہنچا، اور کلیم کا کاروبار ان کے سپرد کر دیا لیکن جب ایک مہینہ کے بعد انہوں نے کلیم کی آمدنی کے صرف نوے روپے میرے حوالے کئے تو میں دنگ ہو کر رہ گیا مگر فرط مروت سے کچھ کہہ نہ سکا (خدا غارت کرے اس مروت کو، اے خدا مروت کو کیا غارت کرے گا، خود مروت نے مجھ کو غارت کر کے رکھ دیا آج بھی غارت کئے ہوئے ہے اور انشاءاللہ مرتے دم تک غارت کرتی رہے گی)

جب اور کوئی صورت سمجھ میں نہیں آئی تو میں نے مسٹر پانی کار کو خط لکھا اور پانی کار نے تار بھیج کر مجھ کو پٹیالہ بلا لیا پٹیالے پہنچتے ہی انہوں نے مجھے مہاراجہ پٹیالہ بھوپندر سنگھ سے ملوا کر میرا وظیفہ مقرر کرا دیا۔ اب دہلی آ کر میں نے محمود علی خان سے رسالہ نکال لیا۔ قرول باغ سے دریا گنج اٹھ آیا۔ ایک کوٹھی ادیبہ بھون کرائے پر لے لی ایک لکھے پڑھے ذہین پنجابی نوجوان اور دہلی کے دو تجربہ کار بوڑھوں کو ملازم رکھ کر میں

1 وہ مدراسی زبان کے شاعر ادیب اور مہاراجہ پٹیالہ کے وزراء میں سے تھے جن سے سروجنی نائیڈو ملا چکی تھیں۔

خود رسالہ نکالنے لگا، اور حکیم حضرت آزاد انصاری بھی میرا ہاتھ بٹانے لگے اور

حیرت ہے کہ خود میری بیوی بھی کلیم کے کاروبار میں میری دستگیری کرنے لگیں اور ''کلیم ''صوری و معنوی، دونوں حیثیتوں سے دن دونی رات چوگنی ترقی کرنے لگا۔

میں نے اسی زمانے میں اپنی چچا زاد بہن کے بیٹے التفات احمد خان سے اپنی بیٹی سعیدہ کی بڑی دھوم دھام سے شادی بھی کر دی، میری بیٹی کی شادی کا کھانا پکوایا تھا قرول باغ کے عبداللہ صاحب نے اور ایسا اچھا کھانا پکوایا تھا کہ باید و شاید خدا جانے عبداللہ صاحب اب کہاں ہیں جہاں کہیں بھی ہوں میری یہ آواز سن لیں کہ میں آج تک ان کو یاد کرتا ہوں اور اس کے ساتھ ساتھ، اس موقع پر میرے جگری دوست سردار دیوان سنگھ مفتون نے جس خلوص کے ساتھ میرا ہاتھ بٹایا تھا میں اسے بھی فراموش نہیں کر سکتا اور دہلی کلاتھ مل کے لالہ شنکر لال اور سروجنی نے جو تحائف دیئے تھے میرے دل میں ان کی یاد اور ان کا تشکر بھی آج تک شاداب ہے۔

کلیم کی روز افزوں ترقی نے میرے بہت سے دشمن بھی پیدا کر دیئے تھے اور ایسا کیوں نہ ہوتا اس لئے کہ فرنگی حکومت کی تہذیب، سرمایہ داری کی تدفین، سوشلزم کی تبلیغ اقوال و اوہام کی تضحیک، فکر و تامل کی ترغیب، کانگریس کی تحکیم، اور مسلم لیگ کی تنقیص اس کی پالیسی میں داخل تھی اور اسی بناء پر شاہ فرنگی اور شاہ صاحب دونوں مجھ سے بگڑ گئے تھے جس کا نتیجہ یہ برآمد ہوا تھا کہ کانگریس کے غلامی پرست مخالفین مسلم لیگ کے ''خطاب یافتہ مجاہدین'' حکومت کے کفش بردار حکام اور منبر و محراب پر بلبلانے والے سرکاری وظیفہ خوار علمائے کرام لنگر لنگوٹ باندھ باندھ کر اکھاڑے میں اتر آئے تھے۔

ادھر پلٹنیں تھیں اور ادھر میں ایک فرد واحد تھا کہ آواز دے رہا تھا۔

من و گرز و میداں و افراسیاب

1 میں کلیم کے دور آخر میں تحریک پاکستان کا حامی بن گیا تھا اور پاکستان کی حمایت میں ایک بہت بڑے مجمع کے سامنے سامنے گنگا پرشاد میموریل ہال کی چھت کے نیچے

ایک ایسی گھن گرج نظم پڑھی تھی کہ ہال گونجنے لگا تھا اور میرے سینکڑوں کانگریسی دوستوں کو مجھ سے بے حد شکایت پیدا ہو گئی تھی (وہ نظم میرے کسی مجموع میں شائع بھی ہو چکی ہے)

آئے دن میرے خلاف کفر کے فتوے نکلا کرتے اور قتل کی دھمکیوں کے گم نام خط آیا کرتے تھے خفیہ پولیس سائے کی مانند میرا تعاقب کرتی تھی اور بیوی چلاتی رہتی تھیں کہ ارے منہ اندھیرے ٹہلنا چھوڑ دو، نہ جانے اندھیرے میں کون پیچھے سے آ کر چھری مار دے لیکن میں ہر روز تاروں کی چھاؤں میں ایک زبردست تنبیہ الغافلین قسم کا ڈنڈا لے کر جمنا کے کنارے بڑے اطمینان کے ساتھ ٹہلا کرتا تھا کہ آخر میں بھی آفریدی پٹھان ہوں دو چار کو مار کر مروں گا۔

آں نہ من باشم کہ روز جنگ، بینی پشت من
آں منم، کاندر میان خاک و خوں بینی سرم

اس کلیمہ دور میں ایک بار سر تیج بہادر سپرو صاحب نے مجھ سے کہا جوش صاحب اگر آپ برٹش ایمپائر کی موافقت میں اور سوشلزم کے خلاف نظمیں کہنا اور مضامین لکھنا شروع کر دیں تو تھوڑی ہی مدت میں لکھ پتی بن سکتے اور حکومت سے خطاب حاصل کر سکتے ہیں بڑے بڑے والیان ریاست آپ کی شاعری کے رومانٹک اور نیچرل سینریز کے حصوں کو بہت پسند کرتے ہیں اگر آپ اپنی یہ روش بدل دیں تو ریاستوں سے بھی آپ کی لٹریری پنشنیں مقرر ہو سکتی ہیں۔

میں نے کہا سپرو صاحب آپ میرے باپ کے احباب میں سے ہیں میں آپ کو اپنا بزرگ سمجھتا ہوں لیکن آپ برا نہ مانیں تو اتنا عرض کروں کہ شاعری ایک خالص وجدانی معاملہ ہے جس کو جلب منفعت کا ذریعہ بنانا گناہ ہے اس لئے مجھ کو یہ امر اپیل نہیں کرتا کہ اگر میں حکومت یا امراء کی تعریف کروں گا تو دولت مند ہو جاؤں گا۔ شاعری کو جانچنا چاہئے اس کے مفید یا مضر اثرات کی روشنی میں ۔۔۔۔۔۔اور اگر محکم

دلائل کے ساتھ آپ اس امر کو ثابت فرما دیں کہ ہندوستان کے واسطے انگریز کی حکومت، اور والیان ریاست کی ہستی مفید اور بابرکت ہے تو میں اپنی روش ترک کر دوں گا۔

یہ سن کر سپرو کے چہرے پر ندامت کے ساتھ ساتھ غیظ کے ہلکے ہلکے آثار پیدا ہو گئے اور انہوں نے اپنے تلخ لہجے میں ملائم تبسم کی پھیکی سے شیرینی پیدا کر کے مجھ سے فرمایا کہ اگر یہ بات ہے تو کیا میں آپ سے دریافت کر سکتا ہوں کہ پھر آپ حیدر آباد اور پٹیالے سے وظائف کیوں لیتے ہیں؟۔۔۔۔۔۔۔ میں نے کہا سپرو صاحب غالباً آپ کا یہ خیال ہے کہ میں منکر مے بودن و ہم رنگ مستاں زیستن پر عمل پیرا ہوں مجھے بڑی خوشی ہے کہ آپ نے یہ سوال کر کے مجھے اس کا موقع دے دیا کہ میں اپنی پوزیشن صاف کر دوں پہلی بات یہ عرض کرتا ہوں کہ ان والیان ریاست کے پاس جو دولت ہے وہ ان کی نہیں، بلکہ عوام کی ہے اس لئے کہ وہ ہماری محنت کی پیدا کردہ اور انسان کے ضائع شدہ حقوق کا نتیجہ ہے اس لئے ہمارا یہ فرض ہے کہ ہم قوت استعمال کر کے، ان کی دولت چھین لیں اور اس کا عامتہ الناس میں تقسیم کر دیں اور جب تک وہ قوت حاصل نہ ہو ہم کو چاہئے کہ ان کی دولت سے تمتع کی سعی کرتے رہیں۔

اگر ہم اپنے اصول قربان کئے بغیر، ان سے ایک روپیہ بھی وصول کر لیں تو اس کے یہ معنی ہوں گے کہ ہم نے ان کو بقدر یک روپیہ کم زور کر دیا، اور اپنے کو بقدر یک روپیہ قوی بنا لیا۔۔۔۔ اور وہ ایک روپیہ جو مسخروں اور بھانڈوں بھگتیوں پر ضائع ہو جاتا، اپنے مصرف میں لا کر ہم نے اس سے بہتر کام لیا۔

یہ تو مختصر سا اصولی جواب ہے اب میری دونوں پنشنوں کی روداد سن لیجئے۔۔۔۔۔۔ جہاں تک میری حیدر آباد کی پنشن کا تعلق ہے وہ پنشن عتابی پنشن ہے میں نے نظام کے خلاف نظم کہی، معتوب ہوا اور حسب روایت خاندان آصفیہ پنشن کا مستحق ٹھہرا دیا گیا اور اب تک سرتابی کی داد حاصل کر رہا ہوں۔۔۔۔۔ اب رہا

پٹیالے کی پنشن کا معاملہ تو میری وہ پنشن سیاسی نہیں خالص ادبی ہے آج تک مہاراجہ نے مجھ سے یہ نہیں کہا کہ میں فرنگی کے خلاف شعر کہنا یا کھدر پہننا ترک کر دوں اگر مہاراجہ کی پنشن مجھے میرے اصول سے منحرف کر دیتی تو مجھ سے زیادہ ذلیل اور کون ہو سکتا تھا لیکن اس عالم میں کہ وہ پنشن قطعی طور پر غیر مشروط ہے میں اس سے کیوں نہ فائدہ اٹھاؤں۔

میری یہ باتیں سن کر سپرو خاموش ہو گئے لیکن چہرے پر تکدر کی شکنیں ابھر آئیں اور ان کے چشم و ابرو سے یہ بات ٹپکنے لگی گویا میں نے براہ راست ان کی اہانت کر دی ہے۔

وہ تا حیات مجھ سے روٹھے رہے سچ کہا ہے صائب نے:

گفتار صدق مایہ آزار می شود
چوں حرف حلق بلند شد دوار می شود

☆☆

سیاست افرنگ کے دورخ

ساڑھے تین یا چار برس تک اپنے ماہ نامہ ''کلیم'' کو کامیابی سے چلا کر اور ایک ایسے رومانی عذاب میں گرفتار ہو کر جس نے میرے حواس چھین لئے تھے میں دہلی کی زندگی تج کر ملیح آباد[1] چلا گیا۔ اور چوں کہ میں رسالے کے کام کا نہیں رہا تھا، میں نے اپنے داماد التفات احمد کو مینیجر بنا دیا۔ لیکن جب یہ دیکھا کہ وہ نام خدا بالکل نکھٹو ہیں، میں نے ''کلیم'' بند کر کے مجاز، علی سردار، اور سبط حسن کی درخواست پر اس کو ان لوگوں کے رسالہ ''نیا ادب'' میں ضم کر دیا جو ''کلیم دنیا ادب'' کے از روئے قواعد غلط نام کے ساتھ لکھنو سے جاری ہو گیا۔

کہتے ہیں کہ وقت سب سے بڑا مرہم ہے ملیح آباد آ کر چھ سات مہینے کے بعد میرے دل کا زخم بڑی حد تک مندمل ہو گیا۔ اور میں ''قصر سحر'' کی چمن بندی، اور توسیع میں لگ گیا۔

ارے میں ادب نقیب، کشتہ التفات حبیب، اور باغوں کی تنصیب ۔۔۔۔۔۔ لیکن مرتا کیا نہ کرتا ۔۔۔۔۔۔ بیوی تل گئیں آموں کے باغ لگوانے پر اور ایسی تل گئیں کہ کھانا پینا دوبھر کر دیا۔ ہر آن یہ رٹ لگ گئی کہ باغ لگاؤ، اور جب تک باغوں میں قلم نہ لگ جائیں قلم نہ اٹھاؤ۔ میں نے اسی زمانے میں ایک طویل ڈرامائی نظم ''حرف آخر'' شروع کی تھی انہوں نے وہ نظم بھی نہیں کہنے دی۔[2]

[1] غالباً 1940ء میں [2] اور آج تک وہ نظم نا تمام پڑی ہوئی ہے نہ جانے اس کو تمام بھی کر سکوں گا یا نا تمام ہی چھوڑ کر سدھار جاؤں گا۔

تنگ آ کر میں نے ماتا دین پٹواری کو بلایا پٹواری نے کہا منجھلے بھیا[1] اب قانون بدل گیا ہے آپ کسی کاشتکار کو بے دخل کر کے اس سے زمین نہیں نکال سکتے اور جب زمین ہی نہیں نکل سکے گی تو باغ کیسے لگے گا۔

ماتا دین کی یہ بات سن کر میں باغ باغ ہو گیا کہ چلو ایک بڑی مصیبت کٹ گئی میں

خوشی خوشی بیوی کے پاس گیا اور جھوٹ موٹ کا غمگین چہرہ بنا کر پٹواری کی بات دہرا دی لیکن بیوی مایوس نہیں ہوئیں مجھے اور پٹواری کو ساتھ لے کر گاؤں گئیں، تھانے کے سامنے کاشتکاروں کو جمع کر کے، پٹواری سے کہا پوچھو کاشتکاروں سے کہ منجھلے بھیا[1] نے کیا تم پر کوئی ظلم ڈھایا ہے؟ تم پر لگان وصول کرنے میں کبھی سختی کی ہے تم سے کبھی بیگار لیا ہے اور جب ماتا دین نے یہ تمام سوالات کئے تو ہر طرف سے آوازیں آنے لگیں نا ہیں، نا ہیں کبھو نا ہیں (نہیں نہیں کبھی نہیں) منجھلے بھیا کی جی منجھلے بھیا کا راج بنا رہے گنگا دھار تک (جب تک گنگا میں پانی ہے) پھر بیوی نے کہا ماتا دین سے پوچھو اگر بھیا باغ لگانے کے لئے تم لوگوں سے تھوڑی تھوڑی زمین مانگیں تو کیا تم نہیں دو گے؟ ساری رعایا نے یک زبان ہو کر کہا ''دیبا، دیبا، ابھوں ابھوں دیبا، گلے گلے دیبا (دیں گے، دیں گے، ابھی ابھی دیں گے، گلے گلے دیں گے)''

اس کے بعد ماتا دین نے استعفے نکالے اور کاشتکاروں نے دھڑا دھڑ انگوٹھے لگانا شروع کر دیئے اور جب تمام استعفے مکمل ہو گئے بیوی نے مجھ سے کہا اب تم ان کا شکریہ ادا کرو اور جب میں شکریہ ادا کرنے کھڑا ہوا تو تمام کاشتکار رونے لگے بھیا، ہم تو تمہاری پنہئی ہیں اس نہ کرو بھیا ہم تو تمہاری جوتی ہیں ایسا نہ کرو۔

بیوی نے مٹھائی تقسیم کی، رعایا نے منجھلے بھیا کی جے کے نعرے لگائے اور دو تین مہینے کے اندر آم کے باغ نصیب ہو گئے اور بیوی نہال ہو گئیں۔

میں غالباً 1941ء میں پھر لکھنؤ آ کر رہنے لگا یہ سچ ہے کہ ملیح آباد میں بے حد سکون تھا امانی گنج کے میدان کی خالص ہوائیں تھیں، طلوع و غروب کے مناظر تھے۔

[1] پہلے بھیا تھا اب بوڑھا کھوسٹ ہوں

بوری خوشبو، کوئل کی کوکو اور پپیہے کی پی ہو تھی اور لکھنے پڑھنے کی فرصت۔

لیکن آدمی، مدنی حیوان ہے شام کو جب لکھنے پڑھنے کے جج اکبر سے فارغ ہو کر بادہ خواری کی عبادت شروع کرتا تھا تو شدید تنہائی کے سوا کسی کو شریک نہیں پاتا تھا اور

دوستوں کو آنکھیں ڈھونڈنے لگتی تھیں اور چونکہ۔

زاہد کی نماز ہو کہ مے کش کی شراب
دونوں کا مزا ہے با جماعت ساقی

اپنی تنہائی پر دل اداس ہو کر رہ جاتا۔

ایک روز اس گھٹن میں پی رہا تھا کہ دل ڈوبنے لگا، یاروں کے چہرے، اور دل داروں کے مکھڑے آنکھوں کے نیچے پھرنے لگے رباعی کا ایک مصرع زبان پر جاری ہو گیا۔

افسوس، شراب پی رہا ہوں تنہا

جی میں آیا کہ قافیے کو ''ن'' کی شرط پر لگا کر کہوں ان کی شرط لگا کر ''تنہا'' کا ''نباہ'' بڑا ہی مشکل نظر آیا بہر حال طبیعت پر زور ڈال کر رباعی کہہ ڈالی آپ بھی سن لیں اور میری جگر کاوی کی داد دیں۔

افسوس، شراب پی رہا ہوں تنہا
غلطاں بسبو، تمام خون فن ہا
ٹھہری ہوئی، ساغر میں نظر آتی ہے
صہبا۔۔۔۔ رضی اللہ تعالیٰ عنہا

ہاں تو میں یہ کہہ رہا تھا کہ ملیح آباد کی بے احباب شاموں سے تنگ آ کر، میں لکھنو چلا گیا تھا اور لگے ہاتھوں اگر یہ بھی بتا دوں کہ آپ کو میری گھٹن کا پورا اندازہ ہو جائے گا کہ اکثر ایسی بھیانک شامیں بھی گزرتی تھیں کہ میرے اقرباء مجھے گھیر لیا کرتے، اپنے دیوانی فوجداری مقدمات کے روح فرسا تذکرے چھیڑ دیتے۔ فوجداری کے وقت، دشمن کے حملے کو خالی دے جانے اور اس پر کاری ضرب لگانے کے گر، اور کالے سانپوں سے بچنے کے پینترے بتایا کرتے تھے۔

ایک روز جب میں اپنی بنارسی باغ کے پھاٹک کے سامنے والی کوٹھی میں بیٹھا لکھنو

کے گورنر کی تقریر ریڈیو پر سن رہا تھا جس میں اہل ہند سے یہ اپیل کی گئی تھی کہ وہ انسانیت کے مستقبل کو بچانے کی خاطر، جنگ عظیم میں، برطانیہ کی مدد پر کمر بستہ ہو جائیں، اس وقت میں نے یہ مندرجہ ذیل نظم ایسٹ 1 انڈیا کمپنی کے فرزندوں سے خطاب کے نام سے پندرہ منٹ کے اندر کہہ ڈالی تھی۔

کس زباں سے کہہ رہے ہو آج اے سوداگرو
دہر میں، انسانیت کے نام کو اونچا کرو
جس کو سب کہتے ہیں ہٹلر، بھیڑیا ہے، بھیڑیا
بھیڑیئے کو مارو گولی، پئے امن و بقا
باغ انسانی میں، چلنے ہی پہ ہے باد خزاں
آدمیت لے رہی ہے، ہچکیوں پہ ہچکیاں
بات ہے ہٹلر کا، رخش خود سری کی باگ پر
تیغ کا پانی چھڑک دو، جرمنی کی آگ پر

2

سخت حیراں ہوں کہ محفل میں تمہاری، اور یہ ذکر!!
نوع انسانی کے مستقبل کی اب کرتے ہو فکر!!
جب، یہاں آئے تھے تم، سوداگری کے واسطے
نوع انسانی کے مستقبل سے کیا واقف نہ تھے

1 یہ نظم چونکہ انتہائی غیظ وغضب کے عالم میں کہی گئی تھی اس لئے اس میں شاعرانہ محاسن کی تلاش نہ کیجئے اور چونکہ یہ نظم ضبط ہو جانے کی بناء پر میرے کسی مجموعے میں شامل نہیں ہوسکی ہے اس لئے اس کو یہاں درج کررہا ہوں تا کہ محفوظ ہو جائے۔

ہندیوں کے جسم میں، کیا، روح آزادی نہ تھی؟
سچ بتاؤ، کیا وہ انسانوں کی آبادی نہ تھی؟

3

اپنے ظلم بے نہایت کا فسانہ یاد ہے؟
کمپنی کا بھی وہ دور مجرمانہ یاد ہے؟
لوٹتے پھرتے تھے تم جب کارواں در کارواں
سر برہنہ پھر رہی تھی دولت ہندوستاں
دست کاروں کے انگوٹھے کاٹتے پھرتے تھے تم!
سرد لاشوں سے، گڑھوں کو پاٹتے پھرتے تھے تم!
صنعت ہندوستاں پر، موت تھی چھائی ہوئی
موت بھی کیسی۔۔۔۔ تمہارے ہاتھ کی لائی ہوئی

4

اللہ اللہ، کس قدر، انصاف کے طالب ہو آج
میر 1 جعفر کی قسم، کیسا دشمن حق تھا سراج 2
وہ اودھ کی بیگموں کا بھی ستانا یاد ہے؟
یاد ہے، جھانسی کی رانی کا زمانا یاد ہے؟
ہجرت سلطان دہلی کا سماں بھی یاد ہے؟
شیر دل ٹیپو کی خونیں داستاں بھی یاد ہے؟
تیسرے فاقے میں اک گرتے ہوئے کو تھامنے
کن کے سر 3 لائے تھے تم شاہ ظفر کے سامنے

1 ہندوستان کا روسیاہ غدار (ایسے غداروں کی ہندوستان میں کبھی کمی نہیں رہی)

2 نواب سراج الدولہ بہادر (جو ہندوستان کا سپوت تھا)

3 خونی دروازے میں شہزادوں کے سر کاٹ کر، ان کے باپ حضرت ظفر کے سامنے خوان میں رکھ کر لائے گئے تھے۔

یاد تو ہو گی، وہ مُیا 1 برج کی بھی داستان؟
اب بھی، جس کی خاک سے رہ رہ کے اٹھتا ہے دھواں
تم نے قیصر باغ کو دیکھا تو ہو گا بارہا؟
آج بھی آتی ہے جس سے ہائے اختر کی صدا 2
سچ کہو، کیا حافظے میں ہے، وہ ظلم بے پناہ
آج تک رنگون 3 میں، اک قبر ہے جس کی گواہ
ذہن میں ہو گا یہ تازہ ہندیوں کا داغ بھی
یاد تو ہو گا تمہیں جلیان 2 والا باغ بھی؟
پوچھ لو، اس سے، تمہارا نام کیوں تابندہ ہے
ڈایر گرگ دہن آلود، اب بھی زندہ ہے
وہ بھگت سنگھ، اب بھی جس کے غم میں دل ناشاد ہے
اس کی گردن میں جو ڈالا تھا، وہ پھندا یاد ہے
ہند کے رہ بر، رہا کرتے تھے، کس ہنجار سے
پوچھ لو یہ قید خانوں کے در و دیوار سے
اب بھی ہے محفوظ جس میں طنطنہ سرکار کا
آج بھی گونجی ہوئی ہے، جن میں کوڑوں کی صدا

5

آج کشتی، خلق کے امواج پر، کھیتے ہو کیوں؟
سخت حیراں ہوں کہ اب تم درس حق دیتے ہو کیوں؟

1 کلکتے کی وہ عمارت جس میں حضرت واجد علی شاہ کو قید کیا گیا تھا 2 حضرت واجد علی شاہ کا تخلص۔

1 حضرت ظفر کو رنگون میں قید اور دفن کیا گیا تھا 2 پنجاب کا ایک باغ جہاں شمر خو

جرنل ڈائر نے صدہا محبان وطن کو موت کے گھاٹ اتار دیا تھا۔

اہل قوت دام حق میں تو کبھی آتے نہیں!
آدمیت کو، کبھی خاطر ہی میں لاتے نہیں!

6

لیکن، آج، اخلاق کی تلقین فرماتے ہو تم!
ہو نہ ہو اپنے میں، اب قوت نہیں پاتے ہو تم!
اہل حق روشن نظر ہیں۔۔۔۔ اہل باطل کور ہیں
یہ تو ہیں اقوال ان قوموں کے جو کم زور ہیں
آج، شاہد، منزل قوت میں تم رہتے نہیں؟
جس کی لاٹھی اس کی بھینس اب کس لئے کہتے نہیں؟
کیا کہا؟ انصاف ہے انساں کا فرض اولیں!
کیا قتال و ظلم کا، اب تم میں کس باقی نہیں؟

7

دیر سے بیٹھے ہو، نخل راستی کی چھاؤں میں
کیا، خدا ناکردہ، کچھ موچ آ گئی ہے پاؤں میں
گونج ٹاپوں کی، نہ آبادی، نہ ویرانے میں ہے
خیر تو ہے۔۔۔ اسپ تازی، کیا شفاخانے میں ہے
آج کل تو ہر نظر میں، رحم کا انداز ہے
کچھ طبیعت، کیا نصیب دشمناں ناساز ہے
سانس کیا اکھڑی کہ حق کے نام پر مرنے لگے!
نوع انساں کی ہوا خواہی کا دم بھرنے لگے!
ظلم بھولے، راگنی انصاف کی گانے لگے

لگ گئی ہے آگ کیا گھر میں کہ چلانے لگے

6

مجرموں کے واسطے زیبا نہیں یہ شور و شین
کل، یزید دشمر تھے، اور آج بنتے ہو حسین
خیر، اے سوداگر، اب ہے تو بس اس بات میں
وقت کے فرمان کے آگے، جھکا دو گردنیں
اک کہانی۔۔۔ وقت لکھے گا، نئے مضمون کی
جس کی سرخی کو ضرورت ہے تمہارے خون کی
وقت کا فرمان اپنا رخ بدل سکتا نہیں
موت ٹل سکتی ہے یہ فرمان ٹل سکتا نہیں

☆☆☆☆☆

اس نظم کا چھپنا تھا کہ آگ لگ گئی، طلاب اور عامۃ الناس جلوس بنا بنا کر نکلنے اور اسے گلی گلی گاتے پھرنے لگے، آگے آگے وہ لوگ ہوتے تھے، اور پیچھے پیچھے پولیس 1

میری یہ نظم جب برلن ریڈیو سے براڈ کاسٹ ہوئی تو میری شدید نگرانی ہونے لگی، اور میری کوٹھی سے ملی ہوئی دوسری کوٹھی میں، ایک سی آئی ڈی انسپکٹر صاحب میری شبانہ روز نگرانی کے واسطے آ کر رہنے لگے ایک دن سہ پہر کے وقت پولیس نے میری کوٹھی پر دھاوا بول دیا اور ایک ہندو انسپکٹر کی سرکردگی میں دس پندرہ کانسٹیبل آ دھمکے میری خانہ تلاشی کے لئے اور کھڑے ہو گئے برآمدے میں اور انسپکٹر صاحب کمرے میں آ گئے۔

انسپکٹر سے میں نے کہا جناب میرا گھر کھلا ہوا ہے، آپ شوق سے ایک ایک گوشہ چھان ڈالیں، اس پر انسپکٹر نے سرگوشی کے انداز میں کہا میں آپ کو ایسی عمدہ نظم کی مبارکباد دیتا ہوں میں آپ کے گھر کی تلاشی نہیں لوں گا صرف ضابطہ کی خانہ پری کر

کے چلا جاؤں گا میں نے کہا پولیس میں رہ کر آپ اس قدر شریف ہیں، بڑے تعجب کی بات ہے، اس نے کہا، میں اپنے بچوں کا پیٹ پالنے کے لئے مجبوراً نوکری کرتا ہوں، مگر میں نے

1۔ جن لوگوں نے یہ نظم پڑھی وہ گرفتار کر لئے گئے، لیکن مجھ پر ہاتھ نہیں ڈالا گیا اسی زمانے میں سنا تھا کہ تیج بہادر سپرو نے یہ کہہ کر میری گرفتاری رکوا دی تھی کہ اگر میری پکڑ دھکڑ ہوگئی تو میں سیاست کے میدان کا عملی آدمی بن کر بہت خطرناک ہو جاؤں گا معلوم نہیں یہ خبر جھوٹ تھی یا سچ، مگر یہ واقعہ ہے کہ میری گرفتاری عمل میں نہیں آئی یہ بھی ممکن ہے کہ انگریزی قوم کی شرافت نے میری گرفتاری کی اجازت نہ دی ہو انگریز محبان وطن کی دل ہی دل میں قدر کرتا تھا یہ اور بات ہے کہ بحکم سیاست اس کو سختی اختیار کرنا پڑتی تھی حکمران کی حیثیت سے انگریز کمینہ، لیکن من حیث القوم شریف تھا اور اس کے سینہ میں اس قدر چوڑائی تھی کہ اپنے خلاف بات سن کر مشتعل نہیں ہو جاتا تھا۔۔۔ لیکن میری قوم چونکہ ذہنی اعتبار سے ایک چھوٹی قوم ہے یہ اپنے خلاف آواز سن کر تاپیں مارنے لگتی اور کف دروہان ہو جاتی ہے۔

کسی انگریز فلسفی نے لکھا تھا کہ دو ڈھائی سو سال کی ذہنی ورزش کے بعد ہم نے اس اعلیٰ شرف کو پالیا ہے کہ جب کوئی ہم کو برا کہتا ہے تو ہم برا نہیں مانتے، ٹھنڈے دل سے غور کرتے ہیں کہ وہ برائی ہم میں ہے کہ نہیں ہوتی ہے تو ہم اس کو دور کرنے کی سعی کرتے ہیں نہیں ہوتی تو ہم اپنے برا کہنے والے کو سمجھانے کی تو ضرور کوشش کرتے ہیں لیکن اس کی عداوت کو دل میں جگہ نہیں دیتے۔

ضمیر نہیں بچا ہے میرا دل آپ لوگوں کے ساتھ ہے یہ کہہ کر وہ ایک میز پر، سر جھکا کر ضابطے کی خانہ پری کے واسطے کچھ لکھنے لگا، انسپکٹر کی مشغولیت سے فائدہ اٹھا کر ایک مسلمان ہیڈ کانسٹیبل صاحب نے میری ٹائم پیس اٹھا کر اپنی جیب میں رکھ لی، چوری انہوں نے کی، میں نے شرما کر سر جھکا لیا۔

اور جب ضابطہ کی کارروائی مکمل کر کے وہ انسپکٹر صاحب رخصت ہونے لگے، میں نے ان کا شکریہ ادا کیا، اور ہندو کی شرافت اور مسلمان کی کمینگی دیکھ کر، مجھ کو دانتوں پسینہ آ گیا۔

کوئی حد ہی نہیں اس احترام آدمیت کی
بدی کرتا ہے دشمن، اور ہم شرمائے جاتے ہیں

اس کے بعد میں نے اس واقعے پر ایک نظم کہہ کر چھپوا دی[1] جو چھپتے ہی ضبط کر لی گئی چونکہ وہ نظم بھی میرے کسی مجموعے میں طبع نہیں ہوئی ہے اس لئے اسے بھی نقل کئے دیتا ہوں کہ محفوظ رہے،

جس سے امیدوں میں بجلی، آگ ارمانوں میں ہے
اے حکومت کیا وہ شے اس میز کے خانوں میں ہے؟
بند پانی میں سفیدے کھے رہی ہے کس لئے
تو مرے گھر کی تلاشی لے رہی ہے کس لئے؟
گھر میں، درویشوں کے، کیا رکھا ہوا ہے بد نہاد
آ مرے دل کی تلاشی لے کہ بر آئے مراد
جس کے اندر، دہشتیں، پر ہول طوفانوں کی ہیں
جس میں غلطاں آندھیاں، اندھے بیابانوں کی ہیں
جس کے اندر ناگ ہیں اے دشمن ہندوستاں
شیر، جس میں ہونکتے ہیں، کوندتی ہیں بجلیاں
چھوٹتی ہیں، جس سے نبضیں افسرو اورنگ کی
جس میں ہے گونجی ہوئی آواز طبل جنگ کی
جس کے اندر آگ ہے، دنیا پہ چھا جائے وہ آگ
خامہ دوزخ کو، پسینہ جس سے آ جائے وہ آگ

1 میں ان ہیڈ کانسٹیبل صاحب سے بخوبی واقف تھا۔ ہزاروں بار میں نے مجالس عزا میں انہیں چیخیں مار مار کر روتے اور ماتم کرتے دیکھا تھا، وہ حسین کے محبّ یعنی حق کے پرستار تھے اور اس کے باوجود ان کو میری گھڑی چراتے وقت شرم نہیں آئی 2 فرنگی کے دور میں اس کی حکومت کے خلاف نظمیں اور مضامین چھپ سکتے تھے اور اخباروں کی ضمانتیں بالعموم ضبط نہیں ہوا کرتی تھیں۔

موت جس میں دیکھتے ہے منہ، اس آئینے کو دیکھ
میرے گھر کو دیکھتی کیا ہے مرے سینے کو دیکھ

اس واقع کے بعد میں نے آغائی صاحب کے امام باڑے میں ایک مسدس پڑھا ''حسین اور انقلاب'' کے نام سے

''حسین اور انقلاب'' سننے کے لئے پورا ادبی لکھنو ٹوٹ پڑا تھا۔ امام باڑے میں تل دھرنے کی بھی جگہ باقی نہ تھی، لکھنو کے تمام شعراء، تمام اساتذہ، یہاں تک کہ مولانا صفی بھی تشریف لائے اور اس مجلس میں فقط شیعہ ہی نہیں اہل سنت اور ہندو بھی شریک ہوئے تھے۔

چونکہ اس مسدس میں آہ و فغاں پر زور دینے کے بدلے، ایثار اور کردار حسین پر عمل کرنے کی بالکل پہلی بار ترغیب دی گئی تھی اس لئے ارباب مجلس نے بالعموم اور اعیان سیاست نے بالخصوص، بار بار کھڑے ہو کر اس جوش و خروش سے داد دی تھی کہ ان کی آوازوں کے تھپیڑوں سے منبر میں جنبش پیدا ہو گئی تھی۔۔۔۔ اور ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ سامعین اپنے اپنے گریبان پھاڑ کر میدان جنگ میں کود پڑیں گے۔

حکومت نے کان تک یہ غلغلہ پہنچا تو اسنے ''شیعہ خان صاحبوں'' خان بہادروں اور ''سروں'' کو طلب کر کے یہ ہدایت کی کہ وہ کوئی ایسی تدبیر نکالیں کہ اس مسدس کا اثر

1 یوں تو میرے دل میں یہ بات مدتوں سے کھٹکتی رہتی تھی کہ حسینیت کی سی دولت

کے علمبردار، شہادت حسین پر تو آنسو بہاتے لیکن عزیمت حسین سے جی چراتے ہیں اور یہ انوکھی بات بھی میری سمجھ میں نہیں آتی تھی کہ کربلا کا دادر محشر یعنی حسین اعظم کا سا غیور سورما جس قوم کا ہیرو ہو وہ قوم باطل پرستی و بزدلی کا صید زبوں کیونکر بن گئی اور اس نے اس ننگ کے برداشت کر لینے پر اپنے کو کس طرح آمادہ کر لیا کہ وہ باطل بنیا فرنگی کے آگے سربسجود ہو جائے۔

لیکن مجھے خوب اچھی طرح یاد ہے کہ اس زمانے میں میرے اس شعلے کو ایک آئی سی ایس مستشرق انگریز نے، جو بورڈ آف ریونیو کا صدر تھا شعلہ جوالہ میں تبدیل کر کے ''حسین وانقلاب'' کہنے پر مجھ کو آمادہ کر دیا تھا اور آپ بھی سن لیں کہ محرم کی پہلی تاریخ کو جب میں اس سے ملنے گیا تھا تو اس نے مجھ سے یہ کہا تھا کہ تاریخ اسلام میں حسین ایک ایسا منارہ حق ہے کہ اگر ہندوستان کے صرف مٹھی بھر شیعہ اپنے ہیرو کی اسپرٹ کو جذب کر کے اس کے راستے پر گامزن ہو جائیں تو ہماری برٹش حکومت کا ایوان پاش پاش ہو کر رہ جائے۔

زائل ہو جائے، اپنے آقا کا حکم سن کر انہوں نے مشورہ کیا اور مشورے کے بعد وہ تمام حسین کے پرستار، یزید کی حمایت پر تیار ہو کر، لکھنو کے سب سے بڑے مجتہد سید ناصر حسین قبلہ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور ان سے یہ کہا کہ ارباب مجلس نے بالعموم اور بانی مجلس، حکیم صاحب عالم صاحب نے بالخصوص ہمارے دین کی زبردست توہین کی ہے اور منبر حسین پر جوش صاحب کے سے علانیہ بادہ خوار کو بٹھا کر، منبر کی تذلیل کا بھی ارتکاب کیا ہے اس لئے آپ اس مجلس کے باطل ہونے کا فتویٰ صادر فرما دیں۔

قبلہ و کعبہ نے مجھے بلا بھیجا، مجھے دیکھتے ہی ان تمام سرکار پرستوں کے چہروں پر حیرانی کی ایک لہر دوڑ گئی۔۔۔۔ اور چائے نوشی کے بعد قبلہ و کعبہ نے اپنے بائیں طرف مصلا بچھوا کر، جب مجھ سے یہ ارشاد فرمایا کہ جوش صاحب زحمت نہ ہو تو آپ میرے مصلے پر بیٹھ کر اپنا وہ مسدس سنا دیں، جو آپ نے آغائی صاحب کے امام

باڑے میں پڑھا تھا تو حکومت کے ایجنٹوں کی صفوں میں ایک کھلبلی اور بوکھلاہٹ پیدا ہوگئی اور جب میں قبلہ و کعبہ کے نعرہ ہائے تحسین کی گونج میں وہ مسدس پڑھ کر اپنی جگہ واپس آ گیا تو انہوں نے سرکار پرستوں کی ٹولی کی طرف دیکھ کر یہ ارشاد فرمایا کہ آپ حضرات نے یہ حدیث مبارک کہ الاقرب الصلوۃ آنتم سکارا تو ضرور سنی ہوگی جس کے یہ معنی ہیں کہ جب تم سگر میں ہو تو نماز کے قریب نہ پھٹکو، اور اس سے یہ بات مستنبط ہوتی ہے کہ پینے والوں کو، ہوش کے عالم میں نماز پڑھنے سے روکا نہیں گیا ہے او راس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ اگر کوئی شخص نشے کے عالم میں نہیں ہے تو وہ منبر حسین پر بھی بیٹھ سکتا، اور مسجد میں داخل ہو کر نماز بھی پڑھ سکتا ہے۔

یہ سنتے ہی سرکار پرستوں کا رنگ فق ہو گیا اور میں سمجھ گیا کہ دراصل معاملہ کیا تھا، میرے اس مسدس کا انگریزی میں ترجمہ ہو کر جب مسٹر مارش 1 مشیر گورنر

1 مسٹر مارش میرے باپ کے دوست مجرموں کے دشمن، بے آسرا لوگوں کے مددگار، اور اپنی آدھی تنخواہ محتاجوں میں تقسیم کر دیا کرتے تھے اگر حکومت مسٹر مارش کے سے شریف حکام سے کام لیتی تو ابھی سو برس اور حکومت کر سکتی تھی۔

کے ملاحظہ سے گزرا تو انہوں نے مجھے بلا بھیجا بڑی شفقت سے پیش آئے اور کہا اس سے پیشتر جب میں نے آپ کی نظم ایسٹ انڈیا کمپنی کے فرزندوں سے خطاب کا ترجمہ پڑھا تھا میری آنکھیں شرم سے جھک گئی تھیں اور اب جب میں نے آپ کی نظم ''حسین اور انقلاب'' کا ترجمہ پڑھا تو میں نے آپ کے باب میں یہ رائے قائم کی کہ آپ حق کے پرستار، اور باطل کے دشمن ہیں۔۔۔۔ اور اب میں آپ سے یہ سوال کرتا ہوں کہ کیا مسولینی اور ہٹلر، دونوں اس وقت یزید کا پارٹ کر رہے ہیں کہ نہیں اور جب میں نے کہا بیشک آپ سچ کہہ رہے ہیں تو انہوں نے مجھ سے دوسرا سوال کیا کہ اگر میں آپ سے یہ درخواست کروں کہ آپ عصر نو کے ان زندہ یزیدوں کے خلاف آل انڈیا ریڈیو سے ہر ہفتے ایک نظم براڈ کاسٹ کرتے رہیں جس کے معاوضے میں

یو پی حکومت آپ کو آٹھ سو ماہانہ آنریریم دیا کرے گی، تو کیا آپ اس آفر (پیش کش) کو قبول نہیں کر لیں گے؟

یہ سن کر میں نے سر جھکا لیا انہوں نے پوچھا کیا بات ہے یہ ''آفر'' تو آپ کی افتاد مزاج سے ہم آہنگ ہے میں نے کہا مسٹر مارش میں دو وجوہ کی بنا پر آپ کی بڑی عزت کرتا ہوں ایک تو آپ میرے مرحوم باپ کے دوست اور دوسرے آپ غریبوں کے بہت بڑے سرپرست ہیں میں کسی آنریریم کے بغیر آپ کے ارشاد کو مان لیتا مگر کیا کروں اپنے اصول سے مجبور ہوں کانگریس نے اس جنگ میں آپ کا ہاتھ بٹانے کی جو شرطیں پیش کی تھیں آپ کی حکومت نے انہیں نہیں مانا مارش نے میری بات کاٹ کر کہا میں آپ سے حکومت کے تعاون کی درخواست نہیں کر رہا ہوں میں تو صرف اس قدر چاہتا ہوں کہ آپ فقط مسولینی اور ہٹلر کو بے نقاب کرتے رہیں میں نے کہا اگر میں ایسا کروں گا تو اس کا جو گرانڈ ٹوٹل نکلے گا وہ بالواسطہ آپ کی حکومت کی موافقت پر مشتمل ہوگا۔

مارش یہ سن کر تھوڑی دیر کے لئے تو خاموش ہو گئے پھر اپنی عینک کی تال صاف کر کے وہ بڑے ولولے کے ساتھ کھڑے ہو گئے میں سمجھا وہ مجھ پر حملہ کریں گے میں بھی جوابی حملے کے واسطے کھڑا ہو گیا۔

لیکن وہ میرے قریب آئے اور میری پیٹ ٹھونک کر کہنے لگے ''ونڈر فل ینگ مین'' (حیرت ناک جوان آدمی) آپ کے انکار نے میرے دل میں آپ کی عزت قائم کر دی، آپ اپنے باپ کی مانند بڑے آدمی ہیں آپ کو دیکھ کر میں نے اپنی اس رائے میں تبدیلی کر دی ہے کہ ہندوستان کی زمین کریکٹر پیدا نہیں کرتی اگر آپ کو کبھی میری ضرورت پڑے یاد کر لیجئے گا یہ کہہ کر وہ مجھے رخصت کرنے برآمدے تک آئے اور برابر مسکراتے رہے۔

☆☆☆

کچھ دن فلمی دنیا میں

امید صاحب اٹیٹھوی، اور ساغر صاحب نظامی کو ساتھ لے کر جب میں ایک مشاعرے کی شرکت کے واسطے بمبئی گیا تو اس کے دوسرے ہی دن شام کے وقت شالیمار پکچرز پونا کے مالک احمد صاحب بنے (سید سجاد ظہیر) کے گھر آئے (ہم وہیں ٹھہرے ہوئے تھے) اور ہم لوگوں کا کلام سننے کے بعد وہ بنے میاں کو دوسرے کمرے میں اٹھا کر لے گئے اور دیر تک باتیں کرنے کے بعد جب رخصت ہو گئے تو بنے میاں نے مجھ سے کہا کہ احمد صاحب آپ کو، اور ساغر صاحب کو اپنے ساتھ رکھنا چاہتے ہیں آپ دونوں پر کوئی پابندی نہیں ہو گی صرف گانے لکھ دیا کیجئے گا آپ کا معاوضہ گیارہ سو تک اور ساغر صاحب کا معاوضہ ساڑھے پان سو تک حاضر 1 کیا جائے گا میں نے کہا یہ سرخوشی کا وقت ہے اس وقت ان باتوں کا موقع نہیں کل جواب دوں گا صبح کو ساغر نے مجھ سے کہا اگر آپ یہ شرط لگا دیں گے کہ میرا اور ساغر کا معاوضہ بالکل مساوی ہو گا تو احمد صاحب کی چونکہ یہ تمنا ہے کہ آپ ان کے وہاں کام کریں، اس لئے وہ اس شرط کو قبول کر لیں گے، اور میری زندگی بن جائے گی میں نے ساغر کی بات مان لی۔

میں نے بنے سے کہا کہ میری یہ شرط ہے کہ ساغر کو میرے برابر معاوضہ دیا جائے، اگر احمد صاحب اسے قبول نہیں کریں گے تو میں ان کی یہ پیش کش نامنظور کر دوں گا۔

احمد صاحب نے، بادل ناخواستہ یہ شرط قبول کر لی اور تھوڑے دن کے بعد،

1 معاوضہ اچھی طرح یاد نہیں مگر اتنا ضرور یاد ہے کہ ساغر صاحب کا معاوضہ مجھ سے نصف تھا۔

ہم لوگ، پونے آ گئے اور شنکر سیٹھ روڈ کے ''طاہر پیلس'' میں رہنے لگے۔

پونے کے موسم کا اعتدال، وہاں کے مناظر، وہاں کی دل فریب صبحیں اور شامیں وہاں کی پابند اوقات برسات، اور وہاں کی پہاڑیاں ایسی چیزیں تھیں جن کو آج تک

بھلا نہیں سکا ہوں۔

میں نے اپنے دہلی کے رہنے والے پنجابی دوست **ملک** حبیب احمد، اور اپنے دکنی دوست حبیب اللہ رشدی کو بھی شالی مار میں ملازم رکھا دیا تھا، کرشن چندر کو بھی احمد صاحب پونے کھینچ لائے تھے بے چارہ جوانا مرگ شام تیواری، حمید بٹ مرحوم، برج بھوشن، اور بھارت بھوشن (ہندی کے شاعر) بھی شالیمار سے وابستہ تھے میرے پرانے فوجی دوست منان خاں رام پوری بھی بسلسلہ تبادلہ پونے آ چکے تھے اور پونے کے نئے دوست قدوس گھڑی والے اور محمد فصیح بھی ایسے دلچسپ نکلے کہ رات کی اکثر نشستیں ان کے گھر پر ہوا کرتی تھیں اور ایک اچھی خاصی چنڈال چوکڑی کی صورت نکل آئی تھی۔

اسی اثناء میں قمر علی 1 صاحب اور سید 2 آفتاب حسین صاحب سے بھی بڑے دوستانہ تعلقات قائم ہو گئے تھے فصیح 3 صاحب کی گردن میں ایک ذرا سا خم تھا اس لئے ان کو مرد کج گردن کہا کرتا تھا اسی کے ساتھ ساتھ چوں کہ وہ تاویلات وقوائی پر بڑی وسعت رکھتے تھے میں ان کو ''امیر تاویلات وقوانی'' کا خطاب بھی دے دیا تھا۔

وہاں میرے ایک لکھ پتی دوست اور بھی تھے ''مولا ڈینا'' جو ہمہ وقت شراب پیتے اور لوگوں کی بڑی کشادہ پیشانی کے ساتھ امداد کیا کرتے تھے اور ایک سلسلہ خاص میں انہوں نے میری اعانت بھی کی تھی جس کو میں فراموش نہیں کر سکوں گا۔

وہیں ساغر صاحب کامرادآباد کی ایک صاحبزادے سے قلمی معاشقہ بھی چل رہا تھا اور کچھ روز کے بعد وہ صاحبزادی طاہر پیلس میں دلہن بن کر آ گئی تھیں۔

1 قمر علی ٹیلرنگ فرم کے مالک اور لکھ پتی انسان تھے 2 آفتاب صاحب ایک لانڈری کے مالک اور آسودہ حال آدمی تھے کراچی آ کر دونوں تباہ ہو چکے ہیں کراچی نے چھوٹوں کو ابھارا اور بڑوں کو دفنا دیا ہے 3 آگے چل کر یہ بات کھل گئی کہ وہ دل چسپ زیادہ اور مخلص بہت کم تھے۔

پونے کا ہر دن عید تھا، ہر رات، شب برات تھی اور ہر آٹھویں دسویں دن میں بمبئی جا کر کسی کے آستان جمال پر سجدہ ریزی بھی کر آتا تھا لیکن احمد صاحب کی غلط عملی نے دو ڈھائی سال کے اندر وہ سارا طلسم توڑ دیا وہ چپ چپاتے پاکستان کی طرف پرواز کر گئے، اور ہم سب لوگوں کے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے۔ اور وہ سارا کھیل خوش و رخشید، و لے دولت مستعجل بود ہو کر رہ گیا۔

پونے کو خیر باد کہہ کر میں بمبئی آ گیا اور 1 بنے کے خالی گھر میں رہنے لگا اس گھر کے ایک گوشے میں ممتاز حسین (جو آج کل کراچی کے کسی کالج میں اردو کے استاد ہیں) بھی رہتے تھے جہاں سعیدہ کے بچوں اور ان کے مابین روز کوئی نہ کوئی جھگڑا ہوا کرتا تھا اس لئے کچھ روز کے بعد میں اپنے ایک بے تکلف ملنے والے ماسٹر عبدالعزیز صاحب رام پوری کے جیکب سرکل واٹ خالی فلیٹ میں اٹھ آیا تھا اس زمانے میں فلمی بازار، ٹھنڈا پڑا ہوا تھا ساغر، ہر دوسرے تیسرے دن میرے پاس آتے اور ہم ایک دوسرے سے پوچھا کرتے تھے کہ خاں صاحب اب ہوگا کیا۔

پروڈیوسر اس بات پر مصر تھے کہ جوش صاحب ہمارے اسٹوڈیو آئیں گے تو ہم ان سے گیت لکھائیں گے اور جوش صاحب اس بات پر اڑ گئے تھے کہ وہ ہمارے گھر آنے کا دکھ نہیں گے تو ہم گیت کہیں گے۔

میرے دوست آغا جانی کاشمیری، اور خواجہ احمد عباس نے بہت کوشش کی کہ معاملات روبراہ ہو جائیں مگر کچھ نہ ہو سکا اس کش مکش میں میرا حال بد سے بدتر ہوتا چلا گیا آمدنی کچھ تھی ہی نہیں اور بیوی کے پاس جو کچھ اوچھی پونجی تھی وہ بھی دم توڑ رہی تھی۔

میں اسی عالم میں ایک روز شام کے وقت شغل کر رہا تھا کہ بازار میں یکا یک ایک قیامت کا ہنگامہ شروع ہو گیا اور ہر طرف سے ''مارو، مارو، مارو'' کی آوازیں آنے لگیں میں برآمدے میں جا کر جھانکنے لگا کہ دیکھوں معاملہ کیا ہے کہ اتنے میں کسی نے زور

زور سے میرے فلیٹ کا دروازہ کھٹکھٹانا شروع کر دیا میں نے بھری سوڈے کی بوتل ہاتھ میں لے کر دروازہ

1 وہ کہیں بہت دور گئے ہوئے تھے۔

کھول دیا۔ دروازہ کھلتے ہی ایک صورت آشنا ہندو پڑوسی نے بڑی گھبراہٹ کے ساتھ کہا مسٹر جوش آپ فوراً یہاں سے کسی مسلم محلے میں چلے جائیں کسی نے مہاتما گاندھی 1 کو گولی ماردی ہے ہندوؤں کا خیال ہے کہ یہ کام کسی مسلمان کا ہے اس لئے فوراً یہاں سے چلے جایئے میں اپنے بال بچوں اور بوتل کو لے کر اپنی بیٹی کی سہیلی رفعت کے مکان میں جو بھنڈی بازار میں تھا چلا گیا اور وہاں پہنچا تو ریڈیو پر جواہر لال کا یہ اعلان سنا کہ مہاتما جی کو ایک ہندو مرہٹے گوڈسے نے گولی مار کر ہلاک کر دیا ہے اس اعلان نے مسلمانوں کو قتل عام سے بچالیا اگر جواہر اس اعلان میں پانچ منٹ کی بھی تاخیر کر دیتے تو لاکھوں مسلمانوں کو تہ تیغ کر دیا جاتا دوسرے دن میں اپنے فلیٹ میں آ گیا، ادھر، زندگی، فاقہ، وفقر کے سائے میں گزرنے لگی ایک دن میں نے دیکھا بیوی بے حد اداس بیٹھی ہیں پوچھا کیا بات ہے کہنے لگیں میرے پاس جو روپیہ تھا اب وہ سسکیاں بھر رہا ہے جلدی کوئی سبیا کرو نہیں تو خدا نہ کرے دھڑ ادھڑ فاقے ہونے لگیں گے یہ سن کر یہ بات میرے دل میں آئی کہ اب میں اپنی آن توڑ دوں اور قلم کان میں لگا کر ''کام گیت لکھنے کا'' کے نعرے لگاتا، اسٹوڈیوں کی گلیوں میں پھرنا شروع کر دوں۔

کہ، جاہا سپر باید انداختن!

میرے خون میں جب اس ارادے کی دھمک پیدا ہوئی تو میرے سینے کا خوابیدہ شاعر جوش یکا یک بیدار ہو گیا اور جامے سے باہر ہو کر کہنے لگا کہ تو اس دنیا ردار شبیر حسن خاں کے بہکانے میں آ کر پروڈیوسروں کی طرف جائے گا تو تیری ٹنگڑیاں توڑ کر رکھ دوں گا۔

اپنے غیور شاعر کی یہ گھن گرج سن کر میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے اور بجلی کی لپک کے مانند فوراً ایک تدبیر میری سمجھ میں آ گئی میں سیدھا بیوی کے پاس گیا اور کہا اشرف جہاں پانچ دن اور راستہ دیکھ لو اگر اس مدت میں کوئی سبیتا نہ ہوا تو مجھے تیس چالیس روپے اور یہ کالا کمبل دے دینا بیوی نے کہا اس روپے سے کیا کرو گے اور روپے کے ساتھ یہ کمبل کیوں مانگ رہے ہو میں نے کہا میرے ایک کاروباری ملنے والے ہے ان کو ساتھ لے جا کر مارکیٹ سے

1۔ اسی بمبئی نے گاندھی جی کی موت کی منحوس خبر سنائی تھی اور اسی بمبئی نے آزادی ہند کا مژدہ بھی سنایا تھا پہلی خبر پر میں نے آنسو بہائے تھے اور دوسری خبر سن کر اپنے ساتھیوں کے ساتھ سڑکوں پر ناچا تھا۔

ترکاریاں لاؤں گا اور عین اپنے فلیٹ کی دیوار کے نیچے کمبل بچھا کر آلو، گوبھی اور ہنڈے بیچنا شروع کر دوں گا میرے باپ کو بنڈے بہت پسند تھے اور ان کے خدام بازار سے بنڈے خرید کر لاتے تھے اب ان کا بیٹا سڑک پر بیٹھ کا بنڈے بیچے گا اور اول و آخر میں ایک نسبت پیدا ہو جائے گی یہ سنتے ہی بیوی اچھل پڑیں گویا خدا نہ کردہ بجلی کا جھٹکا لگ گیا ان کی آنکھوں میں بڑے بڑے آنسو بھر آئے کہنے لگیں ایسا کرو گے تو ناک کٹ جائے گی میں نے کہا اشرف جہاں تعلقہ داری کی بو دماغ سے نکال ڈالو حلال کی روزی کمانے میں کہیں ناکیں کٹا کرتی ہیں ناک تو کٹتی ہے چوری چکاری کرنے، اپنی آن توڑ دینے اور اسٹوڈیوں کے چکر لگانے سے اور بفرض محال اگر اس بات کو بے عزتی مان بھی لیا جائے تو میرے اس طرح سڑک پر بیٹھ کر ترکاری بیچنے سے میری نہیں ہندوستان کی ناک کٹ جائے گی۔

بیوی نے سر سے لے کر پاؤں تک مجھے دیکھا ''اے اللہ تو کہاں جا کر سو گیا ہے'' کہا تکیے پر سر رکھ دیا اور بڑے بیکسی کے ساتھ آنکھیں موند لیں۔

بیوی کی اس اداسی پر میرا دل بھر آیا دوسرے کمرے میں لیٹ کر سو گیا اور خواب

دیکھنے لگا کہ میں اپنے فلیٹ کی دیوار کے نیچے سڑک پر کمبل بچھائے ترکاریاں بیچ رہا ہوں اور سامنے سے جنازے گزر رہے ہیں میں پوچھ رہا ہوں کہ یہ جنازے کس کے ہیں لوگ کہہ رہے ہیں تمہارے آباؤ اجداد کے جب بیدار ہوا تو دیکھا میرا داماد التفات ایک اخبار لئے آ رہا ہے اس نے اخبار دے کر کہا ماموں سرکار ہند کو اپنے رسالے آج کل کے لئے ایک ایڈیٹر کی ضرورت ہے جس کی درخواستیں مانگی گئی ہیں آپ کے واسطے یہ بہترین موقع ہے آپ فوراً درخواست روانہ کر دیں اور پنڈت جواہر لال نہرو کے پاس اسی درخواست کی نقل بھیج دیں میں نے کہا بیٹا درخواست تم لکھ لاؤ میں دستخط کر دوں داماد تھوڑی دیر میں درخواست لکھ کر آ گیا اور درخواست دہلی بھیج دی گئی۔

اس واقعے کے دوسرے تیسرے دن، حسن اتفاق سے پنڈت جواہر لال نہرو، اور مولانا ابوالکلام، دونوں بمبئی آ گئے میں نے ان کی اس آمد کو وہ سمجھا جس کو عرف عام میں تائید غیبی کہتے ہیں اور سیدھا گورنمنٹ ہاؤس پہنچ گیا وہاں جا کر معلوم ہوا کہ پنڈت جی اور مولانا کہیں باہر گئے ہوئے ہیں اور ایک گھنٹے میں پلٹ آئیں گے۔

جی میں آیا کنور 1 مہاراج سنگھ سے کیوں نہ مل لوں، اور خالی بیٹھ کر، انتظار کیوں کروں پرچے پر اپنا نام لکھ کر بھیجا انہوں نے فوراً بلا لیا اور بڑے تپاک سے پیش آئے اور پوچھا خاں صاحب آپ یہاں کہاں میں نے کہا میں تو آج کل بمبئی میں رہتا ہوں انہوں نے کہا اور پھر بھی مجھ سے کبھی نہیں ملے میں نے کہا میں اس وقت پنڈت جی سے ملنے آیا تھا وہ موجود نہیں ہیں اس لئے آپ سے ملنے آ گیا ہوں میں بے سوچے سمجھے یہ کہہ تو گیا مگر فوراً خیال آیا کہ میں نے بڑی بے تکی بات کہی ہے اس کے تو یہ صاف معنی ہیں کہ میں کنور صاحب سے یہ کہہ رہا ہوں کہ اگر پنڈت جی اس وقت غیر حاضر نہ ہوتے تو میں آپ سے ملنے نہ آتا، یہ سوچ کر میرے چہرے پر خجالت کے آثار پیدا ہو گئے مہاراج سنگھ بڑے ذہین آدمی تھے بھانپ گئے اور مسکرا کر کہنے لگے آپ

پٹھانوں کی یہی بات تو مجھے بہت اچھی لگتی ہے کہ جو بات آپ کے دل میں ہوتی ہے، وہی پھٹ سے زبان پر آ جاتی ہے۔ میں نے کہا میں اپنی بدحواسی کی معافی چاہتا ہوں انہوں نے کہا میں جس بات کی دل سے قدر کرتا ہوں آپ اسی کی معافی چاہ رہے ہیں ان کے یہ کہتے ہی مولانا آگے آگے اور پنڈت جی پیچھے پیچھے ان کے کمرے میں داخل ہو گئے مولانا نے فقط ہاتھ ملایا اور پنڈت جی لپک کر میرے 2 گلے لگ گئے اور چھوٹتے ہی پوچھا جوش صاحب آج کل آپ کیا کر رہے ہیں میں نے کہا پنڈت جی ''آج کل'' کے واسطے درخواست دے کر اس کا انتظار کر رہا ہوں پنڈت نے مسکرا کر کہا یہ ''آج کل'' کی الٹ پھیر میری سمجھ میں نہیں آئی۔

مولانا نے لال بجھکڑ بن کر کہا معلوم ہوتا ہے کہ جوش صاحب نے ہمارے سرکاری رسالے ''آج کل'' کا جو اشتہار نکلا ہے اس کی ادارت کے واسطے درخواست دی ہوگی پنڈت جی نے کہا تو پھر چھٹے روز آپ دہلی آ جائیں میں بندوبست کر دوں گا۔

مولانا آزاد نے کہا پنڈت جی آپ کو معلوم نہیں یہ محکمہ سردار پٹیل کا ہے آپ سوچ سمجھ کر جوش صاحب کو دہلی بلائیں پنڈت جی نے کہا جوش صاحب ہمارے شانے سے شانہ ملا کر برٹش ایمپائر سے لڑ چکے ہیں پٹیل کو بھی یہ بات معلوم ہوگی اور نہیں معلوم ہوگی تو میں ان کو بتا دوں گا آپ بڑے اطمینان کے ساتھ دہلی آ جائیں۔

1۔ کنور مہاراج سنگھ اس وقت بمبئی کے گورنر تھے اور میرے پورے خاندان سے ان کو واقفیت تھی

2۔ مولانا بے چارے پر تعلیمات کی وزارت کا نشہ چڑھ چکا تھا اور ہندو وزارت عظمیٰ کا پورا مے خانہ خالی کر دینے کے باوجود ہوش میں تھے یہ فرق دیکھ کر مجھے بہت صدمہ ہوا کہ مولانا مجذوب بن چکے ہیں اور پنڈت سالک کے درجے پر فائز ہیں افسوس کہ مسلمان پر حکومت کا نشہ جلد چڑھ جاتا ہے۔

☆☆☆☆☆☆

مژدہ! خار دشت پھر

وہ غالباً 1948ء کا ورد تھا کہ میں ترکاری فروخت کرنے کے ارادے کو فسخ کر کے دہلی پہنچا اسٹیشن سے سیدھا پنڈت جی کے پاس گیا اور انہوں نے سردار پٹیل سے ٹیلی فون پر بات کر کے میری ملازمت کی بات پکی کر لی اور یہ وعدہ بھی کر لیا کہ وہ ریاستوں سے میری پنشنیں بھی مقرر کرا دیں گے اور مجھ کو میاں عظیم حسین صاحب کے پاس بھیج دیا جو اس وقت اطلاعات عامہ کے سیکرٹری تھے۔

میاں عظیم حسین واقعی میاں آدمی نکلے میں ان کی شرافت سے بے حد متاثر ہوا اثنائے گفتگو میں انہوں نے مجھ سے کہا تنخواہ آپ کو صرف گیارہ سو ماہانہ ملے گی آپ اس قلیل تنخواہ میں کیوں کر زندگی بسر کر سکیں گے میں نے کہا میاں صاحب پنڈت جی نے مجھ سے وعدہ کیا ہے کہ وہ کئی ریاستوں سے میری ادبی پنشن مقرر کرا کے اس قلیل تنخواہ کی خانہ پری کر دیں گے۔

جب انٹرویو سے پہلے میں نے اس کھچا کھچ بھرے ہوئے ہال میں قدم رکھا جہاں ''آج کل'' کی ادارت کے امیدواروں کا ایک لشکر بیٹھا ہوا تھا تو میری صورت دیکھتے ہی تمام امیدواروں کے چہرے فق ہو گئے اور میرے مقابلے میں اپنی ناکامی کا یقین ان کی آنکھوں میں تیرنے لگا اس بات سے میرے دل کو بہت سخت دھچکا پہنچا اور میں سوچنے لگا کاش میں یہاں آ کر اتنے بڑے لشکر کی مایوسی کا سبب نہ بنتا اور عرفی کا یہ شعر سر میں گونجنے لگا:

اے متاع درد، در بازار جاں، انداختہ
گوہر ہر سود، در جیب زیاں، انداختہ

اور جب انٹرویو کے کمرے میں داخل ہوا تو یہ دیکھا کہ میاں عظیم حسین اور اجمل خاں کے علاوہ چار پانچ آدمی ایسے بھی ہال میں موجود ہیں جن کو میں نہیں جانتا اس کمرے میں بیٹھ کر جب میں نے اپنے پان کی ڈبیا کھولی تو ایک صاحب نے جو

صورت کے اعتبار سے مدراسی معلوم ہو رہے تھے مجھ سے انگریزی میں کہا یہاں پان کھانا آداب کے خلاف ہے میں نے جھلا کر جواب دیا آزاد ہو جانے کے بعد بھی آپ اپنے پرانے آقا کے آداب کو سینے سے لگائے ہوئے ہیں میں پان کھانے سے باز نہیں آ سکتا پان میرے واسطے ایسا ہی ہے جس طرح سانس لینا آپ اسے پسند نہیں کرتے تو میں انٹرویو سے دست بردار ہو کر باہر چلے جانے پر آمادہ ہوں میں ڈبیا بٹوا اٹھا کر جب اٹھ کھڑا ہوا تو میاں عظیم حسین اور اجمل خاں نے مجھ کو روک لیا کہ آپ شوق سے پان کھائیں۔

اس کے بعد غالباً اجمل خاں نے کہا جوش صاحب ہم آپ کا انٹرویو کیا لیں، بس وہ نظم سنا دیجئے جو آپ نے نظام کے خلاف کہی تھی میں نے کہا اجمل خان جن لوگوں کے دماغوں پر اب تک فرنگی آداب کی مہر لگی ہوئی ہے وہ میری نظم کیا خاک سمجھ سکیں گے۔

اس پر میاں عظیم حسین، اجمل خاں اور ان کے ساتھ کئی اصحاب نے ہم زبان ہو کر کہا جوش صاحب آپ ہماری طرف دیکھیں اور ہم کو نظم سنائیں ہم سب آپ کے قدر دان ہیں میں نے اس نظم کے چند شعر سنائے اور انٹرویو ختم ہو گیا۔

''آج کل'' کی ادارت سنبھالنے کے بعد، جب ایک روز پنڈت جی سے ملنے گیا تو انہوں نے پوچھا کہ آپ اپنے محکمے کے وزیر، سردار پٹیل سے اب تک ملے کہ نہیں میں نے کہا نہیں اور نہ ملنے کا ارادہ ہی ہے پنڈت نے پوچھا کیوں میں نے انگریزی میں جواب دیا کہ:

''Because he has got a criminal face'' اس لئے کہ ان کا چہرہ مجرموں کا سا ہے۔

یہ سن کر پنڈت جی نے بڑا زبردست قہقہہ لگایا اور پھر مجھ سے کہا نہیں نہیں آپ کو ان سے ضرور مل لینا چاہئے میں ابھی فون پر آپ کی ملاقات طے کئے لیتا ہوں انہوں

نے فون کیا جواب آیا ابھی روانہ کر دیجئے میں ان کی کوٹھی پر پہنچا وہ دھوتی باندھے، برآمدے میں کھڑے ہوئے تھے میں نے ہاتھ ملاتے ہی ان سے کہا سردار صاحب مجھے آپ سے ملنے کا ایک خاص وجہ سے بڑا اشتیاق تھا وہ بڑے گھاگ آدمی تھے'' خاص وجہ'' سن کر بھانپ گئے اور پوچھا آپ کو مجھ سے ملنے کا کیوں اشتیاق تھا میں نے کہا اس لئے کہ میں آپ کی بہت سی برائیاں سن چکا ہوں۔

یہ سن کر وہ مجھے کمرے میں لے گئے، بیٹھتے ہی انہوں نے انگریزی میں کہا آپ نے یہ سنا ہوگا کہ میں مسلمان کا دشمن ہوں آپ جس قدر خوفناک برہنہ گفتار آدمی ہیں اسی قدر میں بھی ہوں اس لئے آپ سے صاف صاف کہتا ہوں کہ میں آپ کے سے ان تمام مسلمانوں کی بڑی عزت کرتا ہوں، جن کے خاندان، باہر سے آکر یہاں آباد ہو گئے ہیں لیکن میں ان مسلمانوں کو پسند نہیں کرتا جن کا تعلق ہندو قوم کے شودروں اور نیچی ذاتوں سے تھا اور مسلمانوں کی حکومت کے اثر میں آکر انہوں نے اسلام قبول کر لیا تھا یہ لوگ دراصل نہایت متعصب، شریر اور فسادی ہیں اور اقلیت میں ہونے کے باوجود ہندو اکثریت کو دبا کر رکھنا چاہتے ہیں۔

میں نے کہا سردار صاحب پہلی بات تو یہ ہے کہ دنیا کے تمام انسان ایک نسل سے ہیں میں ذات پات کا بالکل قائل نہیں اور دوسری بات یہ ہے کہ اگر آج سے دو تین سو برس کسی کے پردادا کا پردادا چمار تھا تو کیا آپ کا یہ خیال ہے کہ اس کے چمارپن میں آج تک کوئی تبدیلی نہیں ہو سکی ہے؟ اور وہ آج تک چمار ہی چلا آرہا ہے اس بات کا وہ جواب دینے والے ہی تھے کہ ان کے سیکرٹری نے آکر کہا آپ نے مہاراجہ پٹیالہ کو ٹائم دیا تھا وہ آگئے ہیں۔

سردار کی کوٹھی سے ابھی نکلا تھا کہ مولانا آزاد سے مڈبھیڑ ہو گئی انہوں نے اپنی موٹر روک کر مجھے آواز دی اور جب میں اپنی موٹر سے اتر کر ان کی موٹر میں بیٹھ گیا انہوں نے مجھے بڑے دردانگیز تیوروں سے دیکھ کر کہا جوش صاحب آپ اور سردار پٹیل میں

نے سر جھکالیا، اورانہوں نے یہ شعر پڑھا:

غنی روز سیاہ پیر کنعاں را تماشا کن
کہ نور دیدہ اش، روشن کند چشم زلیخارا

مولانا آزادتو یہ شعر پڑھ کر چلے گئے لیکن میرے دل کا عجیب عالم ہوگیا میں سوچنے لگا کہ ہم نے اپنے ملک کواتنی قربانیاں دے کر کیا یہ دن دیکھنے کے لئے آزاد کرایا تھا کہ انگریز کے جاتے ہی اردو کا بیڑا غرق ہو جائے اور مسلمانوں کے منہ پر ہوائیاں اڑنے لگیں کان میں ریاست دتیا کے وزیراعظم عزیز الدین کی آواز آئی کہ جوش صاحب ہم نہ کہتے تھے کہ ہندوستان آزاد ہوگیا تو ہندو، مسلمانوں کو تہ تیغ کر ڈالیں گے؟ اسی کے ساتھ یہ خیال بھی آیا کہ پاکستان بنانے والوں نے یہ کیوں نہیں سوچا کہ جو مسلمان ہندوستان میں رہ جائیں گے ان کا حشر کیا ہوگا وہ ایک ایک مسلمان کو پاکستان کیوں نہیں لے گئے پھر میں نے اپنے کو اس امید سے تسلی دی کہ نفرت کی عمر زیادہ نہیں ہوتی چار دن میں یہ تعصّبات ختم ہو جائیں گے اور سوشلسٹ حکومت آ جائے گی، اور پھر یہ ساری تفریقیں فنا ہو کر رہ جائیں گی اور دینی برادری ختم ہو کر، انسانی برادری کے دور کا آغاز ہو جائے گا۔

یہ ایک شب کی تڑپ ہے سحر تو ہونے دو
بہشت سر پہ لئے روزگار گزرے گا
فضا کے دل میں پر افشاں ہے آرزوئے غبار
ضرور ادھر سے کوئی شہ سوار گزرے گا!

1955ء میں جب بسلسلہ شرکت مشاعرہ تیسرے بار میں پاکستان آیا تو ہر چند اس سے پیشتر بھی میرے دیرینہ دوست سید ابو طالب صاحب نقوی (چیف کمشنر کراچی) مجھ کو پاکستان آجانے کی دعوت دے چکے تھے لیکن اس مرتبہ تو وہ پنجے جھاڑ کر میرے پیچھے پڑ گئے کہ میں پاکستان چلا آؤں۔

میں پاکستان آنے پر بالکل تیار نہیں تھا لیکن صاف انکار نہیں کیا کہ نقوی کا دل نہ ٹوٹ جائے اور یہ کہہ کر ٹال دیا کہ میں اس مسئلے پر غور کروں گا۔

اس اثناء میں انہوں نے اپنے گھر پر مجلس کی تمام اکابر شہر کے ساتھ، اسکندر مرزا صاحب کو بھی بلایا، اور سب کو میر امسدس ''حسین و انقلاب'' سنوایا، اور ان تمام اکابر نے جن میں اسکندر مرزا بھی شامل تھے مجھ سے اصرار کیا کہ میں پاکستان کا باشندہ بن جاؤں ان کی دعوت پر ہر چند میں نے اپنے دل میں تو یہ کہا کہ خدا کی قسم، میں ایسا ہرگز نہیں 1 کروں گا لین زبان سے یہ کہا میں بھی یہی سوچ رہا ہوں اب نقوی کا یہ تکیہ کلام ہو گیا کہ جوش صاحب آخر آپ کب تک سوچیں گے تو میں پریشان ہو گیا کہ آخر میں کب تک ٹالتا اور بے دودھ کا بچہ پالتا رہوں گا۔

اسی دوران میں ایک روز، وہ میٹرو پول آ گئے اور مجھ سے کہا سارے کام چھوڑ کر آج آپ کے پاس اس لئے آیا ہوں کہ آپ سے پاکستان آ جانے کا اقرار لے کر، دم لوں۔

میں نے کہا نقوی صاحب آپ جانتے ہیں کہ مجھ کو آپ سے کس قدر محبت ہے اگر آپ میری جان تک مانگیں تو حاضر کر دوں لیکن نقوی صاحب نے کہا دیکھئے'' لیکن'' کے بعد انکار نہ کر دیجئے گا میں چپ ہو گیا وہ اپنا سودا چھوڑ کر میرے صوفے پر آ کر بیٹھ گئے اور کہنے لگے فرمائیے آپ پاکستان کب آ رہے ہیں اب جی کڑا اور آنکھیں نیچی کر کے میں نے کہا نقوی صاحب جب تک کہ پنڈت جواہر لال نہرو زندہ ہیں میں پاکستان کیوں کر آ سکتا ہوں۔

انہوں نے میرے شانے پر ہاتھ رکھ کر پوچھا اور نہرو کے بعد کیا ہو گا، یہ بھی کبھی سوچا ہے؟ میں نے کہا خدا نہ کرے کہ میں ان کے بعد زندہ رہوں۔ انہوں نے کہا شاعر کی یہ بڑی بدبختی ہے کہ وہ زندگی کے سنجیدہ مسائل کو بھی جذبات کی ترازو میں تولا کرتا ہے۔ میں آپ سے پوچھتا ہوں کہ اگر انہرو صاحب آپ کی زندگی ہی میں سدھار گئے تو پھر ہندوستان میں آپ کا چاہنے والا کون رہ جائے گا، آپ کی یہ نوکری،

آپ کی یہ فراغت وعزت کیا ان کے بعد ختم نہیں ہو جائے گی؟ اور تھوڑی دیر کے واسطے، یہ بھی فرض کر لیجئے کہ پنڈت نہرو کے بعد بھی ہندوستان آپ کو سر آنکھوں پر بٹھائے رہے گا لیکن یہ بھی تو سوچئے کہ خدانہ خواستہ آپ کے بعد وہاں آپ کے بچوں کا کیا حشر ہوگا؟ دیکھئے جوش صاحب آپ کے بعد ہندوستان میں آپ کے بچے در در مارے پھریں گے اور ایک متنفس بھی ان کے سر پر ہاتھ نہیں رکھے گا۔۔۔۔۔ یہاں تک تو معاشی پہلو پر میں ہاتھ کر رہا تھا اب ذرا تہذیبی پہلو پر بھی نگاہ ڈالئے یہ اس سے بھی زیادہ جان لیوا ثابت ہوگا۔ جوش صاحب آپ کے بچے اور اردو بھول جائیں گے۔ ہندی ان کا اوڑھنا بچھونا ہوگی وہ آپ کے کلام کا۔

1۔ میں جس وقت دل ہی میں دل میں پاکستان نہ آنے کی قسم کھا رہا تھا اس وقت فرمان روزگار مجھ پر مسکرا رہا تھا۔

ترجمہ ہندی میں پڑھیں گے اور تہذیبی، روائتی اور ثقافتی اعتبار سے آپ کی پوری نسل میں اس قدر زبردست وعبرت ناک تبدیلی پیدا ہو جائے گی کہ آپ سے اس کا کسی نوعیت کا بھی تعلق باقی نہیں رہ جائے گا کیا یہ عظیم لسانی ہمزاجی اور روائتی بربادی آپ کو منظور ہے؟ اور اگر آپ یہاں نہ آ گئے تو کیا اس کے یہ معنی نہیں ہوں گے کہ آپ اپنی وقتی فراغت وعزت کی قربان گاہ پر اپنے پورے خاندان کو بھینٹ چڑھا دینے پر تلے ہوئے ہیں۔

ان کی اس طویل جذباتی ومنطقی تقریر نے میرا دل ہلا دیا، اور میری آنکھیں کھول دیں اور میں سوچنے لگا کہ میرے بعد یہ میرے نازوں کے پلے بچے اور میری یہ شاہانہ مزاج رکھنے والی بیوی کیا کرے گی نقوی صاحب سے میں نے کہا آپ نے مجھ کو جھنجھوڑ کر جگا دیا بے شک میری آل اولاد ہندوستان میں پنپ نہیں سکے گی نقوی صاحب، مجھ کو چوبیس گھنٹے اور دے دیجئے کہ میں اس مسئلہ پر ایک بار اور غور کر لوں۔ کل اسی وقت آپ کی خدمت میں حاضر ہو کر، اپنا آخری فیصلہ سنا دوں گا۔

نقوی صاحب کے چلے جانے کے بعد میں نے ناصر احمد خاں سے کہا تم نے سن لی

نقوی صاحب کی ساری تقریر، اب کیا کہتے ہو، ناصر نے کہا مجھ کو ان کے ایک ایک حرف سے اتفاق ہے اگر آپ یہاں منتقل نہ ہوئے تو زندگی بھر پچھتائیں گے۔ یہ کہتے ہی ناصر میرے قریب آ کر بیٹھ گئے اور بڑے ولولے کے ساتھ انگشت شہادت بلند کر کے کہنے لگے خاں صاحب آپ کئی پشتوں سے ملیح آباد پر حکومت کرتے چلے آ رہے ہیں، آپ کی رعایا آپ کے سامنے تھراتی اور جھک جھک کر سلام کرتی ہے کل اسی دوکوڑی رعایا کے بچے، آپ کے بچوں پر حکومت کریں گے، ان کو دھوتیاں بندھوائیں گے اور ان کے سروں پر چوٹیاں رکھوائیں گے اللہ کرے یہ دن دیکھنے سے پیش تر ہم مر جائیں۔

صبح اٹھ کر میں نے اس مسئلے پر دوبارہ غور کیا نہا دھو کر نقوی صاحب پاس گیا اور ان سے کہہ دیا کہ اب میں ہجرت پر تیار ہو گیا ہوں یہ سنتے ہی نقوی کی باچھیں کھل گئیں دوڑ کر مجھے گلے لگا لیا اور اسی وقت ڈپٹی کمشنر کو طلب کر کے حکم دیا کہ جہانگیر روڈ پر جو ایک بہت بڑا پلاٹ خالی پڑا ہے اس کو جوش صاحب کے نام الاٹ کر دیجئے اس پر ان کا سینما ہال اور مکان تعمیر کیا جائے گا اور فلاں 1 مقامی پر پچاس ایکڑ زمین بھی جوش صاحب کو الاٹ کر دیجئے وہاں ان کا باغ نصیب کیا جائے گا۔

---

1 ناصر احمد ملیح آبادی، میرے قرابت داروں میں سے ہیں وہ مجھ سے پہلے ہی پاکستان چلے آئے تھے اور جب سے میں آیا تھا وہ ہر وقت میرے ہی ساتھ رہتے تھے لیکن اب اس خطا پر کہ ان کی ایک مصیبت کے وقت میں نے ان کا ہاتھ بٹایا تھا، انہوں نے مجھ سے ملنا جلنا ترک فرما دیا ہے ایک اور کا آج کام نکلا ہم سے ایک اور ہوا دشمن جانی پیدا۔

جب ان کے حکم کی تعمیل ہو گئی تو دونوں زمینوں پر مجھ کو قبضہ دے دیا گیا اور میرے چوکی دروازہ جھونپڑیاں ڈال کر وہاں رہنے لگے۔

اور جب تمام لکھا پڑھی مکمل ہو گئی تو نقوی صاحب نے کہا آپ دہلی جا کر ایمرجنسی سرٹیفکیٹ پر اپنے بال بچوں کو یہاں لے آئیں آپ کے آتے ہی سینما کی تعمیر کا کام

شروع کرا دوں گا اس کے ساتھ ساتھ انہوں نے اپنے سیکرٹری ربانی صاحب کو بلا کر میرے مکان کی تلاش کے لئے کہا ربانی صاحب نے سندھ مسلم ہاؤسنگ سوسائٹی میں ایک اچھی سی کوٹھی میرے حوالے کر دی اور میں دہلی پرواز کر گیا۔

دہلی پہنچا، معلوم ہوا پنڈت جی باہر گئے ہوئے ہیں دو تین دن میں آئیں گے سیدھا مولانا کے پاس گیا مولانا کسی اخبار میں یہ پڑھ چکے تھے کہ ہندوستان کے ایک شاعر پر پاکستان ڈورے ڈال رہا ہے انہوں نے چھوٹتے ہی مجھ سے کہا غالباً آپ ہی وہ شاعر ہیں جس پر پاکستان ڈورے ڈال رہا ہے میں نے کہا جی ہاں مولانا میں وہی شاعر ہوں اس کے بعد میں نے اپنی ساری روداد بیان کر دی نقوی صاحب کی تقریر کے ایک ایک لفظ کو دہرایا اور پھر ان سے پوچھا اب آپ کی کیا رائے ہے مولانا؟

انہوں نے چند سوال کر کے جب معاملے کے ہر پہلو کو سمجھ لیا تو کہا آپ کا ہجرت کر جانا ہر چند ہمارے واسطے پشیمانی و سرگرانی کا باعث ہو گا لیکن جہاں تک کہ آپ کے خانوادے کے مستقبل کا سوال ہے میری رائے ہے کہ آپ ہجرت کر جائیں نقوی نے یہ سچ کہا ہے کہ نہرو کے بعد آپ کا یہاں کوئی پوچھنے والا نہیں رہے گا آپ تو آپ خود مجھے کوئی نہیں پوچھے گا۔

میں ہر معاملے کو منطقی طور پر دیکھنے کا خوگر ہوں لیکن جواہر لال شدید جذباتی آدمی ہیں وہ آپ کی ہجرت پر کسی طرح آمادہ نہیں ہوں گے۔

---

1 نام یاد نہیں رہا اس مقام کا

تیسرے دن یہ سن کر کہ پنڈت جی آج آ رہے ہیں میں پالم کے ہوائی اڈے پر پہنچ گیا وہ اترے تو میں نے ان سے کہا مجھے آپ سے ایک بہت ضروری بات کہنا ہے اور آج ہی انہوں نے کہا تو پھر ابھی میرے ساتھ چلئے اور جب ان کے گھر آ کر، میں نے اپنا کل ماجرا بیان کر دیا اور یہ بھی بتا دیا کہ مولانا آزاد کی اس باب میں کیا رائے ہے تو ان کے چہرے پر شدید کرب کے آثار نمایاں ہو گئے اور کہا جوش صاحب آپ نے

مجھ کو بڑی مشکل میں ڈال دیا ہے اور میرا یہ خیال ہے کہ اگر ہندو کی تنگ 1 دلانہ حب الوطنی یہ صورت حال نہ پیدا کر دیتی تو آپ کے دل میں ترک وطن کا کبھی خیال پیدا ہی نہ ہوتا لیکن یہ معاملہ بہت نازک ہے مجھے سوچنے کے لئے دو دن کا وقت دیجئے میں خود بھی غور کروں گا، اور مولانا سے بھی رائے لوں گا۔

دو دن کے بعد جب پہنچا تو نظر اٹھاتے ہی میں نے ان کے دل موہ لینے والے چہرے پر اس قسم کی شگفتگی دیکھی جو کسی ذہنی گرہ کے سلجھانے کے بعد پیدا ہوا کرتی ہے انہوں نے بڑی بشاشت کے ساتھ نگاہ اٹھائی شیریں تبسم لبوں پر مچلنے لگا اور انہوں نے کہا جوش صاحب میں نے آپ کے معاملے کا ایسا اچھا حل نکال لیا ہے جسے آپ بھی پسند کریں گے کیوں صاحب یہی بات ہے نا کہ آپ اپنے بچوں کے معاشی و تہذیبی مستقبل کو سنوارنے، اور اردو زبان کی خدمت کرنے کے واسطے پاکستان جانا چاہتے ہیں؟ میں نے کہا جی ہاں اس کے سوا اور کوئی بات نہیں ہے انہوں نے کہا تو پھر آپ ایسا کریں کہ اپنے بچوں کو پاکستانی بنا دیں لیکن آپ یہیں رہیں اور ہر سال پورے چار مہینے آپ پاکستان میں قیام کر کے اردو کی خدمت کر آیا کریں سرکار ہند آپ کو پوری تنخواہ پر ہر سال چار مہینے کی رخصت دے دیا کرے گی۔

پنڈت جی کی اس تجویز پر میں اچھل پڑا میں نے کہا یہ تجویز مجھے دل سے منظور ہے اس طرح سانپ بھی مر جائے گا اور لاٹھی بھی نہیں ٹوٹے گی پنڈت جی میری منظور سے بے حد بشاش ہو کر میرے گلے لگ گئے حوریاں رقص کناں ساغر و پیمانہ زرند!

1 انہوں نے انگریزی میں Narrowmtnded Patriolism کہا تھا۔

دوسرے ہی دن اخبار والوں نے مجھ کو گھیر لیا میں نے وہ تمام معاملہ جو میرے اور پنڈت جی کے مابین ہوا تھا بیان کر دیا اور تیسرے روز ہی میرا انٹرویو ہندوستان کے تمام انگریزی و اردو اخباروں میں شائع ہو گیا۔

☆☆☆☆☆☆

پاکستانی شہریت

جانا، شاہ زادہ گل فام کا، چوتھی طرف
اور گھر جانا اس کا آسیبوں کے نرغے میں

آسیبوں کے ذکر سے پیش تر یہ سن لیجئے کہ جب پنڈت جی سے یہ معاملہ طے کر کے پاکستان آیا تو نقوی صاحب نے میری خوشی پر پانی پھیر دیا انہوں نے کہا یہ کیوں کر ہوسکتا ہے کہ آپ پاکستانی باشندے نہ بنیں، اور یہاں زمین کا الاٹمنٹ آپ کے نام ہو جائے، ہم کو آپ کے بچے آپ کی نسبت سے پیارے ہیں، جب آپ ہی ہمارے نہ بن سکیں گے تو ہمارے واسطے ناممکن ہو جائے گا کہ ہم آپ کے واسطے سینما بنوائیں، یا باغ لگوا دیں اس کے علاوہ، یہ صورت حال آپ کو کہیں کا بھی نہ رہنے دے گی، پاکستانی آپ کو ہندوستانی سمجھیں گے اور ہندوستان آپ سے اس لئے بدگمان ہو جائے گا کہ آپ کا پورا خاندان پاکستانی بن چکا ہے اور خود آپ بھی ہر سال چار ماہ پاکستان میں رہیں گے جوش صاحب دو کشتیوں میں پاؤں رکھ کر دریا کو عبور نہیں کیا جا سکتا آپ کا بھرم دونوں ملکوں سے اٹھ جائے گا میرے دل کو نقوی صاحب کی اس بات سے بڑا دھکا لگا لیکن چونکہ بات تھی باون تولے پاؤ رتی کی، اس

1 ہماری کہانیوں کے تمام شہزادے ''گل فام'' ہوا کرتے تھے اور جب وہ شکار کے واسطے جانے لگتے تھے تو ان کی مائیں ہمیشہ ان کو یہ تاکید کیا کرتی تھیں کہ جنگل میں صرف تین طرف شکار کھیلنا، چوتھی طرف ہرگز ہرگز نہ جانا اور چوتھی طرف جانے سے وہ اس انبار پر منع کیا کرتی تھیں کہ انہوں نے یہ سن رکھا تھا کہ چوتھی طرف بھوتوں اور آسیبوں کا رمنا ہے لیکن چونکہ انسان کی یہ فطرت ہے کہ وہ جس شے سے منع کیا جاتا ہے اوبدا کر اس شے کی طرف دوڑتا ہے اس لئے تمام گل فام شادی شکار کھیلتے کھیلتے چوتھی طرف ضرور جاتے اور اپنے کو بھوتوں کے نرغے میں گھیر لیا کرتے تھے۔

لئے ان کی منطق کے سامنے سپر ڈال دی اور پاکستانی بن گیا اب سنیئے آسیبوں کا ذکر۔

میرے پاکستانی بنتے ہی یعنی جنگل کی چوتھی طرف جاتے ہی ایک قیامت کا غلغلہ برپا ہو گیا پورے پاکستان میں اور شہر کراچی میں تو اس قدر بلبلا اٹھا گویا صور قیامت پھونک دیا گیا ہے۔۔۔تمام چھوٹے بڑے اردو اور انگریزی اخباروں کے لشکر، خم ٹھونک ٹھونک کر میدان جنگ میں آ گئے تمام ادباء وشعراء اور کارٹوں سازوں نے اپنے اپنے قلموں کی تلواریں نیام سے نکال کر میرے خلاف مضامین قطعات، اور کارٹونوں کی بھر مار کر دی۔

ہر طرف منڈیوں کا سا ایک غلغلہ بلند ہو گیا کہ دہائی سرکار کی، مغل اعظم، یعنی ابو طالب نقوی نے جوش کو آدھا پاکستان کاٹ کر دے دیا۔۔۔مختلف ٹولیوں میں بٹے ہوئے لوگ میرے خلاف متحد ہو کر شیر وشکر ہو گئے وہابیوں بریلیوں، دیو بندیوں، قادیانیوں، سنیوں اور شعیوں نے اپنی چودہ سو برس کی نفرتوں کو یکسر بھلا دیا تبرا اور مدح صحابہ کے مابین طرح مصالحت پڑ گئی اور میرے خلاف متحدہ طور پر اعلان جنگ فرما دیا گیا۔

میں چمن میں کیا گیا، گویا دبستاں کھل گیا

میرا پاکستان آنا ایسا معلوم ہوا گویا کوئی زبردست ڈاکو قارون کے خزانے پر ٹوٹ پڑا ہے یا ابرہہ نے کعبے کا محاصرہ کر لیا ہے یا کام دیو، اچھوتیوں کے محل میں کود پڑا ہے اور تمام کنواری کنیاں ہائے اللہ، ہائے اللہ کے نعرے لگا لگا کر بھاگ رہی ہیں یہ تمام شور، یہ تمام غلغلے یہ تمام دھماکے اور یہ ساری دہائیاں جب حکومت کے کان تک پہنچیں تو وزارت داخلہ نے نقوی صاحب سے جواب طلب کر لیا اور جس وقت میں نے یہ بات دیکھی کہ مجھے باغ اور سینما کی زمین دے کر نقوی صاحب ایک بڑی مصیبت میں گھر گئے ہیں تو میں نے چپکے سے باغ اور سینما کے پلاٹ واپس کر دیئے۔

اس زمانے میں چودھری محمد علی صاحب وزیراعظم تھے،نقوی صاحب کی ان سے کھٹ پٹ ہوگئی نقوی صاحب نے اسکندر مرزا کے بل بوتے پر وزیراعظم سے ٹکر لی تھی سکندر مرزا نے ان کی پشت پناہی سے روگردانی کی اور ان کی کمشنری ختم کر دی گئی نقوی صاحب کے زوال نے میری کمر توڑ دی۔۔۔۔۔میں ادھر کا رہا نہ ادھر کا۔

میں نے سوچا ہندوستان پلٹ جاؤں غیرت نے اجازت نہیں دی۔۔۔۔میں نے دل سے پوچھا خاں صاحب اب کیا ہوگا، دل نے کیا ہمت نہ ہار اگر خار سے بود گل دستہ گر دو۔۔۔

لوگوں نے رائے دی کہ میں حکومت سے درآمد برآمد کا لائسنس لے کر کاروبار شروع کر دوں مجھ گاؤدی کی سمجھ میں یہ بات نہیں آئی کہ میں تجارت کا اہل نہیں میں نے دوڑنا شروع کر دیا اس دوڑ دھوپ میں زندگی اجیرن ہوگئی۔۔۔۔روز صبح کو گھر سے نکلتا دوپہر کو پلٹتا تھوڑی دیر آرام کر کے پھر باہر نکل جاتا اور شام کو واپس آتا تھا۔

میرا عالم اس گاؤں والوں کے علم کا سا ہو گیا تھا جو محرم کے زمانے میں اٹھایا جاتا ڈھول تاشوں کی تروڑ، تروڑ، جھیم جھیم کی گونج میں ہر مکان کے چبوترے پر رکھا جاتا اور اسی طرح دن بھر چکر کاٹ کاٹ کر پھر اسی تروڑ تروڑ جھیم جھیم کے ساتھ مکان میں لا کر رکھ دیا جاتا ہے اس دوڑ دھوپ میں خدا کے فضل و کرم سے کچھ ہاتھ تو آیا نہیں البتہ ڈائرکٹروں، سیکرٹریوں اور وزیروں کے ایسے دو دو کوڑی کے نخرے ایسے اوچھے ٹھسے اور اس قدر غیر شریفانہ گڈامیر پن دیکھے کہ آدمی کا وقار نظروں سے گر گیا اور یہ فیصلہ کرنا پڑا کہ اس قوم میں کسی صاحب قلم کی کوئی گنجائش نہیں ہے اور ہر ادیب و شاعر کو چاہئے کہ وہ خودکشی فرمالے یہ سچ ہے کہ ہندو حکام بھی بعض اوقات نخرے دکھاتے ہیں لیکن اللہ اکبر یہ مسلمان جب ہیڈ کانسٹیبل ہو جاتا ہے تو ہامان و فرعون بن جایا کرتا ہے اور حکومت کی گدی پر بیٹھ کر، خدمت گاروں اور پھیری والوں کے لڑکے بھی اپنے کو قیصر و دارا سمجھنے لگتے ہیں اللہ بونوں کے در پر لنکا والوں کو نہ لے جائے اب میری مسلسل

ناکامیوں کی فہرست ملاحظہ فرمائیے۔

1 جہانگیر روڈ کا سینما پلاٹ، اور باغ لگانے کی زمین ۔۔۔۔۔خود میں نے واپس کردی۔

2 ایک سوسائٹی کا سینما پلاٹ، نیلام میں، میرے نام چھوٹا ۔۔۔۔ قیمت ادا نہ کر سکا اس لئے نکل گیا۔

3 کاشتکار کے لئے، ہاشمی صاحب، ڈپٹی کمشنر کراچی نے پچاس ایکڑ زمین دی الطاف گوہر نے اسے ضبط فرمالیا۔

4 سائیکل رکشاؤں کے پرمٹ ملے ۔۔۔۔۔نرخ گر گیا پرمٹ ہوا میں اڑ گئے۔

5 کولڈ اسٹوریج کی اجازت مل گئی روپیہ لگانے والوں کو ورغلا دیا گیا۔

6 واجد علی شاہ کنٹرول ریٹ پر بسیں دینے پر آمادہ ہو گئے ۔۔۔۔۔روپیہ لگانے والے کو روک دیا گیا۔

7 بیٹری کے پتوں کا لائسنس مل رہا تھا لائسنس دینے والے کے غمزے برداشت نہ کر سکا اسے برا بھلا کہہ کر گھر آ گیا۔

8 سینما کے ساز و سامان کا دوسرے دن پرمٹ مل رہا تھا ۔۔۔۔۔وزیر معطل کر دیا گیا۔

9 ٹیکسٹائل کا اجازت نامہ ملنے والا تھا ۔۔۔۔وزیر بدل گیا۔

10 پریس قائم کرنے کا اجازت نامہ لکھ کر تیار ہو گیا دستخط کرنے سے پیشتر وزیر کو نکال دیا گیا۔

11 مچھلی کی تجارت کا پرمٹ لکھ دیا گیا تھا سیکرٹری کو برطرف کر دیا گیا۔

12 پٹرول پمپ کی سعی کی گئی ناکام ہو گئی۔

13 ایک مکان الاٹ ہوا تھا آج تک قبضہ نہ مل سکا

14 دیہی ترقی کے محکمے میں نوکری کی درخواست دی منظور نہیں ہوئی۔

15 اپنی کتابوں کی طباعت واشاعت چاہی لیکن کوئی ناشر تیار نہیں ہوا۔

16 فرئیر ہال کے ایک کوشے میں ریستوران کھلوا دینے کا وعدہ محکم کیا گیا۔۔۔۔افسر صاحب کا تبادلہ ہوگیا۔

17 سندھی ادبی بورڈ میں ایک علمی کام کیا۔۔۔۔اجرت نہیں ملی

18 محکمہ اباد کاری کے ایک افسر صاحب نے مکان کی زمین الاٹ کر دی۔۔۔۔۔چلتے وقت وہ کھڑے نہیں ہوئے الاٹمنٹ کا پرزہ پھاڑ کر ان کے سامنے پھینک دیا۔

19 پنجاب کے چیف منسٹر قزلباش صاحب ایک کارخانے کا پرمٹ دے رہے تھے کہ اسی دن فوجی انقلاب آ گیا اور ان کی وزارت نے دم توڑ دیا الغرض:

جس جگہ، ہم نے بنایا گھر، سڑک میں آ گیا

ان مسلسل ناکامیوں نے مجھ کو چکرا دیا۔شدت یاس اور ہجوم افلاس نے میرا احاطہ کرلیا۔۔۔۔نقوی صاحب جو ایک ہزار روپیہ بطور قرض دیتے تھے وہ اس قدر کم تھا کہ میرا گھر چلا نہیں سکتا تھا اس لئے اپنے ایک دوست کے ذریعہ سے زیور بیچ بیچ کر کام چلانے لگا۔

میں نے سوچا کہ یہ کاغذ کی ناؤ کب تک چلے گی۔۔۔۔بیوی نے کہا ساری مدیں آدھی کر دو اس کی لپیٹ میں آ کر، شراب ترک کر دی۔۔۔۔ترک شراب کے بعد، میرا اس بچے کا سا عالم وہ گیا جس کا دودھ چھڑا دیا جاتا ہے شراب کی پھڑکن سے نجات پانے کے واسطے شام ہی سے کھانا لیکھا لیا کرتا تھا لیکن بے چینی میں کمی نہیں آتی تھی جی بہلانے کو کتاب اٹھا لیتا تھا کہ شراب کی کلک بہل جائے کتاب کی سطریں ناگنوں کے مانند رینگنے لگتی تھیں اور حروف کے دائروں میں بچھو ڈنک اٹھائے نظر آتے تھے۔

گڑمڑا کر بستر پر لیٹ جاتا اور کروٹوں پر کروٹیں بدلتا تھا لیکن نیند کسی طرح بھی نہیں آتی تھی اور تمام جسم میں کھجلی ہونے لگتی تھی، گھنٹوں کھر کھر کھجایا کرتا

1۔ کھانے کے بعد شراب کی خواہش باقی نہیں رہتی۔

اور چھپکلی کی کٹی ہوئی دم کے مانند رات رات بھر تڑپتا رہتا تھا۔۔۔۔۔اور صبح کو جب خط بنانے کے واسطے آئینے کے سامنے بیٹھتا تھا تو اپنا بے خوابی کا روندا ہوا تنہیا کا سا منہ دیکھا نہیں جاتا اور اپنی شکل دیکھ کر ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کوئی تھوبڑ قسم کے مسکین شاہ دہلی کی جامع مسجد کی سیڑھیوں پر بیٹھے دانت نکال نکال کر بھیک مانگ رہے ہیں۔

اگر کسی دن کتے کی سی چھپکلی آ بھی جاتی تھی تو اتنے برے برے اور ٹوٹے ٹوٹے خواب دیکھتا تھا کہ بار بار بھق سے آنکھ کھل جایا کرتی۔۔۔۔اور گھڑی کی ٹک ٹک دل پر گھن چلانے لگتی تھی۔

نہ جانے کتنے سنسناتے سیلے سپاٹ سوکھے روکھے پھیکے ڈکارتے ڈستے پھنکارتے بھیانک اور بھنبھوڑتے خواب دیکھ ڈالے اس زمانے میں ان خوابوں میں سے ایک خواب 1 درج کر رہا ہوں:

تکیے پر سر رکھا، اندازہ ہو گیا کہ آج بھی پایاب، اور اوچھی نیند آئے گی۔۔۔۔ تھوڑی دیر چت پڑا رہا۔۔۔۔بدن سنسنانے لگا آہستگی سے داہنی کروٹ لی۔۔۔۔ داہنی کروٹ کو پھر بائیں کروٹ میں تبدیل کیا۔۔۔۔۔۔دماغ کو خالی کر کے چاہا کہ اس میں نیند کو آباد کر دوں۔۔۔۔۔رفتہ رفتہ سانس میں ہمواری پیدا ہونے لگی اور سر پر ایسے آہنگ کے ساتھ نیند منڈلانے لگی جیسے اترتے وقت جہاز کی آواز۔۔۔۔۔شاید بیس پچیس منٹ میں سو گیا اتنے میں کسی احمق نے فریج میں کوئی چیز رکھ کر دھڑام سے اس کا دروازہ بند کر دیا۔۔۔۔اوچھے کا پیار، بابو کی دیوار۔۔۔اس دھڑاکے سے نیند اچٹ گئی اور آئف ہو کر ہنہنانے لگی اور دماغ تپ تپ ہونے لگا دل نے کہا ارے غضب ہو گیا اب نیند نہیں آئے گی گھبرا کر سیدھے ہاتھ کی طرف کروٹ بدلی کمبل کو سینے تک کھینچ لیا چادر سے کے گوشے کو گل تکیہ بنالیا۔۔۔۔۔اور دماغ کو اس تصور کی موجوں سے ترانے لگا کہ میں اپنے ریزرو کمپارٹ منٹ میں سفر کر رہا ہوں

1۔اس خواب کو صبح ہوتے ہی لکھ لیا تھا اس لئے محفوظ رہا۔

گھنے اور اندھیرے جنگل سے ریل ستار بجاتی گزر رہی ہے تھوڑی دیر میں دوبارہ ہلکی سے حبابی نیند آنے لگی ایسا لگا کہ دماغ پر اوس گر رہی ہے پھر ہلکے سے کہرے نے میرے وجود کو ڈھانک لیا ریل چھکا چھک چلی جا رہی ہے اور میں سو رہا ہوں خدا خدا کر کے نیند آ گئی تو خواب دیکھا کہ سامنے ایک بڑا سا میدان ہے جہاں خیمہ نصب کرنے کے لئے میخیں ٹھونکی جا رہی ہیں کھٹا کھٹ، کھٹا کھٹ ۔۔۔۔۔اس کے بعد ایک دل بادل خیمہ نصب کر دیا گیا ہے خیمے کے اندر باہر بڑے بڑے گیس کے ہنڈے روشن کئے جا رہے ہیں ۔۔۔۔اس کے بعد دس پندرہ فراش آ گئے اور بڑی بڑی دریوں کو زور زور سے جھٹک کر بچھا رہے ہیں دریوں کے جھٹکے جانے سے گرد اڑ رہی ہے گرد سے مرچوں کی دھانس آ رہی ہے ۔۔۔۔ایک کچو داڑھی کا فراش چیخ چیخ کر کہہ رہا ہے ابے رمضیا سالے، زندہ ہے کہ مر گیا ارے اگان دان لا اگال دان۔

اب کچھ لوگ خیمے میں داخل ہو رہے ہیں ان کی ٹوپیاں دو دو گز لمبی ہیں ٹوپیوں پر مرغے کڑھے ہوئے ہیں کچھ لوگوں کے سروں پر بڑے بڑے کالے پگڑ ہیں پگڑوں کے اوپر گیا بیتال بیٹھے تاش کھیل رہے ہیں ان کے جسموں پر چیتے کی کھال منڈھی ہوئی ہے جوتوں کی ڈوریوں میں مگرمچھ بندھے ہوئے ہیں ان کی جیبوں سے بار بار بندر جھانک رہے ہیں بندروں کی گردنوں میں ناگوں کے مفلر پڑے ہوئے ہیں اور جب وہ لوگ بیٹھ گئے قالینوں پر تو بیٹھتے ہی ان کی ناکیں دفعتہً چھ چھ فیٹ لمبی ہو گئیں اور ناکوں کی چونچوں پر ریچھ ناچنے لگے ۔۔۔۔اوہو، ایک مشعلچی بڑھتا چلا آ رہا ہے اس کی ٹھڈی پر لنگور کی دم کی سی پتلی داڑھی ہے ۔۔۔۔اور اس کے پیچھے پیچھے ایک پورا طائفہ چلا آ رہا ہے بڑے زبردست ہنگامے کے ساتھ ۔۔۔۔۔طائفہ خیموں کے بیچوں بیچ آ کر بیٹھ گیا ۔۔۔۔۔۔حاضرین حقے پینے اور سازندے ساز ملانے لگے ۔۔۔۔سازوں کے ملنے سے دو خوں خوار بلیوں کے لڑنے کی آوازیں آنے لگیں

اور حقوں کے کڑاکے ایک دوسرے کو فحش گالیاں دینے میں سرگرم ہو گئے۔۔۔۔۔۔۔۔۔گانے والی سامنے آئی اس کا منہ گھونس کا سا ہے اس کے دونوں ہاتھوں میں کھڑاویں بندھی ہوئی ہیں سرنگیا تانت کی طرح پتلا اور تاڑ کی طرح لمبا ہے طبلچی اس قدر موٹا ہے کہ پندرہ گز زمین گھیرے بیٹھا ہوا ہے اور وہ اپنے سونڈوں کے سے ہاتھوں سے دھما دھم طبلہ بجا رہا ہے اس کے طبلے کی تھاپ سے گیس کے ہنڈے چٹختے چلے جا رہے ہیں گھونس کی سی شکل والی مغنیہ گا نہیں، چیخ رہی ہے اور اس کے منہ سے موٹے موٹے کوے نکل نکل کر قاؤں قاؤں کر رہے ہیں۔

اتنے میں یہ دیکھا کہ مشکل سے دو بالشت کا ایک بونا گل مچھے رکھے مٹکتا چلا آ رہا ہے اس کے گلے میں ایک بڑی سی دیگ لٹکی ہوئی ہے اور وہ لوہے کے ایک ٹکڑے سے اس دیگ کو ٹن ٹن ٹن ٹن بجا بجا کر تال دے رہا ہے۔۔۔۔۔اتنے میں کیا دیکھا ہوں کہ اس کی دیگ سے ایک مرہٹہ کود پڑا اور جھانجیں بجانے لگا اور جھانجیں اس زور سے بجنے لگیں کہ مجھ بد بخت کی آنکھ کھل گئی اور دیکھا کہ گھڑی تین بجا رہی ہے اور سیف شاہ جہاں پوری کا یہ شعر دماغ میں گونج رہا ہے:

دل کی لگی شب فراق اپنا اثر دکھائے گی
لیٹو گے، لاکھ بن کے تم نیند کبھی نہیں آئے گی

سہروردی صاحب اسی اثناء میں سہروردی صاحب کو وزیر اعظم بنا دیا گیا اور میں اس فکر میں پڑ گیا کہ لاسنسوں کے چکر سے نکل کر میں نے ''باپ قرطاس وقلم'' دا ایکاڈمی آف لیٹرز کے نام سے جو منصوبہ تیار کیا ہے اس کو سہروردی صاحب کی بارگاہ میں کیوں کر پیش کروں اور جب میں نے اپنے ایک مخلص دوست منان خاں ایڈووکیٹ سے اس کے متعلق مشورہ کیا تو انہوں نے کہا کہ میرے ایک بہت اچھے دوست ہیں محمود الحق صاحب عثمانی، جو سہروردی صاحب کے مقرب خاص ہیں ان سے کہوں گا کہ وہ آپ کو سہروردی صاحب سے ملا دیں۔۔۔۔۔چنانچہ ایک روز منان

خاں عثمانی صاحب کو لے کر خود میرے گھر آ گئے اور معاملہ طے ہو گیا اس کے دوسرے ہی دن عثمانی صاحب نے مجھے سہروردی صاحب سے ملا دیا سہروردی صاحب نے میری تجویز کو بہت پسند کیا اور وعدہ فرمایا کہ میں اکیڈمی قائم کرا دوں گا۔

لیکن میری بدبختی دیکھئے کہ دوسرے ہی دن عثمانی اور سہروردی کے مابین ایسا بگاڑ پیدا ہو گیا کہ ان کی آمد و رفت ہی بند ہو گئی اور میں بے آسرا ہو کر رہ گیا۔

اس کے بعد، خدا کا کرنا یہ ہوا کہ بیگم شائستہ 1 اکرام کراچی آ گئیں اور آفتاب احمد خاں، وزیر اعظم کے سیکرٹری بلکہ دست راست بن گئے۔۔۔۔ اور چوں کہ یہ دونوں مجھ کو بہت پہلے سے جانتے تھے، انہوں نے میری بڑی دست گیری کی۔

بیگم صاحب، سہروردی کی، رشتے کی بہن تھیں انہوں نے میرے مبالغہ آمیز'' محامد و محاسن'' کچھ اس طرح دلنشیں کر دیئے کہ سہروردی صاحب جو خود بھی ایک ادبی اور صاحب جوہر آدمی تھے مجھ پر بے حد مہربان ہو گئے اور مجھ کو اجازت دے دی کہ میں جب بھی جی چاہے بلا روک ٹوک ان کے پاس آ جایا کروں۔

اس طرح آفتاب احمد خاں نے بھی سہروردی پر میرا سکہ جمانا اور میرا ہاتھ بٹانا 2 شروع کر دیا اور میری تجویز حرکت میں آ گئی۔

حسن اتفاق، یا میری خوش قسمتی کہئے کہ اس اثناء میں زبیری صاحب مرحوم تعلیمات کے سیکرٹری کے عہدے پر فائز ہو گئے۔۔۔۔ وہ نہایت ذی علم و ادب نواز انسان تھے میری امداد پر تل گئے اپنی زبردست سفارش کے ساتھ انہوں نے میری کارروائی فنانس بھیج دی اور مجھے مشورہ دیا کہ میں فنانس سیکرٹری ممتاز حسن صاحب سے مل لوں۔

ممتاز حسن صاحب کا نام سن کر میں چکرا گیا۔

1 میں اپنے ان دونوں محسنوں کو تا مرگ فراموش نہیں کر سکوں گا

2 آفتاب صاحب کے توجہ دلائے پر سہروردی صاحب نے لٹریری فنڈ سے مجھے

پانچ ہزار روپے بھی بھیجے تھے پانچ ہزار روپے اس وقت پانچ لاکھ معلوم ہوئے تھے۔

اور اس چکرانے کے دو اسباب تھے پہلا سبب تو یہ تھا کہ چونکہ 1942ء میں دہلی کے ایک مشاعرے کی شرکت کے سلسلے میں، ہمارے مابین ایک ناخوشگوار واقعہ پیش آ چکا تھا، اور اس لئے میں سمجھتا تھا کہ وہ کسی مفید ملک کام میں بھی میرا ساتھ نہیں دیں گے، اور دوسرا سبب یہ تھا کہ حدیث متواتر کے طور پر میں یہ سن چکا تھا کہ ممتاز حسن صاحب، اس بدنصیب صوبے کے دشمن جانی ہیں جس کو ''یو پی'' کہتے ہیں لیکن میں ان سے کیوں کر نہ ملتا۔ ارتکاب ازدواج کے بعد باپ اور نانا بن چکا تھا ان سب کو پالنا کیوں کر اس لئے، اپنی اوقات پر لعنت بھیجتا ہوا دفتر مال پہنچا۔ پہنچتے ہی قدم دو دو من کے ہو گئے۔۔۔۔ ٹھنڈی انگلیوں سے اپنا نام لکھ کر، پرچہ اندر بھیج دیا۔

چپراسی نے آ کر کہا اس وقت ایک صاحب وہاں بیٹھے ہوئے ہیں آپ پی اے کے کمرے میں انتظار کریں دل نے کہا اور آؤ پاکستان خون کے گھونٹ پئے اور پی اے کے کمرے میں جا کر بیٹھ گیا پی اے صاحب نہ تو کھڑے ہوئے نہ ہاتھ ملایا، مجھ کو فرعون کی طرح دیکھا، اور کام کرنے لگے۔ دل نے کہا مبارک ہو خاں صاحب، پاکستان کی طرف سے یہ عزت افزائی جی چاہا کہ کمرے سے نکل جاؤں پھر سوچا کہ ہم تو طارق کی طرح کشتی جلا کر آئے ہیں اب کہاں جا سکتے ہیں۔

ابھی مشکل سے چھ سات منٹ اس عذاب میں گزرے تھے کہ کیا دیکھتا ہوں، کہ خود ممتاز حسن صاحب میرے سامنے کھڑے، اور معذرت خواہی کر رہے ہیں۔۔۔۔ ممتاز صاحب کی اس غیر متوقع اور غیر معمولی شرافت نے مجھ کو حیرت میں ڈال دیا اور میرے دل کو ان کی جانب جھکا دیا اور میں اپنے سوءظن پر دل ہی دل میں ملامت کرنے لگا۔

اپنے کمرے میں لے جا کر انہوں نے مجھ سے یہ کہا کہ آپ کی اکاڈمی کی تجویز بہت لمبی چوڑی ہے اگر آپ اس کو تدوین لغت تک محدود کر دیں تو فنانس اس کی

منظوری دے دے گا مجھے اپنی اس تجویز کے بھچاؤ پر افسوس ہوا لیکن میں بے چارہ کر ہی کیا سکتا تھا ناچار اسی شکل کو غنیمت سمجھا، میں نے ان کی بات مان لی، ترقی پر اردو بورڈ وجود میں آ گیا، اور میری کئی سال کی عرق ریزی اور سعی مسلسل مشکور ہو گئی۔

بورڈ بن گیا تو انجمن ترقی اردو کے صدر مولوی عبدالحق صاحب کو رکنیت کی دعوت دی گئی مولوی صاحب مجھ کو ناپسند کرتے تھے، اس لئے انہوں نے یہ جواب دیا کہ اگر مجھ کو لغت کا چیف ایڈیٹر نہیں بنایا گیا تو میں رکنیت کی دعوت کو ٹھکرا دوں گا۔

ممتاز حسن صاحب نے عبدالحق صاحب کی اس ضد پر منہ بنایا۔۔۔۔ لیکن، کچھ سوچ کر منظور کر لیا اب کیا تھا، عبدالحق چیف ایڈیٹر ہو گئے۔۔۔۔ انجمن ترقی اردو کے دفتر میں لغت کا کام ہونے لگا میں نے بورڈ کے لئے دوڑ دھوپ کر جو عمارت کرائے پر لی تھی وہاں چند کلرک رہ گئے اور میں ممتاز حسن صاحب نے مجھ کو ''مشیر ادب'' کا عہدہ دے دیا سب سے زیادہ میری تنخواہ مقرر کر دی لیکن عبدالحق صاحب نے کوئی سوا یا ڈیڑھ برس تک مجھ سے کوئی کام ہی نہیں لیا اور میں دفتر میں بیٹھا تنخواہ لیتا، مکھیاں مارتا اور یہ سوچتا رہا کہ میں نے جس دفتر کو، کئی سال خون پانی ایک کرنے کے بعد قائم کرایا تھا مجھ کو اسی دفتر میں ''چوں مد بحساب اندر'' بنا کر رکھ دیا گیا ہے بے کاری، اور مفت کی تنخواہ داری سے تنگ آ کر میں نے آخر ممتاز صاحب کو لکھا کہ مجھ سے لغت نویسی کا کام لیا جائے۔۔۔ اور جب انہوں نے مجھ کو لغت نویسی پر مقرر کر دیا تو مولوی عبدالحق صاحب کو اس قدر تاؤ آ گیا کہ وہ ادارت و رکنیت، دونوں سے، دست برداری پر آمادہ ہو گئے۔

اس کے بعد بورڈ کے سیکرٹری شان الحق صاحب حقی کا مولوی عبدالحق اور شوکت صاحب سبزواری سے سخت بگاڑ ہو گیا۔ اور گرما گرم مراسلت کا سلسلہ چھڑ گیا مولوی صاحب کے انتقال کے بعد لغت کا کام بورڈ کے دفتر میں ہونے لگا۔ اور حقی صاحب و سبزواری صاحب کے مابین ظاہری مصالحت تو ضرور ہو گئی، لیکن دلوں میں کدورت

باقی رہی، اور انشاءاللہ تا قیامت باقی رہے گی اس لئے کہ ارباب یوپی اور اہل دہلی کی فطرت ہی یہی ہے۔

اس کے بعد حقی صاحب کے دل میں مجھ سے سبھی گرہ پڑنا شروع ہوگئی۔ برتاؤ تو ہمارے درمیان خوردانہ و بزرگانہ ہی رہا۔لیکن چونکہ حقی صاحب کا یہ درپردہ مطالبہ رہتا ہے کہ لوگ ان کے روبرو جھکتے رہیں، اور میں نے ان کے اس مطالبے کو خوراک نہیں پہنچائی اور جب وہ مطالبہ مسلسل بھوکا رہنے لگا تو وہ سوچنے لگے کہ مجھ کو کس طرح زک پہنچا سکتے ہیں اور آخر کار، اللہ نے ان کو وہ موقع دے ہی دیا۔

غالباً اگست 1967ء میں رخصت لے کر، میں اپنے ملیح آباد کے باغوں کے تصفیے کی خاطر ہندوستان گیا۔اور باغوں کے معاملے نے اس قدر طول کھینچا کہ مجھے وہاں چار مہینے رہنا پڑا۔باغوں اور مشاعرے کے سلسلے میں بمبئی پہنچا انصاری صاحب کسی اخبار کے نمائندے کو لے کر انٹرویو کے لئے آئے۔۔۔۔اور میرا انٹرویو کسی انگریزی اخبار میں شائع ہوگیا۔۔۔۔رخصت کے اختتام پر جب لاہور پہنچا تو مجھ سے کہا گیا کہ میرے بمبئی کے معصومانہ انٹرویو کو نئے نئے معانی پہنا کر، یہاں کے اخباروں نے خوب اچھالا اور مجھ کو پاکستان دشمن ٹھہرا دیا ہے مجھ کو یہ سن کر افسوس تو ضرور ہوا لیکن تعجب بالکل نہیں ہوا میں نے خیال کیا کہ جب حدیث اور قرآن کو اپنے سانچے میں ڈالنے کے لئے تاویلات کے ذریعے سے بدل دیا جاتا ہے تو میرا انٹرویو کیا چیز ہے لاہور میں ان اخباروں کا ابطال شائع کرا کے جب کراچی آیا اور دفتر پہنچا تو حقی صاحب نے بڑے گستاخانہ انداز میں مجھ سے مراسلت شروع فرما دی۔

اور آخر کار، اس غیر شریفانہ سلسلے کو بند کر دینے کے واسطے میں نے حقی کو لکھ بھیجا کہ میں جس خاندان کا رکن اور جس مزاج کا آدمی ہوں اس مزاج کا آدمی ٹوٹ تو سکتا ہے لیکن لچک نہیں سکتا۔اگر آپ میری معاش پر ضرب لگانے کی ٹھان چکے ہیں تو:

نگاہ گرم سے، حالت ہو دل کی اور تباہ

اگر یہی ہے ارادہ ترا، تو بسم اللہ

میری اس آخری تحریر کے بعد حقی صاحب کا مراسلہ آیا کہ اب مجھے تو سیج نہیں دی جائے گی میں دفتر سے قطع تعلق کر کے گھر آیا اور حقی کے گھر میں گھی کے چراغ جلنے لگے۔

لیکن اس خبر کو حقی صاحب نے کسی اخبار میں شائع نہیں ہونے دیا، تا کہ ان کا پول نہ کھلنے پائے اور جب ہندوستان کے ریڈیو نے میری برطرفی کا اعلان کیا تو یہاں کے اخبار نے، بڑی ڈھٹائی کے ساتھ، اس کی تردید کرتے ہوئے الٹا اس کو جھوٹا قرار دے دیا۔ چہ دلاورست دزدے۔۔۔۔۔ میری زندگی کا بحمد اللہ کہ یہ پانچواں معاشی بحران ہے، جس سے کہ اس وقت گزر رہا ہوں ہر چند میری ملازمت کو ختم کر دیا گیا میرا پاسپورٹ بھی ضبط کر لیا گیا ہے میری سیمنٹ کی ایجنسی بھی مجھ سے چھین لی گئی ہے۔۔۔۔۔ اور میرے باغوں کا جو روپیہ ہندوستان کے ریزرو بینک میں جمع ہے وہ بھی مجھے یہاں نہیں مل سکتا اور اس کے ساتھ ساتھ ہر چند، خدا کے فضل و کرم سے میرا کوئی بینک بیلنس بھی نہیں ہے لیکن میں بدحواس نہیں ہوں بدحواسی تو درکنار میں پہلے ہی کی طرح ہشاش بشاش ہوں اور مجھ کو یقین کامل ہے کہ میرا یہ بحران بھی میرے چار عدد سابق بحرانوں کے مانند، کسی خیر جدید کا سرچشمہ بن جائے گا۔

مجھ کو اس امر کا یقین کس بناء پر ہے؟ یہ بھی سن لیجئے:

میں جب حیدر آباد گیا تھا اور سر اکبر حیدری کی سی طاقت در شخصیت سے بگاڑ پیدا ہونے کے بعد جب میرے پنپنے کی کوئی صورت باقی نہیں رہی تھی۔۔۔۔ اس وقت نظام نے میری خاطر، ایک جدید و غیر ضروری عہدہ خلق کر کے مجھے برسر روزگار بنا دیا تھا۔

جب دکن سے میرا اخراج ہوا تھا۔۔۔۔ اس وقت سردار روپ سنگھ اور سروجنی نائڈو نے میری مدد کی تھی اس کے بعد شیونرائن نے ہاتھ بٹایا تھا اور جب شیونرائن نے

ساتھ چھوڑ دیا تھا، ۔۔۔اس وقت مہاراجہ پٹیالہ میری پشت پر آ کر کھڑے ہو گئے تھے جب بمبئی میں نان شبینہ تک سے محروم ہونے کا وقت سر پر آ پہنچا تھا اس وقت پنڈت نہرو نے میری دستگیری کی تھی۔

جب نقوی صاحب کی دعوت اور بھروسے پر یہاں آیا تھا اور نقوی صاحب کی کمشنری جاتی رہی تھی۔۔۔۔۔۔۔۔۔اس وقت سہروردی صاحب شائستہ اکرام، آفتاب احمد خاں، زبیری صاحب، اور ممتاز حسن صاحب نے میری تجویز کو منظور کر کے ترقی اردو بورڈ بنایا اور میری معاش کا بندوبست کر دیا تھا۔

سوچتا ہوں کہ جب کوئی نامعلوم توانائی یا حسن اتفاق کی تکرار ہر برے وقت پر میرا ساتھ دیتی رہی ہے اور ہر موقع پر کوئی اللہ کا بندہ ''مردے از غیب'' کی طرح چپکے سے آ کر اور میری مصیبت کے پہاڑ کاٹ کر، غائب ہو جاتا ہے تو مجھ کو اس بحران کی بھی کوئی پروا نہیں کرنا چاہئے اور میرا دل گواہی دیتا ہے کہ اس بحران کا سر بھی میرے قدموں پر جھک کر رہے گا۔

ہزار دام سے نکلا ہوں، ایک جنبش میں
جسے غرور ہو آئے کرے شکار مجھے!

اور اسی بناء پر جس دن میری نوکری چھٹی تھی تو نوحے یا مرثیے کے بدلے میں نے اسی روز ایک نظم ''ترانہ بہار'' کے نام سے کہی تھی آپ بھی سن لیں اور داد دیں۔

لو اٹھا جھوکر، وہ ابر بہار
والشربو، والشربو، اعلیٰ الابصار
آؤ، ''یاہو'' کی گونج میں وہ الاپ
کہ دو عالم ہوں رقص پر تیار
آؤ، وہ دھن، کنشت میں چھیڑیں
جھوم جائیں، بہشت کے اشجار

خطہ برف سے اگائیں آگ
آگ میں لہلہائیں پھر گل زار
سنگ و آہن کو بخش دیں آہنگ
خار و خس کو عطا کریں چہکار
کھٹ کھٹائیں، سبو کے دستے سے
باب آگاہی و در اسرار
آج، یہ راز فاش کر دیں آؤ
کہ رئیسان شہر ہیں نادار
آؤ، دربار کج کلاہاں میں
عاجزی کو سکھائیں استکبار
بخش دیں، رہ نشیں گداؤں کو
حکم سلطان سے جرات انکار
گنج باطل کو چھوڑ دیں شاخیں
دست قاتل کی توڑ دیں تلوار
آندھیوں کو بنائیں، موج نسیم
زلزلوں کو سکھائیں وضع قرار
نار گیتی سے بین لیں شعلے
مار گردوں سے چھین لیں پھنکار
آؤ عرفاں کے یوں سبو چھلکائیں
کہ الٹ جائیں، اولیائے کبار
یوں کریں، شرح وحدت آفاق
ایک ہو جائیں کافرو دیں دار

ذرہ و آفتاب کے مابین
ڈال دیں، آؤ، طرح بوس و کنار
آؤ، یوں، دھوم سے گلال اڑائیں
کہ گلابی ہو، کہکشاں پہ سوار
آؤ، پیدا کریں، بگردش جام
وقت اندک میں، فرصت لبسیار
آؤ، عمر خضر کو، چکرا دیں
جب و تاب لمحہ سرشار
آؤ، ذرات کو، عطا کر دیں
تتلیوں کے پروں کے نقش و نگار
لائی، پھر، بوئے زلف لا محدود
مرحبا، مرحبا، نسیم بہار
ہاں اب اے دل نواز سازندے
اور کچھ اور تھاپ کی گمگار
اور پھر جائے، این و آں سے نگاہ
اور گھر جائے ابر زمزمہ بار
اور بڑھ جائے، صحت مستی
اور چڑھ جائے نرگس بیمار
اور ہو تیز، اے نسیم شمال
اور ہو تند، اے ہوائے چنار
اور اے ابر سرمگیں، دھمال
اور اے آب آتشیں دہکار

اور مہکو ہزارہ وسوسن

اور بہکو، ثوابت و سیار

اور بوجھل ہو مے کدے پہ گھٹا

اور گٹھل ہو، احتیاط کی دھار

اور ساز الست کی آہنگ

اور رندان مست کی بنکار

اور شیشوں کی انجمن میں کھنک

اور بوندوں کی شاخ سے پٹکار

ہاں، ابل اے شراب کاکل درخ

ہاں بدل، اے مزاج لیل و نہار

ہاں، لہردے میں گھوم جائے گھٹا

ہاں کہردے میں جھوم جائے نکھار

بدلیو، ہاں، یہی گرج، ہر آن

بجلیو، ہاں یہی کڑک، ہر بار

خوف شب خوں پہ، ہاں یہی پتھراؤ

جور گردوں سے ہاں یہی پیکار

ہاں، یہی بھیڑ بھاڑ، اے رندو

ہاں، یہی چھیڑ چھاڑ اے بوچھار

ہاں یہی نغمہ ہو الوجود

ہاں یہی نعرہ ہو الغفار

ہاں گدایان کوئے پیر مغاں

یوں جگا دو، لبوں پہ، صوت ہزار

کہ سلاطین آسماں اور تنگ
مانگنے آئیں، رقص و رنگ ادھار
یوں الجھنے لگے، گھٹا سے ہوا
کہ سلجھنے لگیں، نشاط کے تار
کھول دو، ہاں، زمین کے غرفے
بول دو، آسمان پر، یلغار
یوں، پھرکنے لگے رگوں میں سرور
کہ تھرکنے لگے چمن کا نکھار
مست رامش گرو، دھنوں میں گھماؤ
نغمہ سجرو موجہ انہار
یوں ستاروں پہ، متصل جھالے
کہ پڑے دور تک مہین پھوار
یوں مان آڑے سروں کو قوس بناؤ
کہ جھلک جائے مصر کا بازار
مغبچو گھوم کر کمر لچکاؤ
مطربو، جھوم کر اٹھاؤ ستار
گرہ زلف ناز و بند قبا
کھول دو، دختران قاف دتار
یوں، نقابیں اٹھاؤ مکھڑوں سے
کہ گلابی کو، توڑ دیں، رخسار
اس ٹھکانے کے ساتھ بھاؤ بتاؤ
کہ بدل جائے وقت کی رفتار

بوئے گل کو بناؤ خیمہ زر
رنگ مل کو بجاؤ سلسلہ وار
اس انوکھی لٹک سے توڑا کو
کہ دھڑکنے لگے دل کہار
لے کو پہناؤ اوکھلی چولی
سر پہ جھمکاؤ، لٹ پٹی دستار
اس جونٹی دھمک سے رقص کرو
کہ گمکنے لگیں، در و دیوار
یوں ہو چھم چھم کہ فرش بن جائے
تند قلزم کی سطح ناہموار
توڑ دو جال، اے زمان و مکاں
تال دو، تال اے یمین و یسار
ہاں، گلوں کی خمیدہ لیکھوں پر
کم سنو، یونہیں، پتیوں کی قطار
اے بتوں کی چھبو، یہی جادو
اے گلابی لبو، یہی مہکار
مدھ بھری پاگلو، یہی چھل بل
گھومتی چھاگلو، یہی جھنکار
نشر کرنا ہیں، جوش کے نغمات
ہاں، اٹھو، اے پیمبران بہار!!

دیکھیے، آپ نے میرے تیور؟ ایسی تیسی اس بحران کی بر پا پوش قلندر!!!

بحمد اللہ کہ میری نوکری چھٹے 1 ہوئے اب ایک مدت گزر چکی ہے جس روز میں

حضرت حق کے فضل و کرم اور حقی صاحب کے قلم فیض رقم سے برطرف کر دیا گیا تھا، اس روز پورے دن نہ سہی چند گھنٹے تو ضرور پریشانی رہی تھی لیکن میری بیوی کی ہمت اور میری عزیمت نے اس وقتی پریشانی کو شام ہوتے ہوتے، کہنی کی چوٹ کے مانند فراموش کر دیا تھا۔

اور اب چونکہ وہ سارا معاملہ رونے والے رو چکے اور ہنسنے والے ہنس چکے

1 نوکری چھوٹ جانے کے بعد میں نے موسیٰ خاں، فدا حسین صاحب، اور خود صدر پاکستان کو اس مفہوم کے خط لکھے تھے کہ اب میں نے یہ بات طے کر لی ہے کہ کبھی سرکاری نوکری نہیں کروں گا البتہ یہ ضرور چاہتا ہوں کہ تمام حجت کے طور پر اس غلط فہمی کو دور کر دوں جو حکومت کے دل میں میری طرف سے پیدا ہو گئی ہے جس کے یہ معنی ہیں کہ میں حکومت سے کسی خیر کا طالب نہیں صرف اتنا چاہتا ہوں کہ معاملے کی صفائی کر کے اپنے کو مزید شر سے محفوظ کر لوں۔ اور آخر میں یہ بھی لکھ دیا تھا کہ میں قید سے لے کر قتل تک اپنے کو آمادہ پاتا ہوں اس لئے اپنی صفائی میں دروغ بیانی سے کام نہیں لوں گا اور جو کچھ میں نے کہا ہے اس کو سچائی کے ساتھ بیان کر دوں گا۔۔۔ ان خطوں کا حشر یہ ہوا کہ فدا حسین صاحب، اور صدر پاکستان نے تو مجھے جواب دینے کی ضرورت ہی نہیں سمجھی البتہ موسیٰ خاں نے جواباً لکھا کہ میں اپنی شکایات لکھ بھیجوں لیکن میں نے اس ننگ کو گوارا نہیں کیا اور ان کو لکھ بھیجا کہ میں اب ان کو کبھی خط نہیں لکھوں گا۔۔۔۔ اور اس کے ساتھ یہ بھی تحریر کر دیا کہ روح کو بلا گویا رہے کہ میں نے ''اتمام حجت'' میں کوتاہی سے کام نہیں لیا ہے۔

اک پرانا واقعہ ہے، خانہ ویرانی مری

کے حدود میں داخل ہو کر گل دستہ طاق نسیاں بن چکا ہے اور اس کے ساتھ ساتھ چونکہ میں اپنے بزرگوں کے ناموس اور اپنی عزت نفس کو شاہد بنا کر، یہ قسم کھا چکا ہوں کہ مر جاؤں گا لیکن اب سرکاری ملازمت کا ارتکاب نہیں کروں گا یعنی ''اب کھائی تو

کھائی، اب کھاؤں تو، رام دہائی'' تو اس منزل میں اگر اب میں اپنی پوزیشن صاف کرنے کا ارادہ کروں گا تو مجھے یقین ہے کہ میرے اس عمل کو حکومت کی خوشامد یا ملازمت کی آرزو نہیں سمجھا جائے گا اور اسی بناء پر میں ببانگ دہل اعلان کر دینا چاہتا ہوں کہ 1946ء کے اواخر میں میرے خلاف ارادی غلط گوئی یا شدید غلط فہمی کی بناء پر جو یہ پروپیگنڈا فرمایا گیا تھا کہ میں پاکستان کا دشمن، یا صدر پاکستان کا مخالف ہوں قطعی طور پر غلط اور بے بنیاد تھا حیرت ہے کہ اس موٹی سی بات کو کوئی نہیں سمجھ سکتا کہ میں پاکستان کا دشمن ہوتا تو اپنی دولت، اپنی عزت، اپنی فراغت، اپنے احباب، اپنے بزرگوں کی ہڈیوں سے منہ موڑ کر اور اپنے ناز بردار جواہر لال نہرو کا دل توڑ کر یہاں آتا کیوں؟

اگر اس موقع پر کوئی زبوں حال صاحب یہ فرمائیں کہ مجھے دولت کی طمع یہاں کھینچ کر لے آئی تھی تو میں ان سے یہ کہوں گا کہ ہندوستان میں میرے واسطے کس چیز کی کمی تھی کہ میں اس کمی کو پورا کرنے یہاں آتا۔۔۔۔۔ اور اس کے ساتھ ساتھ میں ان بزرگ وار سے یہ بھی عرض کروں گا کہ وہ میرے مزاج اور میری زندگی کے حالات سے اگر واقف ہوتے اور ان کو یہ معلوم ہوتا کہ میں ایک لکھ لٹ انسان رہا ہوں، اور لکھ لٹ انسان کبھی لالچی ہو نہیں سکتا تو وہ میرے باب میں اس قدر اوچھی بات کہنے کی کبھی جرأت نہ فرماتے۔۔۔۔

اور بالفرض محال تھوڑی دیر کے واسطے یہ مان بھی لیا جائے کہ مجھ کو طمع کھینچ کر یہاں لائی تھی لیکن جب نقوی اور سکندر مرزا کے زوال کے بعد مجھ پر عرصہ حیات تنگ ہوا کرتا تھا اور میری پریشانیوں کا حال سن کر جب پنڈت جی نے مجھ سے کہلا بھیجا تھا کہ میں پاکستان کو ترک کر کے ہندوستان آ جاؤں تو اس وقت میں نے ہندوستان جانے سے کیوں انکار کر دیا تھا؟

اور اب، جب کہ میں پاکستان میں اپنا مکان بھی بنوا چکا ہوں، اور یہیں کی خاک

میں دفن ہو جانے پر بھی آمادہ ہوں تو کس کے منہ میں اتنے دانت ہیں کہ مجھ کو پاکستان دشمن کہہ کر اپنے خبث نفس یا اپنی حماقت کا اعلان فرما دے۔

پھر کان کھول کر سن لیجئے کہ میں ان خیالات کا اظہار اس لئے نہیں کر رہا ہوں کہ خدانخواستہ حکومت مجھ پر مہربان ہو جائے میں جانتا ہوں کہ ایک میرے سے مزاج، اور ایک میرے سے برہنہ گفتار آدمی پر دنیا کی کوئی حکومت کبھی مہربان ہو ہی نہیں سکتی حکومتیں مہربان ہوتی ہیں بے ضمیروں پر اور میرے پاس ضمیر جیسی خطرناک چیز موجود ہے اور اب جب کہ خدا کے فضل و کرم سے میرے چل چلاؤ کا زمانہ سر پر آ چکا ہے، سوچتا ہوں اب کوئی مہربان ہوا بھی تو کیا اور نامہربان رہا بھی تو کیا۔

راس، اول تو نہ آئے گی، زمانے کی ہوا
راس بھی، دو دن، زمانے کی ہوا آئی تو کیا

میں اس نفرت پرورده و سیاست گزیدہ زمانے میں جب کہ ایک **ملک** دوسرے **ملک** کو اپنے پیٹ میں رکھ لینے پر تلا بیٹھا ہے اور **ملک** تو پھر بھی ایک وسیع تصور ہے جب کہ ایک صوبہ دوسرے صوبے پر چھری تانے کھڑا ہے یہ بات کس سے کہوں کہ میں تمام نوع انسانی کا دوست ہوں اور یہ کہوں بھی تو یقین کون کرے گا، ہر سننے والا میرے اس دعوے کو اپنے خبث نفس کی ترازو میں تول کر مجھ کو جھوٹا سمجھے گا لیکن میں اپنے سچ کو اس خوف سے دبا نہیں سکتا کہ اس کو جھوٹ خیال کیا جائے گا اس لئے میں یہ کہہ دینا چاہتا ہوں جوتی کی نوک سے کوئی مانے یا نہ مانے، کہ اب ایک مدت دراز سے میرے سینے میں ابوالانسان حضرت آدم کا دل دھڑک رہا ہے میں اس دنیا کے ہر قریب دور **ملک** کو بلا استثناء اپنا وطن اور اس کرہ ارض کے ہر نیک و بد انسان کو بلا استثناء اپنا بچہ سمجھتا ہوں۔

جب کسی کے گھر میں جشن ہوتا ہے میں سمجھتا ہوں وہ جشن میرے ہی گھر میں ہو رہا ہے، اور جب کسی گھر سے کوئی جنازہ نکلتا ہے، میں یہ محسوس کرتا ہوں کہ وہ جنازہ

میرے ہی گھر سے نکل رہا ہے میں دیکھ رہا ہوں کہ انفس و آفاق، وحدت کی زنجیر میں جکڑے ہوئے اور ایک ہی قسم کے عناصر ترکیبی کے مختلف مظاہر ہیں جن میں صرف اسم و جسم کا فرق ہے اصلیت اور حقیقت سب کی ایک ہے، اس کائنات میں غیریت کا کہیں کوئی نام ہی نہیں ہے اور عینیت کامل سب کا محاصرہ کئے ہوئے ہے اس عالم وحدت و عینیت میں اگر کسی سے نفرت یا دشمنی کروں گا، تو اس کے سوا اور کوئی معنی ہی نہیں ہو سکتے کہ میں خود اپنی ذات سے نفرت یا دشمنی کا رہا ہوں۔

اے دوست، دل میں، گرد کدورت نہ چاہئے
اچھے تو کیا، برے سے بھی وحشت نہ چاہئے
کہتا ہے کون پھول سے رغبت نہ چاہئے
کانٹے سے بھی مگر تجھے نفرت نہ چاہئے
کانٹے کی رگ میں بھی ہے، لہو، سبزہ زار کا
پالا ہوا ہے وہ بھی نسیم بہار کا!!

☆☆☆☆☆☆

میری موجودہ زندگی

اپنی اس آخری زندگی کا حال کیا بتاؤں۔ جان کی اماں پاؤں تو زبان ہلاؤں۔۔۔ اللہ اللہ یہ آب وہوا کی ناسازگاری، یہ کراچی کی علم بیزاری۔۔۔۔۔ یہ پرانی یادوں کی کٹاریاں یہ نئے ماحول کی آریاں۔۔۔۔۔ یہ مولدو ومنشاء سے دوری، یہ غربت کی رنجوری۔۔۔ سینے میں یہ کھٹکتی پھانسیں یہ حالات کی اکھڑی سانسیں۔۔۔۔ یہ دل پر چلتے بان یہ سر پر کڑکتی کمان۔۔۔۔ یہ اخباروں کی ریشہ دوانیاں یہ حکومت کی سرگرانیاں۔۔۔۔۔ یہ دوستوں کا فقدان، یہ معاشی بحران۔۔۔۔ اور یہ چہرہ زندگی پر گردوغبار کا غازہ اور یہ دوش پر عزت نفس کا جنازہ۔۔۔۔

میری جگہ کوئی دوسرا ہوتا تو، خون تھوک تھوک کر مر چکا ہوتا۔۔۔۔۔ لیکن مجھے دیکھو کہ میں اب بھی جی رہا ہوں اور فقط جی ہی نہیں رہا ہوں آلام حیات پر سکرا بھی رہا ہوں ان دردمندیوں کے بولتے گرداب میں لوہے کا جگر درکار ہے، مجھ اللہ کو میرا جگر لاہے کا ہے میں ایک دقیقے کے واسطے بھی اپنے کو اداس نہیں ہوتے، دنیا غم کو برابر ٹھکراتا رہتا اور:

چوں، غم تو، نہ تواں یافت، مگر دردل شاد
ما بامید غمت خاطر شادے طلبیم

کے سانچے میں اپنی زندگی کو ڈھالے رہتا ہوں میں خارج سے خوشی کی طلب گاری نہیں کرتا خارج میں رکھا ہی کیا ہے میں اپنے باطن میں خوشی بونا، خوشی کی آب یاری کرنا، خوشی اگانا، اور خوشی کی بالیاں کاٹتا رہتا ہوں اور مستی کے عالم میں دنیا کے تمام بے دردوں کو، مخاطب کر کے گنگنا مارتا ہوں کہ:

تھوڑی سی زندگی تھی بہر حال کٹ گئی
تم کو، جو ہم پہ رحم نہ آیا، تو کیا ہوا!

حسب معمول قدیم تاروں کی چھاؤں میں، بلا ناغہ، ہر روز دو یا تین بجے صبح کو

بیدار ہوکر خوب اچھی طرح کلیاں اور غرارے کرتا، ڈنڈ نا کر کٹورا بھر پانی پینا، منہ پر دو چار چھپکے مار کر تولیا سے منہ پوچھتا، اور لکھنے پڑھنے بیٹھ جاتا ہوں میز پر اگر بتی جلتی رہتی ہے اور وہاں پہنچا جاتا ہوں، جس عالم کا، کوئی نام اب تک رکھا ہی نہیں گیا ہے۔

اس وقت کبھی کبھی میرے گرد و پیش ہلکی ہلکی گھنٹیاں سی بجنے لگتیں اور دماغ کے ایوان میں وہ راگنیاں چھڑ جاتی ہیں کہ بقول حضرت اقبال منازاں نغمہ پیدم کہ سرد دوم نہ تواں بعض اوقات طبع میں اس قدر نازکی ہوتی ہے کہ موذن کی آواز گراں گزرتی ہے۔ اور بعض اوقات جب اذان کی آواز سنتا ہوں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تمام کرہ ارض عرش کی جانب پرواز کرتا چلا جا رہا ہے اور تمام ثوابت و سیارز مین کی جانب جھکتے چلے آ رہے ہیں۔

اور جب رات کی گہری سیاہی، سانولے پن میں تبدیل ہونے لگتی ہے تو کتاب و قلم سے دست بردار ہوکر کبھی کبھی انگنائی میں آتا اور آسمان کی طرف نگاہ اٹھا کر یہ سوچنے لگتا ہوں کہ آخر یہ سب کچھ ہے کیا اور جب کچھ جواب نہیں ملتا تو بلبلا بلبلا کر پوچھتا ہوں۔

اے پچھلے پہر کے غم گسارو بولو
اے مجمر گردوں کے شرارو بولو
اس پردہ رنگ و بو میں پوشیدہ ہے کون؟
بولو 1 اے ڈوبتے ستارو، بولو!!

اس کے بعد، اگر ہمت ہوتی ہے تو ٹہلنے کے واسطے نکل جاتا ہوں، یا پھر، مکان ہی میں ورزش کر کے خط بناتا، نہاتا، ناشتہ 2 کرتا، اور پھر لکھنے پڑھنے بیٹھ جاتا ہوں۔۔۔۔ اور یہ سلسلہ سہ پہر کو دو یا تین بجے تک بڑے تسلسل کے ساتھ جاری رہتا ہے پھر نیند آئے یا نہ آئے ایک گھنٹے کے واسطے

---

1 ایک بار یہ بھی ہو چکا ہے کہ تاروں کو دیکھ کر گریبان کے ٹکڑے گرائے اور

ہچکیاں لے لے کر اپنے بے پایاں جہل پر رویا بھی ہوں2 پر تیس برس سے دوپہر کا کھانا ترک کر چکا ہوں۔

لیٹ جاتا ہوں اور اس کے بعد دوبارہ حمام کر کے نوشت 1 وخواند کا سہ بارہ آغاز کر دیتا ہوں اور شام ہوتے ہی منہ ہاتھ دھو کر مغرب کی طرف نگاہ اٹھا کر سوال کرتا ہوں۔

اے دشمن بے پناہ کب ہو گا غروب؟
اے سنگ رہ گناہ کب ہو گا غروب؟
پیاسے بیٹھے ہیں کب سے، رندان کرام
اے شعلہ رو سیاہ، کب ہو گا غروب؟

اور آفتاب غروب ہو جاتا ہے تب:

دل کی جانب، رجوع ہوتا ہوں میں
سر تا بقدم، خضوع ہوتا ہوں میں
جب مہر مبیں، غروب ہو جاتا ہے
پیمانہ بکف، طلوع ہوتا ہوں میں!

اس دشمن بے پناہ کی تجہیز و تکفین کی خوشی میں بڑے چاؤ اور انوکھے رچاؤ کے ساتھ، پیمانہ بھرتا ہوں اور یہ سوچ کر کہ اس کرہ آفات میں آج کا دن بھی محض حسن اتفاق سے بخیریت

---

1 کھوکھلے اقتدار کی چھچھوری آرزو کے ڈسے ہوئے، ان سفید اور دیوانے سیاست دانوں کو جو گلی گلی، ووٹوں کی بھیک مانگتے، کھوئی دولت کی تابرگ نہ سمجھ سکنے والی پیاس کے مارے ہوئے ان جاہل اور بورانے صنعت کاروں یعنی دولت مند ناداروں کو جو قریوں قریوں نوٹوں کے پیچھے دوڑتے پھرتے ہیں اس بات کا مطلق علم نہیں ہے کہ اس دنیا میں دولت کی نہیں دماغ کی فرماں روائی ہے اور سرکار قلم کے

دربار میں سکندر اعظم اور قارون پر شکم کی بس اس کے متوالوں کو اس بات کا پتا نہیں ہے کہ نوشت وخواند ایک ایسی بے نظیر عیاشی بھی ہے کہ رجہ اندر کا اکھاڑ الفظ یا نیا خیال ہاتھ آ جاتا ہے تو ان کے جشن ہائے فتح مندی کے زمزمے بازار شور بن کر رہ جاتے ہیں اور اور اسرار حیات و کائنات کی تحقیق ایک ایسی بے لوث و گراں قدر عبادت ہے کہ کرو روں حج اکبر اس کا طواف کرتے رہتے ہیں اور جس وقت کہ اس کے نیم دقیقے کو ہزار سالہ زہد پر لادا جاتا ہے تو اس کی ہڈیاں بولنے لگتی ہیں، اور اپل میں وہ اس اونٹ کے مانند زمین پر اپنا سینہ رکھ دیتا ہے جس کی کمر نا قابل برداشت وزن سے دب کر چٹ سے ٹوٹ کر رہ جاتی ہے۔

گزر گیا، یہ رباعی پڑھ کر

جو سامنے آیا تھا، وہ عفریت گیا
میں ہارنے والا تھا مگر جیت گیا
اس مرد فگن، صبر شکن دنیا میں
صد شکر کہ دن آج کا بھی بیت گیا

بھرے پیمانے کو نعرہ ''بسم اللہ'' اور ''بیا دفلاں، بنت فلاں'' کے ساتھ لبوں سے لگا لیتا اور ''الحمدللہ'' کہہ کر پیمانے کو سامنے کی گھڑی کے قریب رکھ کر شفق پر نگاہیں جماتا حال سے منقطع اور مستقبل سے بے پروا ہو کر ماضی کے اتھاہ سمندر میں ڈوب جاتا ہوں۔

ماضی کے سوا میرے پاس اب باقی ہی کیا رہ گیا ہے۔۔۔۔ پہلے یاوش بخیر بوتل کھلتے ہی طبلے پر تھاپ پڑتی تھی، نازنینوں کی پائلیں جھنک اٹھتی تھیں اور یاران سرمست کے لطیفوں سے محفل گونجنے لگتی تھی۔۔۔۔ اب طبلے کی تھاپ کی جگہ مہمات سے اٹھتی بھاپ ہے، پائلوں کی جھنک کے عوض سینے میں بربادی کی کھٹک ہے اور یاروں کے لطیفوں کے بدلے حالات کے کشیفے ہیں۔

نہ محرمے، نہ شفیقے، نہ ہمدمے وادم
حدیث دل بکہ گریم، عجب غمے دارم

میں زیادہ سے زیادہ بیس پچیس اور کم سے کم پندرہ منٹ کے وقفے سے صرف چار پیگ پیتا ہوں اور جب تین پیگ ختم کر کے چوتھا پیگ بنانے لگتا ہوں تو ام اشعراء پوچھتی ہیں ''کوتھا'' تو میں ''چوتھا'' کہہ کر ہنسنے لگتا ہوں اور جب چوتھا پیگ آدھا ختم ہو جاتا ہے تو کھانا طلب کر لیتا ہوں اور کھانا کھا کر کلیوں اور غراروں سے فارغ ہو کر تکیے پر سر رکھ دیتا ہوں اور پھر جیسا کہ اوپر کہہ چکا ہوں حسب معمول تاروں کی چھاؤں میں بیدار ہو کر لکھنے پڑھنے لگتا ہوں

پہلے شراب تھی مایہ نشاط و آب و حیات اور آج ہے خواب نوشیں و اروئے بے ہوشی ہائے، کہاں سے کہاں آ گیا میرا کاروان حیات!!

مجھ کو آخر یہ زبردستی جلایا کیوں جا رہا ہے، کیا میں ہی ایک رہ گیا ہوں مشق ستم کے واسطے؟ یاں تو جب چار دن کی چاندنی اور پھر اندھیرا پاکھ ''ماضی کے سسکیاں لیتے سمندر میں ڈوب کر مے کشی کا نہیں تے کشی'' کا آغاز کرتا ہوں تو۔۔۔۔۔ سلونی فضا، سینما کے پردوں میں تبدیل ہو جاتی ہے ہر آن پردے اٹھنے اور گرنے لگتے ہیں اور ہر پردے کے اٹھتے وقت گھنٹیاں سی بجتیں، اور منادی کی آواز گونجنے لگتی ہے کہ اے جوش دیکھ۔۔۔۔ یہ تیرا ملیح آباد ہے جہاں تو شہزادوں کی طرح رہتا ہے یہ تیرے محل کے سقف و بام ہیں یہ وہ انگنائی ہے جہاں تو کھیلا کرتا تھا یہ تیری وہ کھلائی ہے جس نے برکھارت میں کلکتے والا ساون گایا اور گھر بھر کو رلایا تھا اور یہ تیرے ماں باپ ہیں میری ماں، میری طرف، ڈبڈبائی آنکھوں سے دیکھ کر دور سے میری بلائیں لیتیں اور سر پیٹنے لگتی ہیں اور میرے باپ بڑی حسرت کے ساتھ میری طرف آنکھیں اٹھاتے اور ''ہائے میرا بیٹا'' کہہ کر بے ہوش ہو جاتے ہیں۔۔۔۔۔۔ اور پردہ گر جاتا ہے۔

اب دوسرا پردہ اٹھتا ہے اور منادی کہتا ہے۔۔۔۔ اے جوش دیکھ یہ تیرا سب سے

پہلا شہر درس گاہ سیتاپور ہے یہ تیرا گنبد غنا اور کعبہ تہذیب لکھنو ہے۔۔۔۔ یہ تیرا آگرہ ہے۔۔۔۔ تیرا حیدر آباد دکن ہے یہ تیری بمبئی ہے اور یہ تیری دہلی ہے میں ان کی گلیوں میں گھومنے لگتا ہوں بہت سے جانے پہچانے لوگ مجھے سلام کرتے ہیں اور جب ان سے ان کے نام پوچھتا ہوں تو پردہ گر جاتا ہے۔

اب تیسرا پردہ اٹھتا ہے، اور منادی کہتا ہے۔۔۔۔۔ اے جوش دیکھ۔۔۔۔ یہ تیرے بچھڑے اور زیر خاک سوئے ہوئے احباب یعنی تیرے مورخان شباب ہیں تو انہیں پہچانتا ہے؟'' ہاں پہچانتا ہوں۔۔۔۔ ان کو نہیں تو اور کسے پہچانوں گا''

یہ صف اولیں میں کھڑے ہوئے ہیں، ابرار مختار، مانی، صاحب عالم، مجاز اور مخمور تم سب تو ہمیشہ چہچہاتے رہتے تھے ارے اب بولتے کیوں نہیں؟ تم مجھ کو دیکھ کر مسکرا رہے ہو ہائے تمہارا تبسم تو آنسوؤں میں ڈوبا ہوا ہے ارے کچھ تو بولو سب رو رہے ہیں اور مجاز، اپنا وہی پرانا گیت بریلی کے بجار میں جھمکا گراری سنا رہا ہے میری ہچکیاں بندھ گئیں اور پردہ گر گیا۔

اب چوتھا پردہ جو چھم چھم کی آوازوں کے ساتھ اٹھ رہا ہے منادی آواز دے رہا ہے دیکھ اے جوش۔۔۔۔ یہ تیری جوانی کے خیمہ رقص و رنگ کی گانے اور ناچنے والیاں ہیں، اور ایک فتنہ روزگار بڑی غمگیں آواز میں گا رہی ہے:

لذت سے نہیں خالی، جانوں کا کھپا جانا
کب، خضر و مسیحا نے، مرنے کا مزا جانا
اے فتنہ محشر، ہم سوتے ہی نہ رہ جائیں
اس راہ سے گزرے تو، ہم کو بھی جگا جانا

سارنگی سے نوحوں کی آواز نکل رہی ہے اور پردہ گر جاتا ہے۔

اب پانچواں پردہ اٹھا ہے اور کہنے والا کہہ رہا ہے۔۔۔۔ دل تھام کر دیکھ اے جوش یہ تیرے محبوب ہیں جن کے مکھڑوں کی جوت سے، تیری نبضیں چلا کرتی تھیں

جن کی پل بھر کی جدائی بھی تجھ سے برداشت نہیں ہوتی تھی اور جب روزگار تیرے اور ان کے مابین فاصلہ پیدا کر دیتا تھا تو نیند، تیرے پپوٹوں پر صبح تک پر بھی نہیں مارتی تھی اور تیرے تکیے روتے روتے بھیگ جاتے۔

اللہ اللہ جگر جگر مکھڑے فضا پر دمک رہے ہیں سب کی انکھڑیوں میں آنسو بھرے ہوئے ہیں کسی کسی نے اپنی زلفیں سوگ وارانہ انداز سے بکھرا دی ہیں اور کسی کسی نے اپنا گریبان چاک کر ڈالا ہے اور فضا پر ''ہائے اللہ ہائے اللہ کی آوازیں تیرنے لگتی ہیں کہ عین اس وقت یکا یک پشت کی جانب سے ایک آواز آتی ہے ''سنو 1'' میں سمجھ جاتا ہوں کہ یہ آواز ہے میری دن بھر کی اکتائی ہوئی بیوی کی۔۔۔اور ''سنو'' کے بعد وہ کہنے لگتی ہیں کہ آج نوکر نے حساب میں اتنے پیسے مار لئے'' فریج میں پانچ انڈے تھے اب صرف تین باقی ہیں سعیدہ کے منجھلے۔

---

1 بات یہ ہے کہ میری بیوی میرے پڑھنے لکھنے کا بہت احترام کرتی ہیں، اور ہر گز نہیں چاہتیں کہ وہ میری مشغولیت میں خلل انداز ہوں اسی لئے صبح سے وہ گھر کے دھندوں میں لگ جاتی ہیں لیکن فرصت پا کر جب وہ تخت پر بیٹھتیں اور مجھ سے گودین و دنیا سے بے پرواپاتی ہیں تو اکتا کر نیچے اتر جاتی ہیں اور سعیدہ سے کہتی ہیں کہ بٹیا میں کس سے بات کروں وہ تو پچھلے پہر سے لے کر شام تک سر جھکائے لکھتے رہتے ہیں اور میں سارا سارا دن عقا تو بنی بیٹھی رہتی ہوں گھنٹے دو گھنٹے کے بعد جب اوپر آتی ہیں مجھ کو اسی عالم میں پاتی ہیں اور کبھی کبھی مجھ پر ترس کھا کر کہتی ہیں ارے اتنی محنت نہ کرو حقہ نہ کرے بیمار پڑ جاؤ گے اور میں ان سے مسکرا کر کہتا ہوں کہ بیوی تم کو معلوم نہیں ایک بالشت بھر کا فرشتہ چھوٹا سا پستول ہاتھ میں لئے میری میز کے اوپر کھڑا یہ کہہ رہا ہے کہ اگر قلم ہاتھ سے رکھ دیا تو گولی مار دوں گا اور

بیٹے نے آج بڑی بدتمیزی کی میں نے اسے تھپڑ مار دیا اور ہاں میں نے غزالہ سے کہا تھا اوپر آ کر حساب لکھ دینا وہ ابھی تک نہیں آئی تم اسے بلا کر ڈانٹ دو۔۔۔بیوی

کی یہ باتیں سن کر میری جان نکل جاتی ہے میرے سینما ہال سے دھواں اٹھنے لگتا ہے اور میرے سارے پنچھی بھرا مار کر اڑ جاتے ہیں۔

لیکن میں نہیں چاہتا کہ بیوی اس بھید کو پا جائیں کہ میں ان کی باتوں سے گھبرا رہا ہوں اس لئے ان کی باتوں سے میرے چہرے کا رنگ جب اڑنے پر تل جاتا ہے تو میں جھپا مار کر اسے اپنے چہرے پر پھر جما لیتا اور مصنوعی طور پر مسکرانے لگتا ہوں۔۔۔ لیکن بعض اوقات یہ بھی ہوتا ہے کہ ان کے آتے ہی جب میں ایڑ لگا کر اپنے چہرے کو شگفتگی کی جانب موڑنا چاہتا ہوں تو میرا چہرہ شریر گھوڑے کی طرح دونوں پاؤں پر کھڑا ہو کر ہنہنانے لگتا ہے میرے دونوں گالوں کی ہڈیاں ابھر آتی ہیں منہ چوڑا ہو کر توبڑے کی شکل اختیار کر لیتا ہے اور میری ناک میرے قابو سے نکل کر ڈیڑھ بالشت لمبی ہو جاتی ہے اور ایسا لگنے لگتا ہے کہ یہ میں نہیں ہوں کا کا تو ابیٹھا ہوا ہے۔

وہ تخت پر گڑ تڑا کر لیٹ جاتی ہیں کبھی کبھی تو ان کی اس تنہائی پر ترس کھا کر میں ان کے پاس جا کر بیٹھ جاتا ہوں لیکن زیادہ سے زیادہ دس پانچ منٹ کے بعد پھر لکھنے لگتا ہوں اور جب غروب کے بعد میں شغل شروع کرتا ہوں تو وہ یہ سمجھ کر کہ اس وقت میں خالی بیٹھا ہوا ہوں میرے پاس آ کر بیٹھ جاتیں اور گھر کی باتیں کرنے لگتی ہیں بیوی بے چاری کو کیا معلوم کہ جس وقت وہ یہ سمجھتی ہیں کہ میں خالی ہوں اس وقت تو میں پرانی یادوں سے لبالب بھرا ہوا بیٹھا ہوتا ہوں اور ایسا بھرا ہوا کہ سانس لینے تک کی گنجائش نہیں پاتا ہائے میری بیوی کہ سہاگن ہونے کے باوجود ان پر بیواؤں کی سی تنہائی چھائی رہتی ہے میرا دل کڑھتا رہتا ہے مگر کیا کروں کام بہت ہے اور عمر کم رہ گئی ہے چاہتا ہوں کہ میرے سینے میں جو کچھ ہے اسے گھبرا گھبرا کر کاغذ کے سپرد کر دوں۔

☆☆

میرا دین

میر کے دین و مذہب کو کیا پوچھو ہو تم ان نے تو
قشقہ کھینچا دیر میں بیٹھا کب کا ترک اسلام کیا

اک جری انسان کے مانند، میں با آواز بلند یہ اعلان کرتا ہوں جو ادھر دیکھ رہا ہے وہ ادھر مڑ جائے جو دور ہے وہ قریب آ جائے جس نے اب تک نہ سنا ہو وہ کان کھول کر سن لے جو اب تک مجھ کو مومن سمجھ رہا ہے وہ اپنے حسن ظن سے دست بردار ہو جائے اور جس کے نزدیک میں خدا کا منکر، یعنی لفظ خدا کے لامحدود معنی میں منکر ہوں وہ بھی اپنے سوظن سے توبہ کر لے کہ میرا دین خیابان ذہن انسانی کی تمنائے رنگ و بو، حصول علم و فقدان جہل کی ارزو اور محرک اولیں کی مسلسل جستجو کے علاوہ اور کچھ بھی نہیں ہے اور ہر طرف سے منہ موڑ کر میں کافر باللہ و مومن بالانسان تو ائے کائنات سے گرم پیکار، جنس آگاہی کے خریدار ذرات صید و انجم شکار نوع بشر کی طرف نگاہ اٹھا کر یہ کہہ رہا ہوں کہ من قبلہ راست کردم بر طرف کج کلا ہے۔

میں بھی ایک زمانے میں عقل بیزار و عقائد پرستار میری دنیا میں بھی روایت کو درایت پر ترجیح حاصل تھی تیغ روزگار کے روبرو میرے ہاتھ میں بھی ''مصلحت الٰہی'' اور ہر چہ از دوست می رسد، نیکوست کی مضبوط سپر تھی میرے گرد و پیش بھی بہت سی مناجاتیں بہت سی ڈھارسیں بہت سی تشفیاں بہت سی تسلیاں بہت سی امیدیں بہت سی دعائیں بہت سی فردا کی کام گاڑیاں اور بہت سی نجات کی امیدواریاں تھیں اور میرے مشام تک بھی حوران مقصورات کے لب ہائے رنگیں کی مہکیں آیا کرتی تھیں۔

لیکن اب میرے پاس کچھ بھی نہیں رہا ہے میرے دماغ نے مجھ کو لوٹ لیا ہے اور میں اب بیکسی میں تو ادھر ہوں کہ جدھر کچھ بھی نہیں کا مصداق بن کر رہ گیا ہوں اور بے مروت عقل میرے ازرکدہ تصورات کے تمام خوبصورت مجسموں کو پاش پاش کر کے

میرے سامنے کھڑی ہنس رہی ہے۔

ایک زمانہ دار تک عقل کو آلہ ابلیس خیال کر کے میں اس سے لڑتا اور اس کا راستہ روکتا رہا لیکن وہ میرے عقائد پر سے یوں گذر گئی جس طرح ڈاک گاڑی، ان پتھروں کو پیستی گزر جاتی ہے جن کو بچے پٹڑی پر رکھ دیا کرتے ہیں

اے ایمان والو، تمہارے پاس اللہ کا دیا سب کچھ ہے اور میرا گھر بھائیں بھائیں کر رہا ہے مجھ کو نفرت کی نگاہ سے نہ دیکھو یہ موقع تو ہے ترس کھانے کا۔

اور اے میرے منکر احباب، تم بھی مجھ پر طنز نہ کرو، اور مجھ سے یہ نہ کہو کہ اے نافہم جو مل تو کیسا عجیب آدمی ہے کہ منقولات سے نجات پانے اور معقولات کے قریب آ جانے پر افسوس کر رہا ہے میں تمہارے طنز کی معقولیت کو تسلیم کرتا ہوں بے شک میں عجیب انسان ہوں لیکن اس بات کو نہ بھولو کہ میں ایشیا کا باشندہ ہوں، وہ ایشیا جو روایات، اقوال اور اوہام کا پائے تخت ہے وہ ایشیا جہاں لاکھوں سال سے بھوتوں، چڑیلوں، شہید مردوں، جنوں اور فرشتوں کی کہانیوں کی چھاؤں میں بچوں کو سلایا جا رہا ہے جہاں بڑے بڑے صوفی اور شاعر حکمت پر جنون، اور عقل پر عشق کو ترجیح دیتے چلے آ رہے ہیں جہاں روایت کی قربان گاہ پر ورایت کو چڑھایا جا رہا ہے جہاں ''دعائے صبح و آہ شب'' کو ''کلید گنج مقصود'' ٹھہرا دیا گیا ہے جہاں ''دو دو چار'' کے سر کو ''دو و پانچ کے آستانہ'' پر جھکا دیا گیا ہے جہاں ''الف لیلہ'' ''اندر سبھا'' ''چہار درویش'' اور ''طلسم ہوشربا'' کے عقلیں چگ لینے والے سائے میں ذہنوں کو پالا پوسا جا رہا ہے اور جہاں براہین قاطع کی گردنوں پر صدیوں سے کشف و کرامات کی چھریاں چلائی جا رہی ہیں اس ایشیا میں کس خالص منکر کا پیدا ہو جانا تقریباً ایک محال امر ہے اس لئے اگر تم یہ دیکھو کہ میں اپنے دماغ کی آبادی، اور دل کی بربادی پر کبھی کبھی آزردہ سا نظر آتا ہوں تو مجھے قابل معافی سمجھو اس لئے کہ وہ میں شور سنبل بر نہ آرد۔

اور اے منکر دوستو، اظہار حقیقت میں شرمانا کیسا، میں تم سے اپنے دل کا یہ چور بھی

بتا دینا چاہتا ہوں کہ جب کبھی آباء و اجداد مجھ کو پکڑ لیتے ہیں تو میرا جی یہ چاہنے لگتا ہے کہ انہوں نے جو مافوق الفطرت باتیں مجھ سے کہی تھیں اللہ کرے وہ ساری کی ساری سچ نکلیں مرنے کے بعد میں دوبارہ زندہ ہو جاؤں اپنے بزرگوں اور دوستوں سے ملوں شافع محشر سے اپنے سارے گناہ معاف کرا کے جنت میں جاؤں حوض کوثر کے کنارے جام پر جام لنڈھاؤں اور حور و غلماں کو بھینچ بھینچ کر گلے لگاؤں لیکن اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی سن لیجئے کہ ان کمزور لمحوں کے روزن سے جب میری عقل جھانک کر مجھ کو دیکھ لیتی ہے تو میرے مرجھائے گالوں پر تڑاق سے تھپڑ مار کر مجھ سے کہتی ہے کہ اے ستر بہتر کے بڈھے بول تو نابالغ کب تک رہے گا تیرے دودھ کے دانت کب ٹوٹیں گے؟ اور اے کھوسٹ، تیرے دل میں جو بچہ بیٹھا فیل کر رہا ہے اس کی مسیں کب تک نہیں بھیگیں گی؟

اس جملہ معترضہ کے بعد اپنے موضوع کی جانب مڑ کر یہ عرض کر دینا بھی چاہتا ہوں کہ آج بھی میرے دل میں دنیا کے تمام بانیان مذاہب کا بے حد احترام ہے اور خصوصیت کے ساتھ قوت وحیات کے شاہکار حضرت محمد عربی حضرت علیؑ اور حضرت حسینؑ کا شیدائی اور آبائی عقائد 1 سے آزاد ہو جانے کے باوجود میں ان متذکرہ بالا تینوں مقتدر ہستیوں کا دل سے پرستار ہوں۔

آنحضرتؐ کے بارے میں اکثر یہ سوچتا رہتا ہوں کہ عرب کی سی جہالت کی راج دھانی میں اور وہ بھی آج سے کچھ اوپر چودہ سو برس پیش تر ان کا پیدا ہو جانا اور کسی ایک متنفس کی شاگردی کئے بغیر جہاں استاد کا مرتبہ حاصل کر لینا روزگار کا ایک ایسا معجزہ عظیم ہے کہ انسانی تاریخ انگشت حیرت کو اپنے دانتوں کے نیچے سے آج کے دن تک نکال نہیں سکی ہے وہ پیدائشی عالم اور پیدائشی مفکر اور نظری نہیں عملی مفکر تھے۔

---

1 اس دھرتی ماتا پر کون ایسا مائی کا لال اور کون ایسا سورما ہے اور کس کے منہ میں اتنے دانت ہیں کہ وہ سینہ ٹھونک کر یہ دعویٰ کر سکے کہ میں آبائی عقائد اور ان عقائد کے

پیدا کردہ مزاجی قوام سے کلیتہ آزاد ہو چکا ہوں یہ اور بات ہے کہ مجھ کو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ میں جبہ و جوہ آزاد ہو چکا ہوں لیکن کون کہہ سکتا ہے کہ میرا یہ احساس خودستائی ہے یا خودفریبی دانش مندی ہے کہ حماقت۔

انہوں نے جاہلوں کے درمیان حقائق کو آشکار کر کے سقراط کے مانند، زہر کا پیالہ نہیں پیا اور حقائق کو دل نشیں لباس پہنا کر چشمہ حیواں پر قبضہ کر لیا۔

سقراط نے اپنی قوم کی ذہنی سطح سے بلند ہو کر زبان کھولی، اس کو ہمیشہ کے واسطے خاموش کر دیا گیا محمدؐ نے اپنی قوم کی ذہنی سطح پر قدم رکھ کر بات کی اور وہ بات، اذان بن کر اس دنیا میں اب تک گونج رہی ہے محمدؐ کو ایسی حیرت ناک بصیرت حاصل تھی کہ وہ اپنے گرد و پیش کے لوگوں کی لرزش مژگاں سے ان کے دلوں کی پرتیں شمار کر لیتے اور ان کے انفاس کی درازی و کوتاہی پر نظر جما کر ان کے جذبات و خیالات کا عرض و طول ناپ لیا کرتے تھے۔

وہ ایک طرف تو اپنی قوم کے تمام مکروہات و مرغوبات کے زبردست نباض تھے اور دوسری طرف وہ نوع انسانی کی اس کمزوری کو بھی پا گئے تھے کہ یہ سود و زیاں کی زنجیروں میں جکڑا ہوا خود پرست حیوان صرف تخویف و تحریص کی وساطت سے راہ راست پر لایا جا سکتا ہے۔

اور اسی لئے وہ دوزخ کے انگاروں اور حوروں کے رخساروں کو دمکا کر اپنی قوم کو راہ راست پر لے آئے انہوں نے ایک مصلح عملی حکیم کے مانند، یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ اپنی تقریروں میں ایسی فلسفیانہ موشگافی، ایسی منقطی پردہ دری اور ایسی حقائق کشا بر ہنہ گفتاری سے کام نہیں لیں گے، جس سے ایک صحرانشیں قوم کی فعالیت میں فرق پڑ سکتا ہے۔

اور اسی دانش مندانہ فیصلے کی بناء پر انہوں نے کاروان خیال کی نقل و حرکت کے واسطے ایک وجدانی شاہ راہ تراش لی اور اس کے دونوں طرف روایات، کنایات،

اشارات، تمثیلات اور تشبیہات کے درخت اس قدر پیوستگی کے ساتھ نصب فرما دیئے کہ منطق کی شعلہ بار دھوپ اس شاہ راہ کے مسافروں کو جھلسا نہ سکے اور تمام قافلے بے روک ٹوک چلتے رہیں جس جا نتیجہ یہ نکلا کہ ان کے کلمات کی کھنک، ان کے لہجے کی لچک، اور ان کے پر اسرار الفاظ کی دھنک کے نیچے اس شاہراہ سے لاکھوں قافلے اب تک گزرتے نظر آ رہے ہیں اور محمدؐ کو دل کروڑوں انسانوں کے سینوں میں آج بھی دھڑک رہا ہے۔

اور پھر، دنیا کی سب سے زیادہ انوکھی بات یہ ہے کہ موت کے بھیانک میدان میں حوروں کے خیمے نصب کر کے انہوں نے عربوں کے خون میں وہ حرارت پیدا کر دی کہ مٹھی بھر آدمیوں نے دیکھتے ہی دیکھتے آدھی دنیا کو مسخر کر کے اپنی خاک نشیں کملی والے تاج دار کے قدموں پر لا کر ڈال دیا۔

اے غلاموں کو مقام فرزندی تک لانے والے اے قاتلوں کو مسیحائی کے گر سکھانے والے اے انگاروں میں پھول کھلانے والے اے خوف و حزن کو علامت کفر بتانے والے اور اے رگ ہائے ذرات میں نظام شمسی کا لہو دوڑانے والے

اے وحشیوں کو بردباری اے زلزلوں کو تمکین شعاری اور اے عزائم انسانی کو آفاق شکاری عطا فرمانے والے اے لاوارثوں کے وارث، اے بے آسراؤں کے سہارے، اے یتیموں کے باپ، اور اے بیواؤں کے سہاگ۔۔۔۔۔۔۔۔اے حروف ناشناس معلم، اے سفر نہ کردہ سیاح، اے فاقہ کش رزاق،۔۔۔۔۔اے خلق کی برہان عظیم اے امی حکیم۔۔۔۔۔اے خدیو اقلیم جبل المتین اے اولاد آدم کی فتح مبین اے نامود ما و طین اور رحمت العالمین! روح کائنات کا سجدہ تعظیمی قبول فرما۔

محمدؐ کے بعد اب ان کے نازش روزگار بھائی علی کی طرف، اپنی ٹوپی کو سنبھال کر نگاہ اٹھایئے۔

ہزاروں ماہ و سال کے مسلسل تجربوں کے بعد یہ کلیہ قائم کیا گیا ہے کہ علم اور

شجاعت، یہ دو ایسے اضداد ہیں جو کبھی ایک ذات میں جمع نہیں ہو سکتے جس ہاتھ میں تلوار ہوتی ہے وہ قلم و کاپنی انگلیوں کی گرفت میں نہیں لا سکتا، اور جس ہاتھ میں قلم ہوتا ہے وہ تلوار نہیں اٹھا سکتا۔ لیکن انسانی تاریخ میں علی کا ہاتھ وہ تنہا جامع اضداد ہاتھ تھا جو تلوار اور قلم دونوں کو مساوی روانی کے ساتھ چلا سکتا تھا۔

وہ ادیب شاعر اور مفکر تھے اور اسی کے دوش بدوش، عدیم النظیر سپاہی بھی وہ صفحہ قرطاس پر مجسم کلک گوہر بار اور میدان کارزار میں سراپا شمشیر آب دار تھے۔

وہ اس کی پروا نہیں کرتے تھے کہ موت ان پر گرے یا وہ موت پر ان دونوں کو وہ مساوی طور پر محبوب سمجھتے تھے اس لئے کہ ان کی نگاہوں نے موت کی پیشانی پر حیات ابدی کا جھومر دیکھ لیا تھا اس کے علاوہ ان کو ایک ایسی جواں بختی و برکت بھی حاصل تھی جس سے اس دور کا کوئی انسان بہرہ ور نہیں ہوا تھا اور جس نے ان کو اپنے تمام معاصرین پر وہ فوقیت بخش دی تھی، جو آفتاب کو ذرات پر حاصل ہے اور وہ فوقیت یہ تھی کہ انہوں نے جو چہرہ سب سے پہلے دیکھنے کی طرح، دیکھا وہ محمدؐ کا چہرہ تھا اور انہوں نے جو آواز سب سے پہلے سننے کی طرح سنی وہ محمدؐ کی آواز تھی۔

محمدؐ نے ان کو گودوں میں پالا اپنی شخصیت کے سانچے میں ڈھالا اپنے سائے میں پروان چڑھایا اور وہ ان کے وجود میں اس طرح جذب ہو گئے کہ علی کو اپنے انفاس سے بوئے محمدؐ آنے لگی جس کا یہ نتیجہ نکلا کہ علی حق پر اس مضبوطی سے قائم ہو گئے کہ وہ حق کا جسم، حق کی جان، حق کا اعلان، اور حق کی آواز بن گئے اور یہاں تک کہ حق کو علی سے اور علی کو حق سے پہچانا جاتا تھا اور چونکہ بہر آن و بہر نفس حق پر قائم رہنا ایک بہت بڑا خطرناک مرحلہ ہے اس لئے ان کی زندگی کبھی پنپ نہیں سکی۔۔۔ دنیا والے ان کی شدت حق پرستی کو برداشت نہیں کر سکے اور تو اور خود ان کے حقیقی بھائی ان کا ساتھ چھوڑ کر اس ایوان میں چلے گئے جہاں اسلام کے سر پر شاہی تاج رکھ دینے کے منصوبے تیار کئے جا رہے تھے اور جہاں شہد میں اس نیت سے زہر ملایا جا رہا تھا کہ

ارباب حق کو موت کے گھاٹ اتار کر باطل کو تخت شاہی پر بٹھا دیا جائے۔

علی کو حق پرستی کی تاب نہ لا کر، مسلمانوں کو ایک جماعت کثیر نے ان سے منہ پھیر لیا تھا اور یہاں تک کہ انہیں آخر کار یہ کہنا پڑا تھا کہ دنیا نے مجھ کو ذلیل کر دیا، ذلیل کر دیا ذلیل کر دیا اور اس قدر کہ میرا اور معاویہ کا تقائل کیا جانے لگا۔

علی کی زندگی اس کرہ ارض کے تمام عظیم انسانوں کے مانند محرومی و ناکامی کے سوا انہیں کوئی اور چیز نہیں دے سکی لیکن جب انہیں قتل کر دیا گیا تو ان کی موت نے ان کی قبر پر وہ چراغ عظمت جلا دیا جس سے ان کی زندگی کو محروم کر دیا گیا تھا۔

ان کا کام کا رحریف اپنے تمام کروفر کے ساتھ وقت کے سمندر میں ڈوب چکے ہیں لیکن ان کی زندگی کی تمام ناکامیوں کے باوجود ان کا نام تاریخ انسانیت کی پیشانی پر آج تک دمک رہا ہے اور وہی لوگ جنہوں نے ان کی طرف سے منہ موڑ لئے تھے ان کی موت کے بعد جب کسی بلا میں گرفتار ہو جاتے ہیں تو ''یا علی'' کے نعرے لگانے لگتے ہیں

اے علی، شرافت انسانی، تیرے ان دو اخلاقی معجزوں کو قیامت تک فراموش نہیں کر سکے گی کہ جب تیرے حریف نے تیرے منہ پر تھوک دیا تھا تو نے اس کی جاں بخشی فرما دی تھی اور موت کے وقت جب تیرے سامنے شربت کا پیالہ پیش کیا گیا تھا تو نے یہ کہا تھا کہ جب تک میرے قاتل کو شربت نہیں پلایا جائے گا، میں نہیں پیوں گا۔

اے علی، اے میدان جنگ کے سورما جز خواں اے منبر امن کے شیریں سخن خطیب اے ایوان عدل کے دیدہ ور قاضی اے کشور سیف و قلم کے خدیو صحیح کلاہ اے نان جویں کی بے پناہ طاقت کے مظہر اے زندگی کے معتوب اے موت کے محبوب۔۔۔۔ اے علت العلل کے باب میں ''لاغفور'' ''لارحمٰن'' اور ''لاقھار'' اور ''الاھو'' کی سی معنی خیز و خیال انگیز بات کہہ کر خاموش ہو جانے والے منکر۔۔۔۔ سیف و قلم کا مجرا قبول کر!

اب دل تھام کر نگاہ اٹھایئے علی کے سورما بیٹے اور محمدؐ کے لہولہان نواسے حسین کی جانب جو گریاں تاریخ کے سینے کا ناسور اور گزراں وقت کی پیشانی کا نور ہے۔

وہ حسین جس کے نظام انفاس کی اطمینان آمیز ہمواری کی زد پر میدان کربلا کی باد سموم کا دم ٹوٹ گیا تھا۔۔۔۔جس کے لبوں کی خشکی دیکھ کر فرات کی موجیں آب آب ہو کر رہ گئی تھیں اور جس کے چہرے کی شادابی کو دیکھ کر کربلا کے تپتے سورج کے ماتھے سے پسینے کی بوندیں ٹپکنے لگی تھیں۔

وہ حسین۔۔۔۔۔جس نے اس ارادے سے کہ ایوان حق کے چراغاں پر کوئی آنچ نہ آسکے اپنے گھر کے تمام چراغوں کو بجھا دیا تھا۔۔۔۔اور ناموس انسانی کو بچانے کی خاطر جس نے فولاد کو پگھلا دینے والے عزم اور زلزلوں کی سانس اکھاڑ دینے والے ثبات کے ساتھ موت سے ٹکر لی تھی اور ایسی ٹکر کہ موت کی پیشانی سے لہو کا تو ارہ جاری ہو گیا تھا حسین ناتواں تھے یزید توانا تھا قانون قدرت کے مطابق ہونا یہ چاہئے تھا کہ یزید، حسین کو شکست دے کر حسینیت کا چراغ گل کر دیتا۔

لیکن ہوا یہ کہ قانون قدرت کے علی الرغم، حسین کی ناتوانی نے یزید کی توانائی کا گلا گھونٹ کر رکھ دیا۔۔۔۔اور اپنی مقتولیت کی ایک ضرب سے قاتل کو موت کے گھاٹ اتار دیا وہ موت جس کے صرف تصور سے بڑے بڑے سادنتوں کی پنڈلیاں کانپنے لگتی ہیں وہ موت منہ کھولے جب حسین کے سامنے آئی تو حسین اس کو دیکھ کر ایسی حقارت کے ساتھ مسکرائے کہ خود موت کی نبضیں ساقط ہو کر رہ گئیں۔

سب سے زیادہ حیرت اس بات پر ہے کہ اس وقت بھی جب کہ تیروں کا موسلا دھار مینھ برس رہا تھا اور حسین اپنے رفیقوں اور جگر گوشوں کی لاشیں، میدان سے اٹھا اٹھا کر، بار بار خیمے کی طرف جا رہے تھے اس سے زیادہ حیرت یہ ہے کہ جب کہ ان کے تمام انصار و اقرباء موت کی نیند سو چکے تھے اور ان کا قتل ایک یقینی امر بن چکا تھا عین اس نازک ترین، اور مہلک لمحہ میں بھی ان کے حواس بجا تھے اور ایک بہادر سپاہی

کا حوصلہ مندانہ تبسم ان کے لبوں پر کھیل رہا تھا۔۔۔اور یہ دیکھ کر کہ ہیبت باطل سے حق کا چہرہ سفید ہو چلا ہے وہ اس پر سرخی دوڑانے کے لئے بڑے اطمینان کے ساتھ اپنا خون روانہ کر رہے تھے صرف یہی نہیں کہ اس یقینی ہلاکت کے موقع پر ان کے حواس بجا تھے بلکہ تاریخ انسانی کی سب سے بڑی قربانی دے چکنے کے بعد بھی ان کے چہرے پر اس فخر و مباہات کی ایک ایسی معمولی سی دھاری بھی رونما نہیں ہوئی تھی اور ان کی زبان سے ایک ایسا آدھا لفظ بھی ادا نہیں ہوا تھا جس سے پتا چلتا کہ وہ یہ کہہ رہے ہیں کہ اے اہل اسلام میں نے غیرت اسلام کے آفتاب کو ڈوبنے سے بچا کر، تم پر احسان کیا ہے، اور میں نے اپنے واسطے یہ حق خرید لیا ہے کہ تم مجھ کو ایثار کا دیوتا سمجھ کر میرے سامنے اپنی گردنیں جھکا لو۔

اے حسین۔۔۔۔۔اے دریائے زہر سے آب حیات پینے والے۔۔۔۔۔ اے بپھرے طوفان کو اپنے سفینے میں ڈبو دینے والے۔۔۔۔اے حریم شہادت کے، سب سے اونچے منارے اے ہمت مردانہ کے اوتار اور اے ثبات و عزم کے پروردگار۔۔۔۔۔۔ازل سے لے کر ابد تک کے انسانیت کا غلامانہ سلام قبول کر!

لیکن میری زبان سے ان متذکرہ بالا اعیان ممکنات کی تعریف سن کر اس مغالطے میں نہ پڑ جایئے گا کہ میں کسی دینی یا اعتقادی بنیاد پر ان کا مداح سرا ہوں میرے ان کے مابین جو رابطہ ہے وہ صرف انسانی صفات کی بنیاد پر قائم ہے اور اس کے سوا اور کچھ بھی نہیں ہے آپ کو معلوم نہیں کہ میں سقراط مزوک، خورتشت، گوتم بدھ، مہاویر، تلسی داس، کنفیشس، مسیح، کبیر داس، گرو نانک، مارکس، لینن، مٹشے اور برٹنڈ رسل کا بھی جان و دل سے شیدائی ہوں اور جب تک رام چندر اور کرشن کے متعلق مجھ کو یہ علم نہیں ہوا تھا کہ وہ دونوں تاریخی انسان نہیں صرف اساطیری کردار ہیں اس وقت تک میں ان کا بھی بہت احترام کرتا تھا لیکن ان متذکرہ بالا شخصیتوں کی شیفتگی کے یہ معنی نہیں کہ میں ان کا ہم خیالی اور ان کا پیرو بھی ہوں۔

بات یہ ہے کہ مبلغان ادیان و مصلحان اذہان نے جس ''منشت اول'' پر اپنے نظام کے تصور تعمیر فرماتے ہیں وہ ''خشت اول'' سائنس دانوں کی سی کرید اور کھرے سونے کی سی تحقیقی نیت کے باوجود اب تک میرے ذہن کی گرفت میں نہیں آسکی ہے۔

اور یہی میرا دیانت دارانہ اعتراف جہل ہے جس کو یاروں نے الحاد عدوان اور ارتداد کا نام دے کر میرے خلاف ایک غوغا بلند کر رکھا ہے۔

ہوسکتا ہے کہ یہ میری عقل کا قصور ہو لیکن یار لوگ اس کو میری نیت کا فتور سمجھ بیٹھے ہیں اور لطف یہ کہ جو لوگ مجھ سے برافروختہ ہیں وہ علت العلل یا محرک اول کے باب میں مجھ سے بھی زیادہ جاہل ہیں۔۔۔ان کو اپنے جہل کا علم نہیں اور اسی بنیاد پر وہ دین دار ہونے کے مدعی ہیں۔

کاش ان کو اس بات کا پتا ہوتا کہ ہمارا ایمان اس پیڑھی اور سیڑھی کے مثل ہے جس کو ہم نے والد مرحوم کے ترکے میں پایا ہے ہمارا ایقان تحقیقی نہیں تقلیدی ہے ہم حادثہ اتفاقی کے طور پر مسلمان کے گھر میں پیدا ہو گئے ہیں اس لئے مسلمان ہیں اگر یہودی کے گھر میں پیدا ہو جاتے تو ہم سے بڑا یہودی کوئی نہ ہوتا اور ہمارے معتقدات کا پرفسوں محل، ٹھوس کھوپڑی پر نہیں کھوکھلے کانوں پر تعمیر فرمایا گیا ہے اب رہا علت العلل اور محرک اولیں کا مسئلہ جس کو ''خدا'' ''بھگوان'' ''اللہ'' ''یہوا'' ''منروا'' یا گاڈ کے نام دیئے گئے ہیں جو تثلیث کے دائرے میں ''نور'' یا ''ہو'' ہے لیکن تشبیہ کے میدان میں ایک مطلق العنان بادشاہ اور انسانوں کا سا مزاج رکھنے والا انتہائی طاقت ور شخص ہے سو یہ بحث اس قدر الجھی ہوئی ہے کہ اس کے واسطے اس کتاب میں گنجائش نکالی نہیں جاسکتی۔

بہر حال میں اقرار و انکار کے دو کروں کے بیچوں بیچ بیٹھا ہوا ہوں نظام سماوی کو دیکھتا ہوں تو کہیں کوئی خلا نظر نہیں آتا دل اقرار کرنے لگتا ہے اور نظام ارضی کو دیکھتا ہوں تو اس میں کروڑوں خلا نظر آتے ہیں اور حیات انسانی کی عبرتناک بے ثباتی اور

اس کی بے کراں دردمندیوں پر نگاہ رکتا ہوں تو دل انکار پر مصر ہو جاتا ہے۔

نوع انسانی، ابھی تک اس قدر۔۔۔۔جہل میں گرفتار ہے کہ ہم اپنی اس موجودہ ذہنی سطح پر بیٹھ کر اقرار کر سکتے ہیں نہ انکار۔

اقرار یا انکار کا موقع اس وقت آئے گا جب ہم، ذرے سے لے کر آفتاب تک کے علم پر حاوی ہو جانے کے بعد علت العلل کے ہر پہلو کو خوب ٹھونک بجا کر دیکھنے کے قابل ہو جائیں گے میرا یہ خیال ہے کہ اس آخری منزل تک پہنچنے میں ابھی لاکھوں سال بیت جائیں گے اور میں اس تذبذب کے عالم میں خالی ہاتھ دنیا سے اٹھ جاؤں گا۔

لیکن مجھ کو یقین کامل ہے کہ لاکھوں یا کروڑوں برس کے بعد سہی مگر ایک دن ایسا ضرور آئے گا کہ نوع انسانی آخر کار روح کائنات کو اپنی مٹھی میں لے لے گی اور پوری کائنات پر فرماں روائی کرنے لگے گی۔

جس وقت بفیض مشق فکر جولاں
انسان بنے گا تاجدار دوراں
مجھ کو نہ ملا، تو اے نگار آفاق
بچ کر، مری اولاد سے جائے گا کہاں؟

☆☆☆☆

میرا خاندان

میرے پردادا

تہور جنگ، حسام الدولہ نواب فقیر محمد خاں بہادر، گویا[1] ان کے دادا، یار بیگ خاں درہ خیبر کے سرداروں میں سے تھے۔

---

[1] کتاب کی طباعت سر پر آ گئی ہے وقت نہیں کہ تاریخوں سے حضرت گویا کے تمام حالات جمع کر کے قلم بند کر دیں اس لئے اختصار سے کام لوں گا ان کے تفصیلی حالات مندرجہ ذیل تاریخوں اور تذکروں میں دیکھے جا سکتے ہیں۔

سراپا سخت، جلوہ خضر تاریخ محتشم، از محمد محتشم خاں پسر نواب محبت خاں، تاریخ دتا سی، تاریخ اسپرنگو، نامہ مظفری، تذکرہ شعرا راز ابن امین اللہ خاں طوفان، بوستان اودھ از رلجہ درگا پرشاد، سندیلہ، تاریخ آفتاب اودھ، سیرت سید احمد بریلوی، از ابو الحسن علی تاریخ امیر خانی، قیصر التواریخ، از کمال الدین حیدر، زائر لکھنوی لکھنو گزیٹیر، از مسٹر نیل آئی سی ایس، تاریخ ادب اردو، از رام بابو سکسینہ، تاریخ نظم اردو، از محمد باقر ایم اے دہلی، داستان اردو، از حامد حسین قادر تاریخ اودھ ایسٹ انڈیا کمپنی از ڈاکٹر باسو تاریخ غازی الدین حیدر، از محمد تقی ایم اے پی ایچ ڈی لکھنو تاریخ واجد علی شاہ از ڈاکٹر بھٹناگر، خطوط گویا کتب خانہ ٹونک و دار الانشاء رام پور تذکرہ خوش معرکہ زیبا، از سعادت علی خاں، ناصر لکھنوی، تذکرہ گلشن بے خزاں از نواب مصطفٰے خاں شیفتہ، تذکرہ شعرائے اردو، از عبد الغفور، نساخ کلکتہ، تذکرہ شعرائے اردو، از صغیر بلگرامی تاریخ عمادت السعادت از غلام علی آزاد، تذکرہ ریاض الفصحا، انہ مصحفی، روزنامچہ قاضی، کاکوری، وصیت نامہ فقیر محمد خاں بہادر گویا (قاضی عظیم ملیح آبادی) تاریخ فرخ آباد شیو پرشاد قدیم نسخہ قلمی ناسخ (کتب خانہ سید مسعود حسن رضوی لکھنو) تذکرہ آب حیات از آزاد شعر الہند از عبد السلام ندوی نغمات الفلندریہ (تکیہ شریف کاکوری) شباب لکھنو از احمد علی لکھنوی تاریخ داستان اردو از ڈاکٹر گیان چند جین ایم اے اور

یار بیگ خاں کے دو بیٹے تھے بڑے بیٹے کا نام محمد نام دار خاں اور چھوٹے کا محمد بلند خاں، نام دار خاں درہ خیبر ہی میں رہے اور محمد بلند خاں آفریدیوں کے ایک قبیلے اور اپنے دونوں بیٹوں محمد عوض خاں اور فقیر محمد خاں کو ساتھ لے کر 1234ھ میں ہندوستان چلے آئے اور قائم گنج ضلع فرخ آباد میں سکونت اختیار کر لی۔

اس کے بعد کچھ ایسے حالات پیش آئے کہ انہوں نے اودھ کا رخ کیا اور لکھنو آ کر مقیم ہو گئے۔

اور جب نواب غازی الدین حیدر کے دربار تک رسائی کا موقع مل گیا تو نواب نے ان کو تین سو روپیہ ماہانہ پر فوج میں کوئی عہدہ دے دیا۔

ایک روز موقع پا کر محمد بلند خاں نے نواب سے کہا میں آزاد قبائل کا فرد ہوں، کھلی ہوا میں رہنے کی عادت ہے شہر میں میرا دم گھٹتا ہے مجھ کو اطراف لکھنو کے کسی ایسے قصبے میں زمین دے دی جائے کہ میں وہاں سے روز لکھنو آؤں اور فرائض منصبی انجام دے کر شام کو وہاں چلا جاؤں۔

نواب نے کہا آپ اطراف لکھنو میں کوئی قصبہ منتخب کر لیں زمین آپ کو دے دی جائے گی۔

محمد بلند خاں نے تمام قریبی دیہات اور قصبات کا دورہ کر کے کنول ہار کو پسند کیا جو آفریدیوں کا گڑھ اور ملیح آباد کا ایک محلّہ ہے زمین ان کو دے دی گئی اور انہوں نے وہاں ایک کچا مکان بنا کر بود و باش اختیار کر لی اور اب ان کا یہ معمول ہو گیا کہ صبح گھوڑے پر لکھنو جاتے، اور شام کو کنور ہال پلٹ آتے تھے۔

کنول ہار میں انہوں نے اپنے دونوں بیٹوں محمد عوض خاں اور فقیر محمد خاں کی تعلیم کا سلسلہ شروع کر دیا۔

کچھ روز کے بعد ان کے بڑے بیٹے محمد عوض خاں تعلیم سے بد دل ہو کر ریاست اندر چلے گئے، اور مہاراجہ ہلکر کی فوج میں رسالداری کے عہدے پر فائز ہو گئے۔

کنول ہار سے چلتے وقت انہوں نے یہ چاہا کہ اپنے چھوٹے بھائی فقیر محمد خاں کو بھی جن کی عمر اس وقت تیرہ چودہ سال کی تھی اپنے ساتھ اندور لے جائیں لیکن فقیر محمد خاں نے کہا میری تعلیم ادھوری رہ جائے گی آپ جائیں میں تعلیم سے فراغت پا کر آپ کے پاس چلا آؤں گا۔

اس کے پانچ چھ سال کے بعد جب فقیر محمد خاں فارغ التحصیل ہو گئے تو بڑے بھائی کے پاس اندور چلے گئے اور بھائی نے ان کو بھی رسالہ داری کا منصب دلا دیا۔

اس کے کچھ روز بعد مہاراجہ ہلکر کو یہ خبر ملی کہ پڑوس کا ایک راجہ اندور پر چڑھائی کی نیت سے آیا ہے اندور کے قریب اس کی فوج کا پڑاؤ ہے اور صبح ہوتے ہی حملہ ہونے والا ہے۔

یہ سنتے ہی مہاراجہ ہلکر نے بگل بجوا دیا اور اپنی فوج کو حکم دیا کہ صبح ہوتے ہی دشمن پر حملہ کر دیا جائے۔

اسی رات کو فقیر محمد خاں نے بھائی سے کہا بھائی اب صبح ہوتے ہی میدان جنگ میں اترنا ہے، دیکھئے نتیجہ کیا برآمد ہوتا ہے ان کی یہ بات سن کر بڑے بھائی کے دل 1 میں یہ بدگمانی پیدا ہو گئی کہ چھوٹا بھائی علم حاصل کر کے بزدل ہو گیا ہے اسے راتوں رات ہی قتل کیوں نہ کر دوں، تاکہ خاندان کی عزت پر حرف نہ آنے پائے لیکن برادرانہ محبت جوش میں آ گئی انہوں نے سوچا کہ جب میدان جنگ میں یہ دیکھوں گا کہ یہ لڑنے سے جی چرا رہا ہے اس وقت اس کا کام تمام کر دوں گا ابھی جلدی نہ کرنا چاہئے۔

لیکن صبح ہوتے ہی جب میدان کارزار گرم ہوا تو ان کو دیکھ کر حیرت ہو گئی کہ ان کا اٹھارہ سال کا چھوٹا بھائی صفوں سے آگے بڑھ بڑھ کر دشمن پر نیزہ بازی کر رہا ہے یہ

جوان مردی دیکھ کران کا دل ہاتھ بھر کا ہو گیا۔

معرکہ بے حد سخت تھا لیکن یہ دونوں بھائی اس جوان مردی کے ساتھ لڑے کہ راجہ ملکر کی فوج کا حوصلہ بلند ہو گیا اور دن ڈھلتے ڈھلتے، دشمن کی فوج کے پاؤں اکھڑ

---

1 یہ سارا ماجرا دادی جان نے مجھ سے کہا تھا۔

گئے اور حملہ آور راجہ بھاگ کھڑا ہوا۔

فقیر محمد خاں نے اس راجہ کا تعاقب کیا بیس میل کا فاصلہ طے کر کے اسے گرفتار کر لیا اور مہاراجہ ملکر کے قدموں میں ڈال دیا اس واقعہ کے بعد ڈنکے پٹ گئے دونوں بھائیوں کی بہادری کے جب ان کی شجاعت اور کارناموں کا غلغلہ راجپوتانہ سے سفر کر کے ٹونک پہنچا تو نواب میر خاں والی ٹونک نے مہاراجہ ملکر کے پاس برادرانہ خط بھیجا کہ ان دونوں بھائیوں کو مجھے دے دیجئے۔

مہاراجہ ملکر بڑے شش و پنج میں پڑ گیا سوچا کہ اگر ان دونوں کو بھیج دوں گا تو میری فوج میں پھر رہ کیا جائے گا اور اگر انہیں بھیجوں گا تو نواب میر خاں سے بگاڑ پیدا ہو جائے گا اور ان کے سے زبردست آدمی سے بگاڑ پیدا کر لینا خطرے سے خالی نہیں ان تمام باتوں پر غور کر کے اس نے والی ٹونک کو لکھا کہ میرے آپ کے برادرانہ تعلقات ہیں آپ اگر میری اس تجویز کو مان لیں تو میں آپ کا بے حد شکر گزار ہوں گا کہ ان دونوں میں سے ایک بھائی محمد عوض خاں میری فوج میں رہیں اور دوسرے بھائی فقیر محمد خاں آپ کے پاس چلے جائیں نواب میر خاں نے یہ بات مان لی اور فقیر محمد خاں ٹونک چلے گئے۔ نواب میر خاں نے ان کی بڑی آؤ بھگت کی، اور رسالدار بنا دیا۔

ٹونک میں اس وقت فارسی و عربی کے علماء کا ہجوم تھا، فقیر محمد خاں وقت نکال کر ان بزرگوں سے اکتساب علوم کرنے لگے۔

اس کے بعد نواب میر خان اور انگریزوں کے مابین جنگ چھڑ گئی اور چونکہ نواب میر خاں کے مانند فقیر محمد خاں بھی انگریزوں کے دشمن جانی تھے انہوں نے بڑے

ولولے کے ساتھ لڑنا شروع کر دیا پنڈارے انگریزوں کے مددگار اور گوروں کے دوش بدوش نواب میر خاں کی فوج سے برسر پیکار تھے پنڈاروں نے فقیر محمد خاں کے تیور دیکھ کر یہ سوچا کہ اگر ان کو ہلاک کر دیا جائے تو نواب میر خاں کی فوج بھاگ کھڑی ہو گی اس لئے ایک پنڈارے نے ان پر توپ چلا دی گولا ان کی ران میں آ کر لگا وہ گھوڑے سے گر پڑے ایک پنڈار تلوار سونت کر ان کی طرف جھپٹا انہوں نے بیٹھے بیٹھے اس کے اس طرح نیزہ مارا کہ وہ گر پڑا۔ نواب میر خاں کی نظر پڑی گھوڑا دوڑاتے آئے اور پنڈارے کا ایک ہاتھ میں کام تمام کر دیا۔ اور چاہا کہ انہیں اٹھا کر گھر پہنچا دیں تا کہ فوراً مرہم پٹی ہو جائے فقیر محمد خاں نے کہا میں نے زخم کو خوب کس کر باندھ لیا ہی سپاہی جیتے جی لڑائی کا میدان نہیں چھوڑتا آپ یہ توپ میرے قریب کرا دیں میں بیٹھے بیٹھے دشمن پر گولہ باری کروں گا اور انہوں نے اس قدر شدت کے ساتھ دشمن پر گولے برسائے کہ انگریزی فوج کے پاؤں اکھڑ گئے۔

جنگ فتح ہوتے ہی ان کی مرہم پٹی کی گئی اور دو تین مہینے کے اندر وہ زخم بھر گیا۔ نواب میر خاں نے خوش ہو کر ان کا عہدہ بڑھا دیا اور بھائیوں کی طرح سلوک کرنے لگے۔

اس کے کچھ روز کے بعد نواب میر خاں نے فقیر محمد خاں کو حکم دیا کہ وہ جے پور اور اس کے بعد بھوپال پر حملہ کر دیں۔

جب انہوں نے جے پور اور اس کے بعد بھوپال پر حملہ کیا تو دونوں جگہ ایک ہی معاملہ پیش آیا رانی جے پور اور بیگم بھوپال نے جب یہ دیکھا کہ فقیر محمد خاں کا مقابلہ آسان نہیں ہے تو بانسوں پر اپنے اپنے دوپٹے بندھو کر، ہوا میں اڑانا شروع کر دیئے کہ ہم صلح پر آمادہ ہیں۔

فقیر محمد خاں کا جب سامنا ہوا تو رانی جے پور اور بیگم بھوپال دونوں نے یہ استدعا کی کہ ہم کو اپنی بہن بنا لیجئے اور انہوں نے ان کی درخواست قبول کر لی اور رشتے کو

یہاں تک نباہا کہ جب بھی کبھی کسی نے جے پور یا گوالیار پر حملہ کیا انہوں نے فوراً موقع پر جا کر انہیں بھگا دیا۔

اسی دوران میں نواب میر خاں نے فقیر محمد خاں کو بعض مسائل طے کرنے کی غرض سے اپنا سفیر بنا کر اودھ روانہ کر دیا۔

ان کی شجاعت، اور فن جنگ کا غلغلہ اودھ اور نواب تک بھی پہنچ چکا تھا جب وہ سفیر کی حیثیت سے نواب غازی الدین حیدر والئی اودھ سے ملے نواب نے ان کی بڑی خاطر مدارت کی اور جب سیاسی مسائل پر بات چھڑی تو نواب اودھ نے بڑی حیرت سے کہا خاں صاحب آپ خالی بہادر ہی نہیں ایک بڑے دانش مند اور ذی علم انسان بھی ہیں آپ کو یہاں سے جانے نہیں دوں گا۔

انہوں نے عرض کیا کہ خداوند نعمت میں تو ایک مدت سے اودھ کا باشندہ ہوں میرے باپ محمد بلند خاں آپ کی سرکار کے ملازم تھے وہ ملیح آباد میں موجود ہیں غازی الدین حیدر نے کہا پھر تو آپ حق بحق (ارر سید) کی طرح اپنے وطن ہی میں آ جائیں گے۔

اس پر انہوں نے کہا لیکن یہ بات آئین وفاداری اور اصول شرافت کے منافی ہے کہ میں والی ٹونک کی رفاقت کو ترک کر دوں۔

نواب نے کہا خاں صاحب میں ابھی اس مسئلے کو حل کئے دیتا ہوں اور ہرکارے کو حکم دیا کہ نواب معتمد الدولہ آغا میر (وزیر اودھ) کو حاضر کرے۔

آغا میر کے آتے ہی انہوں نے حکم دیا کہ اس جانب کی طرف سے نواب میر خاں کو خط لکھ کر فقیر محمد خاں کو مانگ لو۔

خط روانہ کر دیا گیا اور چند روز کے بعد آغا میر نے ان کو مطلع کر دیا کہ والی ٹونک نے ہماری بات منظور کر کے آپ کو اودھ میں رہنے کی اجازت دے دی ہے۔

انہوں نے کہا جب تک نواب میر خاں مجھ کو براہ راست خط لکھ کر اجازت نہیں

دے گے میں اودھ کی ملازمت قبول نہیں کروں گا۔

اور جب تھوڑے دن میں ان کے پاس نواب میر خاں کا براہ راست خط آ گیا تو انہوں نے شادہ اودھ کی پیش کش قبول کر لی اور یہ عرض کیا کہ خداوند نعمت کی ملازمت قبول کرنے سے پیشتر میری دلی تمنا یہ ہے کہ ملیح آباد جا کر اپنے باپ کی قدم بوسی کر آؤں۔

غازی الدین حیدر نے آغا میر کو حکم دیا کہ فقیر محمد خاں کو ہاتھی پر ملیح آباد روانہ کیا جائے۔ تین سو سوار اور نقیبوں کی ایک ٹولی بھی ان کے ساتھ کر دی جائے اور جب اس تزک و احتشام کے ساتھ وہ ملیح آباد پہنچے کہ ان کے ہاتھی کے پیچھے تین سو سوار رہیں اور ان کی ہاتھی کے آگے آگے نقیبوں کی ایک ٹولی ہٹو بچو فقیر محمد خاں بہادر کی سواری آ رہی ہے کے نعرے لگا رہی ہے تو وہاں کے پٹھان یہ سمجھے کہ کوئی بادشاہ، ادھر سے گزرتا غالباً سندیلے جا رہا ہے۔

اور ان کے باپ نے جب یہ سنا کہ نقیب فقیر محمد خاں کا نام لے رہے ہیں تو انہوں نے لوگوں سے کہا ارے یہ تو میرے بیٹے کا نام ہے یہ سن کر پٹھانوں نے قہقہہ مارا اور ایک صاحب نے بطور طنز یہ کہا کہ جی ہاں آپ کا بیٹا بادشاہ بن کر آ رہا ہے اور آپ کے اس کچے مکان میں دربار کریگا۔

اس پر محمد بلند خاں نے کہا مسخرہ ہنستے کیا ہو اللہ کو فضل کرتے دیر نہیں لگتی۔

اس کے بعد جب وہ ''شاہی سواری'' سندیلے کا راستہ چھوڑ کر کنول ہار کی طرف مڑنے لگی، تو تمام پٹھانوں کے منہ کھلے کے کھلے رہ گئے اور پوری آبادی آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر ادھر دیکھنے لگی اور جب وہ جلوس محمد بلند کے مکان کے سامنے آ کر ٹھہر گیا تمام لوگ ادھر دوڑ پڑے اور حلقہ باندھ کر کھڑے ہو گئے۔

فقیر محمد خاں کی نظر جب اپنے باپ پر پڑی انہوں نے ہاتھی کے بیٹھنے کا بھی انتظار نہیں کیا دھم سے اس کی پیٹ پر سے ''باوا باوا'' کہتے کود پڑے اور جا کر باپ کے

قدموں پر سر رکھ دیا باپ نے ''ارے میر افقیر'' کا نعرہ لگا کر بیٹے کو قدموں سے اٹھا کر کلیجے سے لگالیا اور بوڑھے باپ کی آنکھوں سے خوشی کے آنسو بہنے لگے۔

باپ کی قدم بوسی کا شرف حاصل کر کے جب وہ لکھنو واپس آئے غازی الدین حیدر نے ان کو پچیس ہزار سواروں کا رسالہ دار بنا دیا اس کے کچھ دن بعد وزارت مال بھی ان کے سپرد کر دی اور اسی کے ساتھ ساتھ انہیں ''سرکار خیر آباد'' کا گورنر بنا دیا[1] اس کے دوش بدوش غازی الدین حیدر نے گولا گنج میں زمین کا ایک بہت بڑا قطعہ بھی ان کے حوالے کر دیا اس قطعے کے انہوں نے دو ٹکڑے کر دیئے ایک ٹکڑے کا نام ''احاطہ پختہ فقیر محمد خاں'' اور دوسرے احاطہ کا نام ''احاطہ خام فقیر محمد خاں رکھ دیا۔''

احاطہ پختہ فقیر محمد خاں میں متعدد محلات تعمیر کرا کے خود رہنے لگے اور احاطہ خام

---

[1] راجہ صاحب محمود آباد کے دیوان میں جس کا نام ''دیوان سحر'' ہے ایک قطعہ موجود ہے جو انہوں نے ان کے گورنر بنائے جانے کی خوشی میں بطور مبارکباد کہا تھا۔

میں اپنے ذاتی سپاہیوں اور کارندوں کو آباد کر دیا[1] ملیح آباد سے ایک میل کے فاصلے پر انہوں نے مرزا گنج میں سینکڑوں ایکڑ زمین خرید کر وہاں اپنے محل بنائے بارہ دری تعمیر کی آم کے باغ نصب کرائے اور گرمیوں کے واسطے ایک پختہ برف خانہ بنوا دیا۔

اسی اثناء میں ایک ایسا واقعہ پیش آیا جس سے ان کے اخلاص اور ان کی شجاعت کے لکھنو کیا پورے اودھ میں ڈنکے پٹ گئے اور وہ واقعہ یہ ہے کہ ایک روز ان کے ایک مخبر خاص نے ان تک ایک زبردست سازش کی خبر پہنچا دی جو ان کے رفیق نواب معتمد الدولہ بہادر آغا میر وزیر اودھ کے خلاف تھی اس سازش کے بانی تھے غازی الدین حیدر کے مقربین میں سے ایک مرزا حاجی۔

مرزا حاجی نے دو راجپوتوں کو دس دس ہزار روپے دشوت دے کر اس امر پر آمادہ کر لیا تھا کہ جب آغا میر شاہی طبیب حکیم واجد علی خاں کے بیٹے کی شادی میں

شریک ہونے کے واسطے پرسوں ان کے وہاں جائیں تو تم پہلے ہی سے وہاں پہنچ کر دروازوں کے پٹوں کے پیچھے کھڑے ہو جانا اور جیسے ہی آغامیر دروازے میں قدم رکھیں تم دونوں بیک وقت حملہ کر کے ان کو قتل کر ڈالنا۔

یہ خبر پاتے ہی فقیر محمد خاں، آغامیر کے محل گئے ان سے اس سازش کا مطلق کوئی ذکر نہیں کیا اور جب آغامیر کے لڑکے کی شادی میں شریک ہونے کی نیت سے روانہ ہوئے تو فقیر محمد خاں بھی ان کے ہمراہ ہو گئے۔

حکیم صاحب کے مکان کے سامنے پہنچے ہی انہوں نے آغامیر سے کہا آج میں آگے آگے چلوں گا، اور آپ میرے پیچھے پیچھے آئیں گے۔

ہن کی اس انوکھی درخواست سے آغامیر کے تمام رفقاء دنگ ہو کر رہ گئے اور ایک دوسرے کا منہ دیکھنے لگے آغامیر نے آنکھیں جھکا لیں اور تھوڑے سے توقف کے بعد کہاں خاں صاحب آپ کی تجویز منظور بسم اللہ آپ آگے آگے چلیں فقیر محمد خاں نے جیسے ہی دروازہ کے اندر قدم رکھا راجپوت نے تلوار چلا دی جس سے ان کا داہنا ہاتھ بڑی

---

1 وہ دونوں احاطے، اپنے چند محلوں کے ساتھ دو بڑے محلوں کی صورت میں آج بھی لکھنو میں موجود ہیں۔

طرح زخمی ہو گیا اور جب فوراً تلوار سونت کر انہوں نے راجپوتوں کو ڈانٹا، تو ان کی آواز سنتے ہی ان کے ہاتھوں سے تلواریں گر پڑیں انہوں نے بھاگنا چاہا لیکن انہوں نے جھپٹ کر دونوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا اور جب ان کی لاشوں کا معائنہ کیا گیا تو یہ دیکھا کہ ان راجپوتوں کے بازوؤں پر دس دس ہزار کے نوٹ تعویذوں کی طرح بندھے ہوئے ہیں۔

آغامیر نے فقیر محمد خاں کو دوڑ کر کلیجے سے لگا لیا ان کے زخمی ہاتھ کو بوسہ دے دے کر بار بار آنکھوں سے لگایا اور کہا خاں صاحب جب آپ نے میرے آگے آگے چلنے

کی فرمائش کی تھیا سی وقت میں بھانپ گیا تھا کہ اس کے پیچھے کوئی بات ضرور ہوگی۔

اس کے بعد انہوں نے پوری سازش کا حال بتا دیا۔ مرزا حاجی کو کھڑے کھڑے حبس دوام کیس زادی گئی اور آغا میر نے ان کو دوبارہ گلے لگا کر کہا خاں صاحب آپ نے اپنی جان پر کھیل کر میری جان بچالی یہ مجھ پر آپ کا وہ احسان ہے جس کو میں زندگی بھر یاد رکھوں گا۔

شاہ اودھ نے جب ان کا یہ کارنامہ ایثار سنا ان کی بے حد تعریف کی سات پارچے کے خلعت سے نوازا اور نواب حسام الدولہ، تہور جنگ کا خطاب بھی عطا فرما دیا۔

حضرت ناسخ نے اس واقعہ پر ایک تاریخی قطعہ کہا تھا جو ان کے دیوان میں ''تاریخ مجروح شدن دست فقیر محمد خاں بہادر کے عنوان سے موجود ہے۔''

لگے ہاتھوں میرے پردادا کا ایک دوسرا واقعہ بھی سن لیجئے۔

آغا میر پر جب زوال آیا اور ان کے حریف میر مہدی کو قلمدان وزارت ملا تو چونکہ فقیر محمد خاں آغا میر کے طرف داروں میں سے تھے اور میر مہدی کے دل میں یہ خوف بیٹھا ہوا تھا کہ فقیر محمد خاں ایک نہ ایک دن اپنے اثرات سے کام لے کر آغا میر کو پھر برسر حکومت لے آئیں گے اس لئے اس نے ان کی ہلاکت کا منصوبہ بنا کر ایک روز انہیں دوپہر کے کھانے پر اپنے وہاں مدعو کیا۔

اور اس منصوبے کی تکمیل کے واسطے اس نے یہ صورت نکالی کہ خود تو بالائی کمرے پر بیٹھا اور سنگین دیواروں سے محصور تنگ انگنائی میں ایک بھینسے کو خواب شراب پلا کر آزاد چھوڑ دیا کہ جیسے ہی وہ انگنائی میں قدم رکھیں وہ بھینسا ان پر حملہ کر کے ان کا کام تمام کر دے۔

چنانچہ یہی ہوا کہ جب فقیر محمد خاں نے انگنائی میں قدم رکھا بھینسے نے شیر ببر کے مانند جھپٹ کر ان پر حملہ کر دیا انہوں نے بھینسے کا وار خالی دے کر پینترا بدلا اور دوسرے گوشے میں تلوار تول کر کھڑے ہو گئے وہ ادھر بھی تیر کی طرح آیا انہوں نے

اس پر تلوار چلادی جس سے اس کی پیٹھ زخمی ہوگئی زخمی ہوکر وہ اور بھی خوفناک ہوگیا اور اپنے دونوں سینک جھکا کر دوڑا کہ ان کا پیٹ پھاڑ ڈالے لیکن جیسے ہی اس نے سر جھکایا انہوں نے تلوار کا ایک ایسا دوٹوک وار کیا کہ اس کی پہاڑ سی گردن کٹ گئی اور خون کا ایک فوارہ آسمان کی طرف جست کرنے لگا۔

وہ اپنی خون آلود تلوار لئے اوپر چڑھ گئے، میر مہدی اور ان کے مصاحب، دوسرے کمرے کی طرف بھاگے انہوں نے جھپٹ کر میر مہدی کا گریبان پکڑلیا اور اس کی گھگی بندھ گئی اور پھر انہوں نے اس کے منہ پر اس قدر زور سے تھپڑ مارا کہ وہ اوندھے منہ گر گیا اور دستار و زارت ڈھلکتی ہوئی سامنے کی دیوار سے جاٹکرائی اور فقیر محمد خاں یہ کہتے ہوئے اتر گئے کہ او گندھی کے بچے تو پٹھانوں کی شجاعت کا امتحان لیتا ہے۔

یہاں تک تو سرسری طور پر ذکر تھا ان کی عالی مرتبگی اور دلیری کا اب ان کی تہذیبی زندگی کے بھی چند واقعات سماعت فرمالیجئے۔

سب سے پہلی اور سب سے زیادہ حیرتناک بات تو یہ ہے کہ ہرچند پشتو ان ان کی مادری زبان تھی پھر بھی انہوں نے اردو شاعری اور اردو زبان پر اس بلا کی قدرت حاصل کرلی کہ ناسخ سے کٹر آدمی نے ان کو اپنے حلقہ تلامذہ میں لے لیا اور ان کو اس قدر شہرت حاصل ہوئی کہ میرے زمانہ تعلیم تک ان کا کلام نصاب میں داخل تھا۔

اور ہرچند وہ آزاد قبائل کے ایک اکھڑ پٹھان تھے انہوں نے لکھنو کی تہذیب کو اس قدر جذب کرلیا کہ لکھنو کے قدیم نوابوں اور ان کے مابین کوئی فرق ہی باقی نہیں رہا تھا۔

ان کے محلوں کی سجاوٹ ان کے ماکولات وملبوسات کی نفاست، ان کی بٹیروں اور مرغوں کی پالیاں ان کے مشاعرے ان کے شبستان میں راتوں کے مجرے ان کی ادب نوازیاں اور اہل علم پر ان کی زر پاشیاں ان میں سے کوئی ایک چیز بھی ایسی نہیں

تھی جس سے یہ گمان ہوتا کہ وہ دین تہذیب میں ایک نومسلم کی طرح داخل ہوئے ہیں اور دراصل ایک بالکل اجنبی زبان اور ایک قطعی ناموس تہذیب کے سانچے میں ڈھل جانے کی یہ حریت ناک صلاحیت و اخاذیت ایک ایسی نادر صفت ہے جو لاکھوں ہی نہیں کروڑوں انسانوں میں سے کسی ایک غیر معمولی شخصیت ہی کو نصیب ہوتی ہے۔

ہر چند وہ بہت دولت مند انسان تھے اور میری دادی جان نے مجھ سے کہا تھا کہ بیٹا تمہارے دادا جان کے وہاں اس قدر روپیہ آتا تھا کہ اسے گننا ممکن ہی نہ تھا اس لئے ترازوؤں میں تول تول کر روپیہ تھیلیوں میں بھرا اور تہ خانوں میں رکھا جاتا تھا لیکن تمول کے باوجود وہ کثرت زر کی نحوست سے بخوبی واقف تھے اور یہ بات ان کو پسند نہیں تھی کہ اپنے اخلاف کے واسطے گاؤں گاؤں یا کسی قسم کی کوئی جائیداد غیر منقولہ ایسی چھوڑ جائیں کہ ان کے خلاف دولت و عشرت کی فراوانی کی سیدزبوں بن کر اوصاف انسانی سے محروم ہو کر رہ جائیں۔

ان کی یہ تمنا تھی کہ جس طرح تلوار کے زور سے میں نے بڑے بڑے محل تعمیر کر لئے ہیں اسی طرح میری اولاد بھی تلوار کی وساطت سے کمائے اور میری ہی طرح جی کھول کر مستحقین پر روپیہ برسائے۔

اور اس خیال کے تحت انہوں نے اپنے نائب مرزا احسن علی بیگ، عرف مرزا حسو کو ہدایت کر دی تھی کہ وہ ان کے واسطے گاؤں گراؤں ہرگز نہ خریدیں۔

ایک روز جب یہ بات ان کے علم میں لائی گئی کہ مرزا حسو بیگ ان کے نام پر سینکڑوں زمینیں سینکڑوں باغ اور سینکڑوں گاؤں آئے دن دھڑا دھڑ خریدتے چلے جا رہے ہیں تو ان کو یہ بات بے حد ناگوار گزری، انہوں نے حسو بیگ کو طلب کر کے ان سے کہا مرزا میری سمجھ میں یہ بات مطلق نہیں آتی کہ میں نے تم سے وہ کون سی ایسی برائی کی ہے کہ تم میرے واسطے جائیدادوں کی خریداری پر اتر آئے ہو، اور میری اولاد کے حق میں کانٹے بو رہے ہو مرزا حسو بیگ نہایت دور اندیش آدمی تھے انہوں نے

دست بستہ عرض کیا کہ خاں صاحب بہادر آپ کی سرکار میں تعمیرات کا سلسلہ برابر جاری رہتا ہے اور میں دوسرے زمینداروں پر دباؤ ڈال ڈال کر ان کے وہاں سے مزدور بلاتا رہتا ہوں اس لئے آئے دن کی مصیبت سے نجات پانے کے واسطے میں نے جائیداد اس لئے خرید لی ہے کہ آسانی کے ساتھ مزدور مہیا ہوتے رہیں یہ سنا تو فقیر محمد خاں کا غصہ فرو ہو گی اور ارشاد فرمایا کہ جائیداد کی یہ خریداری صرف مزدوروں کی فراہمی کے حدود میں رہے اور ریاست نہ بننے پائے۔

مرزا صاحب نے تعمیل ارشاد کا وعدہ تو کر لیا مگر در پردہ جائیداد کی خریداری کا سلسلہ بڑی سرگرمی سے جاری رکھا۔

ایک روز فقیر محمد خاں سے چوب دار نے آ کر عرض کیا کہ کان پور کی ایک بیگم صاحب سلام کرنے کے لئے حاضر ہوئی ہیں انہوں نے فرمایا بلا لاؤ۔

وہ بیگم صاحب آتے ہی رونے لگیں اور کہا میرا بیٹا بد راہ ہو گیا ہے باپ کا سارا اندوختہ چوک میں اڑا چکا ہے اور پرسوں اس نے بہت بڑی جائیداد صرف ڈیڑھ لاکھ میں آپ کے نائب کے ہاتھ بیچ ڈالی ہے آپ کی دریا دلی اور سخاوت کے اودھ میں ڈنکے پٹے ہوئے ہیں اس لئے میں یہ درخواست کرنے حاضر ہوئی ہوں کہ مجھ سے ڈیڑھ لاکھ نقد لے کر میری جائیداد واپس فرما دیجئے۔

انہوں نے حسو بیگ کو بلایا انہوں نے آتے ہی جھک کر سلام کیا فقیر محمد خاں نے سلام کا جواب نہیں دیا مرزا صاحب نے ہاتھ جوڑ کر کہا کہا فدوی سے کوئی قصور ہو گیا ہے؟ فقیر محمد خاں نے بگڑ کر ارشاد فرمایا مرزا جائیداد پیدا کرنے کا چسکا تم سے جائے گا نہیں، یہ دیکھو کان پور کی بیگم صاحب بیٹھی ہوئی ہیں جن کو تم شکار کر چکے ہو۔

مرزا نے کہا خدا گواہ ہے کہ میں ان بیگم صاحب سے بالکل واقف ہی نہیں اس پر بیگم صاحب نے جلدی سے بات کاٹ کر اپنے بیٹے کا نام لیا اور پوچھا کیا آج سے ایک مہینہ پیشتر آپ نے اس کی جائیداد نہیں خریدی ہے اور جب مرزا صاحب گھبرا کر

سر کھجانے اور کوئی عذر ڈھونڈنے لگے تو فقیر محمد خاں نے کہا ان بیگم صاحب کے لڑکے کی جائیداد اسی وقت واپس کر دو مرزا صاحب نے کہا میں نے وہ جائیداد تین لاکھ میں خریدی ہے اور بیگم صاحب ڈیڑھ لاکھ کہہ رہی ہیں انہوں نے حکم دیا کاغذات لاؤ، اور جب کاغذات آ گئے تو معلوم ہوا کہ میرزا صاحب سچ کہہ رہے تھے اس پر ان بیگم صاحب نے کہا کہ اب پتا چلا کہ وہ جائیداد ڈیڑھ میں نہیں تین لاکھ میں خریدی گئی ہے آپ یہ ڈیڑھ لاکھ روپیہ جو میں اپنے ساتھ لائی ہوں اپنے خزانے میں جمع کرا دیں اور مجھ کو دو مہینے کی مہلت عطا فرما دیں اس مدت کے بعد میں جب باقی ڈیڑھ لاکھ روپیہ حاضر خدمت کر دوں تو میری جائیداد میرے بچے کے نام کر دی جائے۔

فقیر محمد خاں نے تھوڑی دیر غور کرنے کے بعد ارشاد فرمایا کہ بیگم صاحب آپ کا فرزند اس جائیداد کر پھر کسی کے ہاتھ فروخت کر ڈالے گا بیگم نے یہ بات سنی تو یہ سمجھ کر رونے لگیں کہ فقیر محمد خاں ان کی جائیداد واپس کرنے پر تیار نہیں ہیں۔

ان کی یہ کیفیت دیکھ کر انہوں نے فرمایا بیگم صاحب آپ میری بات نہیں سمجھیں میں چاہتا ہوں کہ آپ کے فرزند کے عوض وہ جائیداد آپ کے نام منتقل کرا دوں تا کہ آپ کا لڑکا دوبارہ فروخت نہ کر سکے۔

بیگم کا چہرہ یہ سن کر کھل گیا اور کہا خاں صاحب جیسا کہ ابھی کہہ چکی ہوں یہ ڈیڑھ لاکھ روپیہ آپ اسی وقت لے لیں، باقی روپیہ جب دو مہینے کے بعد لے کر آؤں تو ان کی بات ابھی پوری بھی نہیں ہو پائی تھی کہ انہوں نے ارشاد فرمایا مرزا بیگم صاحب سے مطلق روپیہ نہیں لیں گے تم ان کے فرزند کی جائیداد میری طرف سے بیگم صاحب کے نام اسی وقت ہبہ کر کے ہبہ نامہ ان کے سپرد کر دو۔

یہ سنتے ہی مرزا صاحب کا رنگ اڑ گیا بیگم کی آنکھوں سے تشکر کے آنسو بہنے لگے اور ان کی جائیداد واپس کر دی گئی۔

ایک بار ان کے ایک دوست نے جن کا نام غالباً محمد علی خاں تھا، ان سے کہا کہ

ریاست رام پور پر میرے ایک قرابت دار ناجائز طور پر قابض ہو چکے ہیں حالانکہ ازروئے شریعت و قانون یہ ریاست مجھے ملنے چاہئے کہ میں اس کا صحیح وارث ہوں میں نے غاصب پر مقدمہ دائر کیا تھا لیکن رشوت کے بل بوتے پر وہ جیت گیا اب میں اس مقدمے کو ولایت کی پریوی کونسل تک لے جانا چاہتا ہوں جس کے واسطے اسی ہزار کی شدید ضرورت ہے مجھے یقین ہے کہ پریوی کونسل میں رشوت نہیں چل سکے گی اور میں یقیناً مقدمہ جیت جاؤں گا ان کی اس استدعا پر فقیر محمد خاں نے ان کو اسی ہزار روپے دے دیئے۔

اور جب مقدمہ جیت لینے کے بعد، ان کو رام پور کا نواب بنا دیا گیا، تو انہوں نے فقیر محمد خاں کو خط پر خط لکھے کہ رام پور تشریف لائیے، کچھ روز میرے مہمان رہئے میں اس اثناء میں تمام اعیان ریاست کو جمع کر کے، آپ کے اس احسان کا اعلان کروں گا۔ جو آپ مجھ پر کر چکے ہیں اور اسی دربار میں آپ کے اسی ہزار بڑی نیازمندی کے ساتھ واپس کر کے آپ کی خدمت میں ایک بڑی جاگیر بھی پیش کروں گا فقیر محمد خاں نے اس روپے کے واپس لینے سے انکار کرتے ہوئے لکھا کہ وہ ''حساب دوستاں در دل'' کے طور پر دی گئی تھی میں کوئی بنیا نہیں کہ اسے واپس لے لوں[1]

---

[1] میں نے جب کہ میں 1927ء میں وائی رام پور، نواب حامد علی خاں کے زمانے میں بطور مہمان رام پور میں ٹھہرا ہوا تھا ان تمام خطوں کو ریاست کے دارالانشاء سے منگا کر خود پڑھا تھا لیکن جوانی کے لاابالی پن میں ان کی نقلیں نہیں کرائی تھیں اور اب جبکہ مجھے ان نقلوں کا خیال آیا تو میں نے کتب خانہ رام پور کے لائق مہتمم عرشی صاحب کو خط لکھا کہ وہ نقلیں مجھے بھیج دیں تا کہ اس کتاب میں درج کر لوں تو انہوں نے مجھے اطلاع دی کہ دارالانشاء کے تمام کاغذات کو حکومت نے الہ آباد بھیج دیا ہے اب اتنا وقت کہاں کہ الہ آباد جاؤں اور نقلیں حاصل کروں۔

اب چند تذکرہ نویسوں اور مورخوں سے بھی ان کے حالات ملاحظہ فرمائیے:

صاحب الیاقوت والمرجان فی ذکر علمائے یہوان لکھتے ہیں کہ حکیم بدر الدین فاروقی، ابن شیخ محمد صدر الدین تھانیسری و شاگرد شاہ رفیع الدین، محدث دہلوی، نواب فقیر محمد خاں بہادر کے مشیر وندیم اور ان کے محلات کے معالج رہے۔

صاحب ''تاریخ اودھ'' کا بیان ہے کہ نواب فقیر محمد خاں ایک اولوالعزم سپاہ سالار ہی نہیں مزاج بھی شاہی پایا تھا۔ ایک بار نواب آغا میر نے ان سے کہا کہ اس فصل میں ہم آم کھانے ملیح آباد آئیں گے، اور بادشاہ سلامت کو بھی ساتھ لائیں گے۔

نواب فقیر محمد خاں نے ان شاہی مہمانوں کے لئے ایک بارہ دری تین لاکھ روپے میں تعمیر کرائی اور تین لاکھ کے فرنیچر سے اس کو آراستہ کیا۔

صاحب صبح ''گلشن'' نے لکھا ہے کہ اس قصبے (ملیح آباد) میں عمارات رفیع و بساتین وانہار رواں، ان کی عظمت وثروت کے آثار ہیں۔

صغیر بلگرامی کہتے ہیں کہ انہیں آموں کا بہت شوق تھا، اور آم بڑے اہتمام سے لگائے تھے اور سنا ہے کہ وہ دودھ اور شربت سے سینچے جاتے تھے۔

نواب مصطفےٰ خاں شفیتہ نے تحریر کیا ہے کہ باوجود ہجوم دنیا، قدر دان اہل ہر فن است تذکرہ ''خوش معرکہ زیبا'' میں درج ہے اتمام اس (فقیر محمد خاں) کا آغاز سے خوش تر جب کہ دولت مند تھا اب شیعہ امیر المومنین حیدر 1

کریم الدین خاں ان کے باب میں لکھتے ہیں کہ ہمیشہ شیعوں سے ہنگامہ رہتا ہے سننے میں آیا ہے بہت متعصب سنی ہے 2 تاریخ ''محتشم'' میں لکھا ہے کہ نصیر الدین حیدر کے وزیر منتظم الدولہ فقیر محمد خاں سے ناخوش ہو گئے تھے۔ ایک وجہ تو یہ ہوئی کہ انہوں نے وزیر کے روبرو، تاج الدین حسن خاں کے حق میں کلمات درشت کہے تھے اور دوسری وجہ یہ تھی کہ فقیر محمد خاں جری آدمی تھے، اور ان کے سامنے ظلم ہوتا تو مظلوم کی پاس داری۔

---

1 ان کے شیعہ ہو جانے کا کوئی ثبوت نہیں ملتا 2 انہوں نے حضرت علی کی شان

میں جو قصیدے اور امام حسینؓ کی جناب میں جو سلام کہے ان سے اس قول کی تکذیب ہوتی ہے۔

کرتے تھے اس لئے ان کے خلاف یہ حکم جاری کر دیا گیا کہ وہ دربار میں ہتھیار باندھ کر نہ آئیں گویا نے کہا میں اس پر خانہ نشینی کو ترجیح دیتا ہوں اس پر انہیں ہتھیار لگانے کی اجازت دے دی گئی۔

الہ آباد کے رسالہ ''ہندوستانی'' میں ایک مقالہ ''مخزن آلام'' اور ''احمد کی شاعری'' کے عنوان چھپا تھا جس میں صاحب مقالہ نے لکھا ہے کہ گویا کا عروج، نصیر الدین حیدر تک رہا، وہ اودھ کے ساڑھے تین لاکھ سپاہیوں کے سالار تھے اور خود چودہ سو پیادے اپنی ذات خاص میں رکھتے تھے۔

صاحب ''نامہ مظفری'' نے لکھا ہے کہ گویا، عربی بھی ایسی صاف بولتے تھے کہ گویا مادری زبان ہے اور ان کی ترکی بولنے پر بھی لوگوں کو حیرت ہوتی تھی چودہ سو سپاہی ان کے ذاتی ملازم تھے فقیر محمد خاں کے باپ بھی بڑی آن بان کے آدمی تھے، تمام عمر وہ اپنے کچے مکان ہی میں رہے، بیٹے نے لاکھ لاکھ جتن کئے کہ باپ محلوں میں اٹھ آئیں، لیکن انہوں نے قبول نہیں کیا، اور کہا میں زنخا بننا پسند نہیں کرتا۔''

ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ فقیر محمد خاں کے باپ اپنے گھوڑی کو لنگوری 1 چال سے دوڑاتے ہوئے چوک سے گزر رہے تھے اور جب ان کا گھوڑا، ایک طوائف کے چھجے کی طرف بلند ہوا تو نوچی نے نائکہ سے پوچھا یہ سوار کون ہے نائکہ نے کہا چپ رہ، یہ نواب فقیر محمد خاں بہادر کے باپ ہیں۔

یہ سن کر، وہ غصے میں بھرے ہوئے، گھر آئے اور بیٹے سے کہا فقیرے اب میں زندگی بھر چوک سے نہیں گزروں گا۔ بیٹے نے سبب پوچھا تو انہوں نے سارا ماجرا بیان کرنے کے بعد کہا، دنیا کا قاعدہ ہے کہ بیٹا باپ کے نام سے پہچانا جاتا ہے اور آج یہ الٹی گنگا بہی کہ باپ کو بیٹے کے نام سے پہچانا گیا ہے لعنت، ہزار لعنت، چوک سے

گزرنے والے پر۔

ایک بار فقیر محمد خاں کے مہتمم ''باغات'' نے ان کی خدمت میں لکھا کہ حضور کے

1۔ گھوڑے کی وہ چال کہ وہ زمین سے بلند ہوکر، اچھلتا، اور قوس سی بناتا، زمین پر قدم رکھتا ہے۔

والد ماجد جب باغات تشریف لاتے ہیں تو پٹھانوں کے غول کے غول ان کے پیچھے آتے اور ہزاروں کچے پکے آم توڑ کر لے جاتے اور پودوں کی شاخیں بھی توڑ ڈالتے ہیں۔

یہ خبر سن کر، فقیر محمد خاں نے اپنے باپ کے نام، لکھنو سے ملیح آباد یہ خط بھیجا کہ باوا تمام باغ آپ کے ہیں آپ کو ان پر کامل تصرف حاصل ہے، آپ باغوں میں جتنے آدمی چاہیں اپنے ساتھ لے کر جائیں لیکن آپ کے علم کے بغیر جو لوگ آپ کی آڑ لے کر، باغوں میں گھس جاتے اور نقصان پہنچاتے ہیں، ان کے متعلق میں نے مہتمم باغات کو لکھ دیا ہے کہ انہیں باغوں میں نہ جانے دیا جائے۔

بیٹے کا یہ خط پڑھ کر وہ جامے سے باہر ہو گئے، اپنے بھانجے سے کہا فقیر امیر ہو کر دیوانہ ہو گیا ہے میں اسے برداشت نہیں کر سکتا کہ جو لوگ میرے پیچھے پیچھے باغوں میں آنا چاہیں ان کو روک دیا جائے چلو میرے ساتھ لکھنو، میں آج فقیر کے کو مزا چکھا دوں گا۔

فقیر محمد خاں اپنے محل میں شہزادوں اور عمائد لکھنو کے ساتھ بیٹھے ہوئے تھے کہ چوب دار نے آکر عرض کیا کہ سرکار کے والد محترم غصے میں بھرے ہوئے اپنے بھانجے سے یہ کہتے تشریف لا رہے ہیں کہ میں آج اسے مزا چکھا دوں گا۔

فقیر محمد خاں نے یہ سنا تو گھبرا گئے اور حاضرین سے کہا میں اس بڑی الماری کے پیچھے جا کر چھپ جاؤں گا باوا تشریف لائیں تو کہہ دیجئے گا کہ میں اس وقت کہیں باہر گیا ہوا ہوں۔

اتنے میں بپھرے ہوئے محمد بلند خاں آ گئے، تمام محفل کھڑی ہو گئی، انہوں نے پوچھا فقیرے کہاں ہے، حاضرین نے جواب دیا کہ کہیں باہر تشریف لے گئے ہیں محمد بلند خاں نے کہا خوشامد خورو، جھوٹ نہ بولو اور صاف صاف بتاؤ کہ وہ کہاں ہے۔

''خوشامد خوروں'' کا لفظ سن کر تمام ارباب محفل دنگ ہو کر رہ گئے لیکن حضرت گویا کے پاس خاطر سے، کسی نے کوئی ناشائستہ جواب نہیں دیا۔

اتنے میں ہوا کا ایک تند جھونکا آیا، اور فقیر محمد خاں کا اڑتا دامن دیکھ کر، محمد بلند خاں کے بھانجے نے الماری کی طرف اشارہ کر دیا محمد بلند خاں الماری کی طرف جھپٹ پڑے، بیٹے کو کھڑا کر، الماری کے پیچھے سے نکالا اور ان کا گریبان پکڑ کر کہا تیری یہ مجال ہے کہ میرے ساتھ باغوں میں جانے والے کو روک دے، یہ کہتے ہوئے ان کے منہ پر تڑاق سے طمانچہ مار دیا اور جب طمانچہ کھا کر انہوں نے سر جھکا لیا تو محمد بلند خاں کے بھانجے نے کہا ماموں بس اب اس سے زیادہ اور ذلیل نہ کیجئے۔

اور جب محمد بلند خاں بیٹے کو بھری محفل میں ذلیل کرنے کے بعد باہر جانے لگے تو بیٹے نے باپ کے قدم پکڑ لئے اور کہا باوا معاف کر دیجئے اور پھر باپ نے بیٹے کو گلے لگا لیا اور پورے اودھ میں غلغلہ بلند ہو گیا فقیر محمد خاں کی بے نظیر شرافت و سعادت مندی کا اور شعراء نے ان کی سعادت مندی کی تعریف میں قصیدے کہے اور انہوں نے ان کی جھولیاں بھر دیں۔

☆☆

میرے دادا

نواب محمد احمد خان بہادر، احمد صاحب 1 ''مخزن الآم'' اور تعلقہ دار کسمنڈی، جسمانی و جنسی طاقت کے اعتبار سے ایک ایسے غیر معمولی انسان تھے جو صدیوں کے بعد پیدا ہوتے ہیں۔

میں نے ان کو اپنے جاتے بچپن اور آتے لڑکپن میں دیکھا تھا ان کا جسم بے حد گٹھا ہوا تھا کلائیاں دو آدمیوں کی کلائیوں سے بھی زیادہ چوڑی تھیں اور آواز اس قدر بھاری تھی کہ سننے والے کے زخموں کے ٹانکے ٹوٹ جائیں۔

ان کی آنکھیں بہت بڑی تھیں منہ پر داڑھی تھی، سر پر پگڑی باندھتے تھے اور جب داڑھی اور پگڑی کے مابین ان کی آنکھیں چمکتی نظر آتی تھیں تو ڈر کے مارے میرا پیشاب خطا ہونے لگتا تھا وہ انگرکھا پہنتے اور انگرکھے کے اوپر ایک مخملی رومال لپیٹ لیا کرتے تھے۔

ان کی چال اس قدر نپی تلی تھی کہ اس میں تیز رفتاری کا عنصر پیدا ہو ہی نہیں سکتا تھا، اس لئے کہ تیز تیز چلنے کو وہ آداب شرفاء کے خلاف سمجھتے تھے۔

وہ صرف ایک وقت، یعنی دوپہر کو کھانا کھاتے اور صبح روزے کر کے ناشتہ کیا کرتے تھے۔

ان کی پچیس تیس بیویاں، چار نکاحی، اور باقی سب لونڈیاں باندیاں

---

1 ان کے دیوان کا نام

تھیں ۔۔۔۔ وہ ایک سو بارہ بچوں کے باپ تھے ان کے بچوں کے غالباً پچاسی نام میرے پاس لکھے ہوئے ہیں، باقیوں کے نام اب کس سے پوچھوں۔

ان کا انتقال اٹھاسی برس کی عمر میں ہوا انہوں نے بلوغ کے بعد سے، انتقال تک، کبھی ایک رات بھی عورت کے بغیر نہیں گزاری ۔۔۔۔۔ البتہ جب لکھنو جاتے تو پردے کی شدت کی بناء پر چوں کہ بیویاں کیسی، لونڈیاں باندیاں بھی ان کے ساتھ

نہیں جاسکتی تھیں اور چوں کہ طوائفوں سے وہ سخت نفرت کرتے تھے اس لئے دو ایک راتیں ناغہ ہو جاتی تھیں اور صبح ہوتے ہی ان کے سر میں شدید درد ہونے لگتا تھا۔۔۔۔۔اس عالم میں یہ ایک بندھا ٹکا معمول تھا کہ دو مضبوط جسم کے خدمت گار، ان کی کنپٹیوں پر روئی کے گالے چپکا کر ایک گھنٹے تک سنسی سے ان کا سر دبایا کرتے تھے۔

ان کی اس غیر معمولی جنسی طاقت کا غلغلہ سن کر لکھنو کے بڑے بڑے سول سرجن اور ڈاکٹر ان کے پاس آتے ان سے ان کی غذا، ان کے معمولات مرغوبات ومکروہات کے بارے میں دیر تک سوال کرتے، اور ان کا خون جانچتے تھے مگر کسی کو ان کی بے مثال جنسی طاقت کی لم نہیں معلوم ہوسکی۔

میں نے کم سنی میں ان کی اس بے گراں طاقت کے متعلق بعض لوگوں کو یہ کہتے سنا تھا کہ چونکہ وہ کاکوری کے تکیہ شریف کے شاہ صاحب کی دعا سے پیدا ہوئے تھے اور انہوں نے، دادامیاں کو ان کے لڑکپن میں اپنا پائے جامہ پہنا کر، کچھ زیر لب دعا کی تھی اس لئے ان میں یہ غیر معمولی طاقت آ گئی تھی (اس بات کو میں ایک افسانے سے زیادہ کوئی وقعت نہیں دیتا)

ہمارے خاندان کا یہ اصول تھا کہ خلف اکبر کو باپ کا جانشین اور تعلقہ دار بنایا جاتا تھا اور باقی بچوں کو صرف گزارہ دار کی حیثیت دی جاتی تھی۔۔۔۔لیکن دادامیاں کو چونکہ اپنے تمام بچوں سے بے حد محبت تھی انہوں نے اس اصول کو دوسری شکل دے دی، یعنی میرے حقیقی چچا اور میرے باپ کو، ہر چند سب سے بڑی جائیداد عطا فرمائی اور تعلقہ داری چچا کو بخش دی، لیکن اپنے کسی فرزند کو میرے چچا یا باپ کا دست نگر نہیں رکھا، اور گزارے کے بدلے سب کو دل کھول کر گاؤں اور باغ مرحمت فرمائے، بعض کو مرتبے کے لحاظ سے زیادہ جائیداد دی اور بعض کو کم لیکن کسی ایک فرزند کو بھی محروم نہیں رکھا اور ان بیٹوں کو بھی جو لونڈیوں، باندیوں کے پیٹ سے ہوئے تھے کم سے کم دو دو

گاؤں اور دو دو باغوں کا مالک بنا دیا۔

جس طرح ململ کی چادر کو ببول کے اوپر ڈال کر اور پھر زور سے کھینچ کر تار تار کر دیا جائے اسی طرح انہوں نے اپنی جائیداد کے ٹکڑے اڑا کر رکھ دیئے۔

اودھ کے تمام تعلقہ داروں کی طرح، دادا میاں نے بھی اپنے بچوں کی تعلیم و تربیت کی طرف کوئی توجہ مبذول نہیں فرمائی جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ میرے باپ کے علاوہ ان کے تمام فرزند جاہل رہ گئے اور حرف شناسی سے آگے نہیں بڑھ سکے۔

دادا میاں کو عورتوں سے فرصت ہی کب ملتی تھی کہ وہ اپنے علاقے کی نگرانی اور ضلع داروں سے حساب فہمی کرتے، اس لئے تمام کارندوں نے خوب جی بھر کر لوٹا اور ایک کارندے صاحب نے تو جن کی تنخواہ فقط بیس روپے ماہوار تھی ساڑھے تین لاکھ روپے جمع کر لئے جو ان کے انتقال کے بعد ان کی اکلوتی بیٹی کو مل گئے۔

مہینے، دو مہینے کے بعد جب وہ محل سے برآمد ہوتے تھے تو لوگوں میں یہ غلغلہ بلند ہو جاتا تھا کہ آج بڑے خاں صاحب برآمد ہوئے ہیں اور احاطے میں اہل ملیح آباد اور رعایا کے ٹھٹ کے ٹھٹ لگ جاتے تھے سلام کرنے کی غرض سے، شرفاء کے واسطے کرسیاں اور رعایا کے واسطے دور دور تک بنچیں رکھ دی جاتی تھیں اور ان کی یہ سب سے بڑی خصوصیت تھی کہ وہ اس سرے سے لے کر اس سرے تک ہر شخص سے فرداً فرداً باتیں کرتے اور کسی ایک فرد کو بھی مکالمت سے محروم نہیں رہنے دیتے تھے۔

وہ انگریزوں کو ناپاک سمجھتے تھے اور دورے کے سلسلے میں جب ملیح آباد میں کمشنر کا پڑاؤ ہوتا تو حسب دستور وہ سب سے پہلے دادا میاں سے آ کر ملتا تھا اور بڑے لطف کی بات یہ ہے کہ جب وہ اس فرنگی سے ہاتھ ملاتے، تو اسی وقت تسلہ آ جاتا اور وہ اس کے سامنے بیسن مل کر ہاتھ دھویا کرتے تھے۔

1857ء کی جنگ آزادی کے بعد (جس کو فرنگی ''غدر'' سے منسوب کرتے تھے) جب تعلقہ داری کے اسناد تقسیم ہو رہے تھے تو تمام تعلقہ داروں کے ساتھ دادا میاں بھی

تجدید سند کے واسطے گورنمنٹ ہاؤس تشریف لے گئے تھے اور جیسے ہی لیفٹیننٹ گورنر کی نظر دادامیاں پر پڑی اس نے چیخ مار کر کہا دل ہم نے آپ کو پہچان لیا آپ وہی ہے جو بشیرت گنج کی لڑائی میں برٹش کے خلاف لڑا تھا، آپ نے ہمارا بہت سا آدمی مارا تھا ہم فوج کا کرنل تھا ہم نے آپ کو دوربین سے دیکھا تھا نائیں نائیں ہم آپ کو سند نہیں دے سکتا۔

جب یہ سنا تو دادامیاں نے گرج کر کہا۔ بے شک میں آپ کے خلاف لڑا تھا اور مجھے لڑنا ہی چاہئے تھا میں نمک حرام نہیں ہوں کہ نواب اودھ اور اپنے ملک سے غداری کرتا ہم پٹھانوں کے خون میں غداری نہیں ہے ہم لوگ تو آن پر جان دے دیا کرتے ہیں آپ سند نہیں دیتے شوق سے نہ دیں۔

دادامیاں کی اس گرج سے دربار پر خاموشی چھا گئی، بہت سے تعلقہ دار ڈر گئے کہ دیکھئے اب کیا ہوتا ہے لیکن لیفٹیننٹ گورنر بڑا معقول اور شریف آدمی تھا، وہ مسکرایا اور کہا بہت اچھا بولا، بہت اچھا بولا ہم آپ کا تعلقہ داری کی سند دے گا بہت اچھا بولا پٹھان کیریکٹر کے ماپھق (موافق) بولا۔

لیفٹیننٹ گورنر نے ان کو تعلقہ داری کی سند کے ساتھ ساتھ درجہ اول کا آنریری مجسٹریٹ بھی بنا دیا اور وہ مہینے میں ایک بار مجسٹریٹی کے فرائض انجام دینے لگے۔

ملیح آباد چونکہ پٹھانوں کی بستی ہے اس لئے آئے دن وہاں لٹھ پونگا ہوا کرتا تھا اور برابر فوج داری کے مقدمے پیش ہوا کرتے تھے لیکن ان کی مجسٹریٹی کی یہ خصوصیت تھی کہ جب وہ کسی پر جرمانہ کرتے تھے تو جرمانے کی رقم خود ان کے خزانے سے ادا کی جاتی تھی۔

ایک بار ان کے اجلاس پر ایک پٹھان کا مقدمہ پیش ہوا جس نے ملیح آباد کے اسٹیشن پر ایک بدکلام انسپکٹر پولیس پر لٹھ سے حملہ کر کے اس کا سر پھاڑ دیا تھا۔

انہوں نے اس پٹھان پر جرمانہ کر کے، جرمانے کی رقم حسب دستور اپنی سرکار سے

ادا کر دی اور شام کے وقت اسے بلا کر اس کے سر پر ہاتھ پھیرا اور فرمایا کہ میں تم سے بہت خوش ہوں کہ تم نے اس بدتمیز انسپکٹر کا دماغ صحیح کر دیا۔ میں اس صلے میں تمیں روپے ماہانہ تمہارا وظیفہ مقرر کر رہا ہوں جو تمام عمر تم کو ملتا رہے گا دادا میاں کے بعد بھی ان کو وہ وظیفہ تا حیات ملتا رہا۔

ایک دن علاقے کے چند کاشتکار خاں صاحب بہادر کی دہائی خاں صاحب بہادر کی دہائی کے نعرے مارتے آئے اور کہا حضور ہمارے گاؤں سیدا پور سے داروغہ جی گزر رہے تھے، انہوں نے ہمارے ٹھوکریں ماریں اور کہا سالو سلام کے لئے کیوں نہیں کھڑے ہوئے۔

دادا میاں نے کسی سپاہی کو حکم دیا کہ ان کے سر پر کس کس کر چپتیں مارو کاشت کار چلائے کہ ہم تو آپ کے پاس فریاد لے کر آئے تھے آپ الٹے ہمیں کو پٹوا رہے ہیں اس پر انہوں نے کہا تمہارے سروں پر چپتیں اس لئے لگوا رہا ہوں کہ تم ہماری رعایا ہو اور پھر بھی ٹھوکریں کھا کر آئے ہو جاؤ ابھی جاؤ اور تھانے میں گھس کر داروغہ کے سر پر جوتے مارو اور جب جوتے مار کر آؤ گے میں تمہارا ساتھ دوں گا۔

اور جب وہ لوگ داروغہ کو جتیا کر آ گئے تو ان کی پوریوں، کچوریوں اور مٹھائیوں سے تواضع کی گئی اور ان کا آدھا لگان معاف کر دیا گیا۔

انہیں بٹیریں لڑانے، بٹیریں پالنے، اور بٹیریں کھانے کا بہت شوق تھا سپاہی راتوں کو کھیتوں میں جال لگاتے پھندیتوں کے پنجرے چاروں طرف لٹکاتے، ان کی بولیوں پر بٹیروں کو کھیتوں میں گراتے، اور صبح کو سینکڑوں بٹیریں جالوں میں پھنسا کر لے آتے تھے ان میں سے کچھ، لڑنے کے لئے پال لی جاتیں، کچھ بچوں میں تقسیم کر دی جاتیں اور کچھ دسترخوان کے لئے پکالی جاتی تھیں۔

جب وہ دوپہر کے وقت دسترخوان پر بیٹھتے تھے تو محل کا پورا لمبا چوڑا الق و دق برآمدہ ان کے ساتھ کھانے والے بچوں سے بھر جاتا، اور ایسا معلوم ہوتا کہ سکندر اعظم

کی فوج ٹوٹ پڑی ہے۔

ایک روز میں اپنے باپ کے پاس بیٹھا برفی کھا رہا تھا کہ دادا میاں کا خاص خدمت گار رحم علی آیا اور ہاتھ جوڑ کر کہا بڑے خاں صاحب بہادر نے یاد فرمایا ہے۔

جب میں، اپنے باپ کے ساتھ، محل میں داخل ہوا، دیکھا کہ، وہ ایک مخمل سے ڈھکے ہوئے مونڈھے پر تشریف فرما ہیں اور فرط غضب سے ان کا سر ہل رہا ہے اور جب میرے باپ نے جھک کر سلام کیا اور پوچھا باوا کیا بات ہے تو انہوں نے سر کو جھٹکا دے کر فرمایا ''بشیر مجھے آج محمد اسحٰق کی صورت سے نفرت ہوگئی، میرے باپ نے بڑے ادب سے پوچھا باوا کس بات پر دادا میاں نے فرمایا کہ ابھی اسحٰق تیز تیز قدم رکھتا میرے پاس آیا تھا میں نے کہا اسحٰق، اس طرح چھچھورے پن سے تیز تیز چلنا آداب شرفاء کے منافی ہے، تم جانتے ہو اس نے میری یہ ڈانٹ سن کر کیا جواب دیا، اس نے کہا باوا معاف فرمایئے، خوشی کے مارے میری چال بدل گئی، ہمارے علاقے کے گاؤں تھری میں ایک بہت بڑا خزانہ نکل آیا ہے اس کی خوشخبری دینے آیا ہوں، بشیر اس کا یہ جواب سن کر میرے تن بدن میں آگ لگ گئی میں نے کہا دور ہو جا میری نظروں سے بھلا خزانہ بھی کوئی ایسی چیز ہے کہ اس سے شریفوں کی چال میں فرق آ جائے۔

---

1 فرزند اکبر

پچاسی برس کی عمر میں بھی دادا میاں کی صحت اس قدر اچھی، اور ان کے قواء اس قدر مضبوط تھے کہ وہ ابھی دس بیس برس تک اور جی سکتے تھے مگر ایک حسین عورت ان کی موت کا باعث بن گئی۔''

واقعہ یہ ہے کہ ان کو خوش کرنے کے لئے مرزا امداد بیگ نے لکھنو سے ایک نہایت خوب رو اور دراز قامت مغلانی کو بطور تحفہ ان کی سرکار میں پیش کیا تھا، اس عورت کو آتشک کا مرض تھا جو ان کو لگ گیا انہوں نے شرم کے مارے کسی سے نہیں کہا اور کچھ

روز بیمار رہ کر اسی مرض میں ان کا انتقال ہو گیا۔

مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ میں ایک روز رات کے وقت، جب دادا میاں کے پاس گیا تھا ان کی داہنی میز پر ایک بڑا سا اکا جل رہا تھا، اور بائیں جانب وہ صبیح و دراز قامت مغلانی کولے پر ہاتھ رکھے کھڑی تھی میں اس کو دیکھ کر دنگ رہ گیا اور اس کو جانب، ٹکٹکی باندھ کر دیکھنے لگا تھا اور انہوں نے میری یہ حالت دیکھ کر یہ ارشاد فرمایا تھا ڈیوٹ 1 الوٹ کیا دیکھ رہا ہے، بدتمیز کہیں کا جھکا لے آنکھیں۔

یہ بات کہیں اوپر کہہ چکا ہوں کہ میرے دادا اپنے مختلف البطن چھوٹے بھائی نواب محمد نسیم خان سے خوش نہیں تھے اور نسیم خان کے انتقال کے بعد ان کے فرزند نواب محمد علی خان کو بھی پسند نہیں فرماتے تھے،

دادا جان جب مرض الموت میں گرفتار ہو گئے تو عین ان کے انتقال کے دن ان کو خبر دی گئی کہ محمد علی خان عیادت کے واسطے حاضر ہوئے ہیں۔

یہ سنتے ہی انہوں نے لونڈیوں سے کہا مجھے اٹھا کر بٹھا دو، گاؤ تکیہ پیچھے رکھ دو حقہ سامنے لگا دو، میری دادی جان نے کہا اٹھ کر نہ بیٹھو، ایسا نہ ہو دشمنوں کی طبیعت اور خراب ہو جائے انہوں نے جواب دیا کہ محمد علی مجھ کو دیکھنے آیا ہے

---

1 ایک بات سوٹ پہنے دیکھ کر انہوں نے مجھ کو ''ڈیوٹ الوٹ'' صاحب بہادر کا خطاب دیا تھا اور اکثر اسی نام سے مجھے پکارا کرتے تھے

آیا ہے، میں اس کو یہ دیکھ کر خوش نہیں ہونے دوں گا کہ چچا اب انتقال کے قریب آ گئے ہیں۔

اور جب وہ اٹھا کر بٹھا دیئے گئے انہوں نے حکم دیا بلاؤ محمد علی کو، محمد علی خان نے پوچھا چچا مزاج کیسا ہے، دادا میاں نے بلند آواز سے ارشاد فرمایا محمد علی اب فاقہ ہو رہا ہے یہ کہہ کر وہ بڑے کڑاکے سے حقہ پینے اور پان کھانے لگے اور تھوڑی دیر بیٹھ کر جب بھتیجا چلا گیا تو گاؤ تکیہ ہٹوا کر میری دادی سے ارشاد فرمایا، میرے بدن میں جس

قدر بھی طاقت باقی تھی وہ میں نے محمد علی پر صرف کر دی اس کے بعد، کلمہ پڑھا، اور روح قفس عنصری سے پرواز کر گئی۔

ان کے مجموعہ کلام کا نام ''دیوان احمد، موسوم بہ مخزن آلام'' ہے ٹائٹل پیج پر مندرجہ ذیل عبارت ایک حلقے میں درج ہے ''من نتاج افکار، سخن سنج، معجز بیان و عالی خاندان الادودمان جناب محمد احمد خان صاحب بہادر، تعلقہ دار و آنریری مجسٹریری خلف الرشید، دست گیر افتادگان جنت مکاں حضرت فقیر محمد خاں صاحب بہادر گویا مرحوم و مغفور''

دادامیاں نے ایک مطبع قائم کر کے ملیح آباد (مرزا گنج) ہی میں یہ دیوان چھپوایا اور خاندان میں تقسیم کر دیا تھا۔

اس دیوان کی ضخامت پانچ چھ سو صفحے سے کم نہیں تھی میرے پاس ان کے پچاس دیوان تھے گھر میں چوری ہوئی تو چور کتابیں بھی لے گیا اب چند اوراق میرے پاس رہ گئے ہیں۔

وہ ٹھیٹ قدیم رنگ میں شعر کہتے تھے چند اشعار آپ بھی سن لیں۔

کبھی گر سامنا ہو گا رخ گل گون جاناں کا
تو فق ہو جائے گا منہ، دیکھنا صبح بد خشاں کا
علی مرتضٰی شیر خدا کی مدح لکھتا ہوں
نیستاں نام رکھا جائے گا میرے قلمداں کا
وہ ہوں میں رند، اے واعظ، نہیں کچھ مذہب و ملت
نہ قائل کفر کا سمجھو، نہ تابع مجھ کو ایماں کا

قتل کر کے ومرا بانی بیداد آیا
آرزو تھی مجھے جس کی وہی جلاد آیا
نہ ہوا تو مری خاطر سے فراموش کبھی

میں تو بھولے سے بھی تجھ کو نہ کبھی یاد آیا

شہر میں آئے تو جنگل کی ہوا، سر میں بھری
لائی صحرا میں جو وحشت تو وطن یاد آیا

ثمر باغ جہاں میں یہ ملا نخل جوانی کا
کہ وصل یار حاصل ہے، مزا ہے زندگانی کا
حسینوں میں تمہارا نام ہو تابوت پر میرے
صنم تم ڈال دو اپنا دوپٹہ کام دانی کا

جیتے جی فرقت دل دار نے سونے نہ دیا
قبر میں حسرت دیدار نے سونے نہ دیا
رات بھر گنتے رہے تارے، شب تار میں ہم
یاد افشان رخ یار نے سونے نہ دیا
خواب میں دیکھ لیا، رقص جو کرتے ان کو
گھنگروؤں کی ہمیں جھنکار نے سونے نہ دیا

عدم سے جانب ہستی جو بوتراب آیا
ہوا یہ شور جہاں میں کہ آفتاب آیا

جو یاد ہجر میں ان کی کوئی ادا آئی
پری کا بھیس بدل کر، مری قضا آئی

صبا، تو آئی ہے کیا ہو کے اس کے کوچے سے؟
کہ تجھ سے آج مجھے بوئے آشنا آئی
بہایا آنکھوں سے دریا لہو کا احمد نے
تمہاری یا وجو اے شاہ کربلا آئی

پژ مردہ ہو کے بے رخی باغباں سے ہم
برگ خزاں کی طرح چلے بوستاں سے ہم
تلقیں کی احتیاج نہیں ہم کو زاہدا
ہیں فیضیاب، صحبت پیر مغاں سے ہم

جب سے عاشق ہوئے تمہارے ہم
لگ گئے گور کے کنارے ہم
وصل کی شب وہ مجھ سے کہتے ہیں
آج تم جیتے اور ہار سے ہم

☆☆☆☆☆

میرے باپ

نام تھا نواب بشیر احمد خاں، اور تخلص تھا ''بشیر'' مردانہ حسن میں ان کا جواب نہیں تھا یہ منسلکہ تصویر اس وقت کے ایک انا ڑی کے ہاتھ کی کھینچی ہوئی ہے جس سے ان کی صورت کا اندازہ نہیں ہوسکتا۔

ان میں جمال و جلال کا ایسا امتزاج تھا کہ جس جگہ بیٹھ جاتے تھے، ٹکٹکی باندھ کر دیکھنے والوں کے ہجوم سے گلیاں بند ہو جاتی تھیں اور جب ریل میں سفر کرتے تھے، تو فرنگی بھی، جن کی تہذیب میں تعارف کے بغیر، بات کرنا بدتہذیبی ہے اس قدر متاثر ہو جاتے تھے کہ ان سے یہ پوچھے بغیر نہیں رہ سکتے تھے کہ آپ کا نام کیا ہے، اور آپ کس خاندان کے فرد ہیں ان کو اپنی اولاد سے اس قدر محبت تھی کہ ستر ماؤں کی محبت کو ان کی ایک محبت پر قربان کر دیا جا سکتا تھا، وہ رات کے ایک یا دو بجے مردانے سے اٹھ کر جب زنانے میں تشریف لاتے تھے تو ایک خادمہ، لالٹین ہاتھ میں لئے آگے آگے چلتی تھی اور وہ ہم ساتوں بھائیوں بہنوں کی نبضیں دیکھے بغیر نہیں سوتے تھے اور جب ہم میں سے کسی کا ناخن بھی دکھتا تو ڈاکٹروں سے ہمارا گھر بھر جایا کرتا تھا اور جب ہم میں سے کسی کے منہ سے کوئی بدشگونی کی بات نکل جاتی تھی تو ہم پر سے صدقے اتارے جاتے تھے اور چونکہ ہمارے تمام محلوں کو بھوتوں اور چڑیلوں کا رمنا خیال کیا جاتا تھا اس لئے ہم سب بچوں کی خواب گاہ کے گرد روز رات کو حصار کھینچا جاتا اور ہماری پائینتی ایک ایک

---

1 میں اپنے باپ کے بہت سے واقعات اوپر درج کر چکا ہوں اس لئے اس موقع پر اختصار سے کام لینا پڑا ہے۔

انا یا دوا سلائی جاتی تھی، جب ہم زنانے سے مردانے میں جاتے تو بھی ڈیوڑھی میں سے گزارنے کے لئے کوئی نہ کوئی خادمہ ہمارے ساتھ کر دی جاتی تھی جب ہم غسل خانے جاتے تو اس وقت بھی دروازے پر ایک ماما کھڑی رہتی اور بار بار پکار

پکار کر کہا کرتی تھی بھیا، یا بٹیا ڈرنا نہیں ہم دروازے پر کھڑے ہوئے ہیں اور جب سوتے وقت دادی جان حصار کھینچ کر، تین بار تالیاں بجاتی تھیں تو ڈر کے مارے، میرے تمام رونگٹے جھن سے کھڑے ہو جاتے تھے۔

لیکن انتہائی شفقت کے باوجود وہ تربیت کے معاملے میں ضرورت سے زیادہ سخت گیر، اور دادی جان کی اس نصیحت پر کہ ''بٹیا'' بچوں کو کھلاؤ سونے کا نوالہ، اور دیکھو شیر کی نگاہ سے بڑی شدت کے ساتھ عامل تھے۔

انہوں نے خصوصیت کے ساتھ، ہم تینوں بیٹوں کو، بڑی سختی کے ساتھ، اس بات کی ممانعت کر دی تھی کہ آپس میں یا دوسرے ساتھ کھیلنے والے بچوں سے کشتم کشتا نہ کرو، شور نہ مچاؤ، کونوں کھتروں میں نہ کھیلو خدمت گاروں کارندوں اور سپاہیوں کی چارپائیوں پر نہ بیٹھو، خواہ وہ موجود ہوں یا نہ ہوں، لکھنے پڑھنے کے وقت کھیل کود کے قریب بھی نہ پھٹکو، کمرے کے دروازے بند کر کے نہ بیٹھو، اگر کوئی مذاق دل لگی کی بات کرے اسے مارو اور ہمارے پاس لے آؤ، لونڈیوں، باندیوں سے ہنس کر بات نہ کرو۔

ایک روز، کسی مخبر نے آدھی رات کو، ان تک یہ بات پہنچا دی کہ میرے بڑے بھائی اور میں دونوں حضرت احسن 1مارہروی کے صاحبزادے کے ہاتھ میں ہاتھ ڈالے، باغ میں ٹہل رہے تھے، یہ خبر سن کر وہ آگ بگولا ہو گئے محافظ ماما کی معرفت ہم دونوں بھائیوں کو اسی وقت جگوا کر بلوایا، ہم پہنچے تو انہوں نے فرمایا سنا ہے آج آپ دونوں احسن صاحب کے لڑکے کے ہاتھ میں ہاتھ ڈالے باغ میں گل گشت فرما رہے تھے۔

ہمیں کیا معلوم تھا کہ کسی کے ہاتھ میں ہاتھ ڈال کر ٹہلنا کوئی بری بات ہے ہم نے اقرار کر لیا ہمارے اقرار کے بعد انہوں نے بھاری آواز میں فرمایا آپ

1وہ ہمارے یہاں اکثر آتے اور ہفتوں ٹھہرا کرتے تھے۔

دونوں ادھر آئیں، جب ہم ان کے قریب پہنچ گئے انہوں نے کہا آپ دونوں اپنے اپنے ہاتھ کھول کر جھکا دیں، اور جب ہم نے ہاتھ کھول کر جھکا دیئے تو انہوں نے اپنے بھرے ہوئے حقہ کی دہکتی ہوئی چلم کے انگارے ہمارے ہاتھوں پر گرا دیئے ہمارے ہاتھ بری طرح جل گئے اور صبح تک بڑے بڑے آبلے پڑ گئے۔

جہاں تک کہ علم و فضل کا تعلق ہے وہ عام روساء سے بالکل مختلف، اور رات کے دو بجے تک کتب بینی کیا کرتے تھے فارسی زبان اور تاریخ اسلام پر ان کو اس قدر عبور حاصل تھا کہ سعدی، حافظ، نظیری، قاآنی اور فردوسی کا پورا کلام ازبر تھا اردو میں وہ میر تقی میر اور میر انیس کے شیدائی تھے اور جب انیس کے مرثیے اور فردوسی کا شاہنامہ سناتے تھے تو سماں بندھ جاتا تھا۔

شاعری میں سب سے پہلے مرزا داغ سے اصلاح لی اس کے بعد امیر مینائی اور جلال لکھنوی سے استفادہ کیا، ہر چند وہ لکھنو کی غالب پرست ''معیار پارٹی'' کے رکن تھے مگر غالب پر میر کو ترجیح دیتے تھے۔

اور تاریخ اسلام جب بیان فرماتے تھے تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ خود اس دور میں موجود تھے، مجھ سے ایک بار، سید ناصر حسین صاحب قبلہ نے فرمایا تھا کہ آپ کے والد گرامی کو تاریخ اسلام پر اس قدر عبور حاصل تھا کہ خود مجھے اس پر غبط پیدا ہوا کرتا تھا۔

دینی اعتبار سے وہ سنی تھے لیکن اہل بیت کی محبت کو جزو ایمان ہی نہیں عین ایمان سمجھتے اور حضرت علی کو تینوں خلفاء پر اجل ترجیح دیتے تھے۔

قلب کی گداختگی، شاعری سے شیفتگی اور علم و فضل سے وابستگی، اور لکھنو کی تہذیب سے دل دادگی کے باوصف، ان کے مزاج میں اس قدر غصہ تھا کہ غضب کے ہنگام وہ ایک خوف ناک پٹھان کے علاوہ اور کچھ بھی نظر نہیں آتے تھے اور قبضے پر ہاتھ رکھتے ہی کچھ اور ہو گئے کا عالم ان پر طاری ہو جایا کرتا تھا۔

ان کی سرکار سے سینکڑوں بیواؤں، یتیموں اور بوڑھوں کو ماہانہ وظائف ملا کرتے

تھے اور اس کے اخفاء میں ان کو اس قدر غلو تھا کہ کسی کو کانوں کان، خبر ہی نہیں ہونے پائی تھی۔

ان کے انتقال کے بعد میں نے وظائف کا رجسٹر دیکھا تو یہ دیکھ کر حیرت ہوگئی کہ اس رجسٹر میں ان لوگوں کے نام بھی درج ہیں جو ہمارے خلاف عدالتوں میں جھوٹی گواہیاں دے چکے تھے۔ اور اس کے باوجود ان کا وظیفہ بند نہیں کیا گیا تھا۔

ہم آفریدیوں اور قندھاریوں کے مابین شاہی دور میں ہمیشہ تلوار چلتی رہی انہیں قندھاریوں میں ایک صاحب عبدالرحمٰن خان تھے جو میرے باپ کے پاس آیا کرتے تھے انہیں آتے جاتے دیکھ کر مجھ کو اس بات پر تعجب ہوا کرتا تھا کہ قندھاریوں اور آفریدیوں کے درمیان تو ایک مدت سے عداوت چلی آ رہی ہے، پھر وہ میرے باپ سے کیوں ملنے آتے ہیں، اور اس سے بھی زیادہ تعجب اور پشیمانی آمیز افسوس اس بات پر ہوتا تھا، کہ عبدالرحمٰن خان کے آتے ہی میرے باپ کی آنکھیں کیوں جھلک جاتی ہیں میں یہ سوچ سوچ کر دل ہی دل میں کڑھا کرتا تھا کہ میرے باپ شاید عبدالرحمٰن خان سے ڈرتے ہیں جبھی تو ان کو دیکھتے ہی آنکھیں نیچی کر لیتے ہیں لیکن ڈر کے مارے زبان سے کچھ کہتا نہیں تھا، جب بہت دن تک یہ تماشہ دیکھتا رہا تو مجھ سے ضبط نہیں ہوا اور ایک روز ڈرتے ڈرتے میں نے پوچھا میاں آپ عبدالرحمٰن خاں سے آنکھیں کیوں نہیں ملاتے انہوں نے میرا یہ سوال سن کر پہلے تو ادھر ادھر دیکھا اور پھر مجھ کو اپنے قریب بٹھا کر فرمایا بیٹا عبدالرحمٰن خاں ایک زمانے میں رئیس تھے اب ان کے پاس کچھ بھی نہیں رہا ہے اس لئے میں ان کو وظیفہ دیتا ہوں، اور بیٹا شریفوں کی یہ آن ہے کہ جس کو وظیفہ دیتے ہیں اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر نہیں دیکھتے کہ وہ کہیں شرمندہ نہ ہو جائے اور جب میں آنکھوں میں آنسو بھرے جانے لگا تو انہوں نے فرمایا دیکھ بیٹا میرے سر کی قسم یہ بات کبھی زبان پر نہ لانا۔

جہاں تک ان کی ادبی زندگی کا تعلق ہے وہ گاہ گاہ غزلیں کہا کرتے تھے ان کے

پاس کوئی بیاض نہیں تھی غزلیں پرچوں پر لکھ کر ادھر ادھر ڈال دیتے یا کبھی صندوقچے پر رکھ لیا کرتے تھے اس لئے ان کے کلام کا بہت بڑا حصہ تلف ہو گیا، جو چند غزلیں مل سکیں وہ بھائی صاحب نے ''کلام بشیر'' کی صورت میں چھاپ دیں، جس کا ایک حصہ ترقی اردو بورڈ میں موجود ہے۔

ان کو زبان کی صحت، اور لہجے کی نجابت کا بے حد خیال رہتا تھا اور جب ہم میں سے کوئی غلط لفظ بولتا تھا، وہ تڑاق سے تھپڑ مار دیا کرتے تھے۔

افسوس کہ ''کلام بشیر'' اس وقت میرے سامنے نہیں ہے حافظے میں جو چند شعر موجود ہیں وہ سن لیجئے:

آمادہ ہو جو سوز نہاں کے بیان پر
انگارہ خود اٹھا کے میں رکھ لوں زبان پر
چھوڑو خدا ہی پر کہ وہاں ہو گا فیصلہ
میرے بیان پر نہ، تمہارے بیان پر
اب تم بھی مہرباں ہو تو جی خوش نہ ہو سکے
دل مر گیا، کچھ ایسی بلا آئی جان پر

یہ رشک کے صدمے کبھی دل سہہ نہیں سکتا
جنت بھی ترا گھر ہو تو میں رہ نہیں سکتا
سمجھو تو اسی پردے میں کہ جاتا ہے سب کچھ
جو تم سے یہ کہتا ہے، میں کچھ کہہ نہیں سکتا

جگنوؤں کا وہ چمکنا کبھی ویرانوں میں
وہ غریبوں کے مزاروں پہ چراغاں ہونا

دل ہی دل میں مرے رونے پہ وہ ہنسنا ان کا
اثر ضبط وہ چہرے سے نمایاں ہونا

راہ پر، ان کو، لے ہی آیا د
اف رے چلتے ہوئے زمانے کے

دم ان کے سامنے نکلے دعا یہ مانگوں گا
ذرا مجھے مرے احباب قبلہ رو کرتے
برا ہو دل کا یہ کم بخت آہ کر بیٹھا
قریب تھا کہ وہ کچھ مجھ سے گفتگو کرتے

کوئی گریاں قریب تربت ہے
زندگی! پھر تری ضرورت ہے

☆☆

میری ماں

نواب خواجہ محمد خاں، جاگیردار دھول پور (راجپوتانہ) کی بیٹی تھیں۔

میرے نانا ہر چند بہت معمولی سے پڑھے لکھے آدمی تھے لیکن یہ بڑی حیرت کی بات ہے کہ انہیں اپنی بیٹی اور بیٹے کی تعلیم و تربیت میں بے حد غلو تھا۔ انہوں نے لکھنو سے ایک قابل استانی اور لائق استاد کو بلا کر اپنے بچوں کی تعلیم و تربیت کا انتظام کیا تھا، اور اسی کے ساتھ ساتھ انہوں نے لکھنو کی مغلانیوں کو بھی ملازم رکھا تھا کہ وہ انہیں آداب دکھائیں۔

اس لکھنوی اثر کا یہ نتیجہ نکلا کہ میرے ماموں تو بالکل شیعہ ہو گئے اور میری ماں ہر چند اصحاب ثلاثہ کو مانتی رہیں لیکن حضرت علی کو سب پر بمراحل ترجیح دینے اور محرم میں عزاداری کرنے لگیں۔

میری نانی کا سایہ، میری ماں کے سر سے لڑکپن ہی میں اٹھ چکا تھا، لیکن ان کی سوتیلی ماں حاتم زمانی بیگم نے انہیں سگی ماں کی طرح اس لاڈ سے پالا کہ میری ماں کو یہ محسوس نہیں ہو سکا کہ ان کی ماں کا انتقال ہو چکا ہے، جب میری ماں کی شادی کا وقت آیا تو چونکہ انہیں معلوم ہو چکا تھا کہ میرے دادا برابر تیوں کا لشکر ساتھ لے کر آ رہے ہیں اس لئے وہ دھول پور سے آگرہ چلی آئیں کہ نانا کے آگرے والے محل میں بیک وقت پانچ چھ سو مہمان ٹھہرائے جا سکتے ہیں۔

میرے نانا کے تعلقات راجپوتانہ کے تمام والیان ریاست سے برادرانہ تھے اسی لئے میری ماں کی شادی میں چھ سات والیان ریاست نے شرکت کی تھی۔

اور چونکہ میری سوتیلی نانی حاتم زمانی بیگم واقعی حاتم ثانی تھیں اس لئے انہوں نے اس قدر جہیز دیا تھا کہ وہ مال گاڑی کی آٹھ بڑی کراچیوں میں بھر کر ملیح آباد لایا گیا تھا اور اور آگرے میں اس شادی کے ڈنکے پٹ گئے تھے۔

حاتم زمانی بیگم نے دو مغلانیاں، دو غلام اور ایک ہاتھی بھی اس کے چاندے

سونے کے زیوروں کے ساتھ جہیز میں شامل کر دیا تھا۔

آگرے سے کامل دو مہینے کی مہمان داری کے بعد جب برات ملیح آباد آئی تو میری دادی فرماتی تھیں کہ تمام محل میں چراغاں کیا گیا اور ایک عشرے تک دعوتوں اور مجروں کا سلسلہ جاری رہا۔

دادا میاں چونکہ غیر معمولی طور پر بیحد کثیر العیال تھے، اور چونکہ ان کے بہت سے بیٹے فوت ہو چکے تھے اس لئے ان کا یہ معمول تھا کہ وہ ہر ہفتے، شام کے وقت اپنے مرے بیٹوں کو نام لے لے کر پکارتے کہ اے امیر احمد، اور اے رشید احمد واپس آجا واپس آجا اور اس قدر زور سے روتے تھے کہ محل کے تمام سقف و بام ہلنے لگتے تھے 1

دادا میاں کی آواز چراغ جلے جب محل میں گونجنے لگتی تھی ڈر کے مارے میری ماں کا برا حال ہو جاتا تھا وہ کانپنے لگتی تھیں اور میکے سے آئی ہوئی مغلانیاں ان سے کہتی تھیں صاحبزادی یہ نواب صاحب کو کیا ہو گیا تھا کہ انہوں نے آپ کو شیروں کے کٹہرے میں بند کر دیا ہے۔

میرے باپ کو میری ماں کی اس دہشت زدگی کا علم ہوا تو وہ اپنے بڑے بھائی محمد اسحٰق خان کے محل میں اٹھ گئے لیکن وہاں پہنچ کر بھی میری ماں کو سکون حاصل نہ ہو سکا۔

میرے چچا اس قدر مغلوب الغضب تھے کہ ذرا ذرا سی بات پر ماماؤں اصیلوں

---

1 یہ ماجرا میری ماں نے مجھ سے بیان فرمایا تھا

کو اس قدر زور سے ڈانٹتے ڈپٹتے تھے کہ ان کی آواز کی دھمک سے زمین کانپنے لگتی اور نم خوردہ چھجے کے پلاسٹر کے ٹکڑے ٹوٹ ٹوٹ کر چبوترے پر بکھر جاتے تھے۔ خسر کے محل میں ہائے ہائے کی پکار اور دیور کے محل میں شیر کی ڈہکار۔۔۔۔ میری ماں بڑے شش و پنج میں مبتلا ہو گئیں۔

اس کے بعد میرے باپ کا محل کیسے بنا، اس کی روداد میری ماں کی زبان سے سن لیجئے۔

انہوں نے ایک روز مجھ سے کہا بیٹا جب میں تمہارے چچا کے گھر میں رہتی تھی ایک دن ایک ایسی ہلچل برپا ہوگئی کہ میں سمجھی آج میرا دم نکل جائے گا اور ہلچل کیسے ہوئی، یہ بھی سن لے۔

ایک دن تمہاری چچی، ساٹھن کا بے حد چست گھٹنا پہنے جب چبوترے کی سیڑھیوں پر چڑھنے لگیں تو اس قدر گھٹنے پر زور پڑا کہ وہ ان کے گھٹنے کے نیچے کوئی ایک بالشت بھر ادھڑ گیا۔ اتنے میں بدقسمتی سے تمہارے چچا ناوقت زنانے میں آ نکلے انہوں نے اپنی بیوی کا ادھڑا گھٹنا دیکھا تو بڑی تیزی کے ساتھ کمرے میں جا کر ایک بڑی لمبی سی چھری لے کر آ گئے تمہاری چچی کو چبوترے پر گرا دیا ان بیچاری کے سینے پر چڑھ بیٹھے اور کہا اے بے غیرت بھرے گھر میں ننگی پھر رہی ہے یہ کہتے ہی انہوں نے چھری اٹھائی کہ ان کا گلا کاٹ ڈالیں وہ تو اللہ نے یہ بڑی خیر کی کہ یہ ماجرا تمہاری دادی نے دیکھ لیا انہوں نے آ کر تمہارے چچا کی پیٹ پر، زور سے چھڑی مار کر کہا اسحٰق میرے سر کی قسم میری بہو کے سینے سے اتر آ بڑا غیرت دار بنا ہے۔

جب ماں نے قسم دی تو تمہارے چچا تمہاری چچی کے سینے سے اتر آئے اور چھری پھینک کر بڑبڑاتے ہوئے باہر چلے گئے۔

بیٹا یہ تماشہ دیکھ کر میں ادھموئی ہو کر رہ گئی اور جب تمہارے باپ گھر میں آئے میں نے سارا ماجرا بیان کر کے ان سے کہا، اگر آپ میری زندگی چاہتے ہیں تو خود اپنا مکان بنوا لیجئے نہیں تو میں ہول کھا کھا کے ایک دن مر جاؤں گی۔

اس کے بعد میرے باپ کا مکان تعمیر ہو گیا اور میری ماں نے اپنے مکان میں آ کر اطمینان کی سانس لی۔

میری ماں کو اس ناز و نعم سے پالا گیا تھا کہ وہ کھانا پکانا، سینا پرونا بالکل نہیں جانتی تھیں پکانا ریندھنا، یا سینا پرونا تو بڑی بات ہے ان کو پوری سو تک گنتی بھی نہیں آتی تھی اور یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ روپے میں کتنے پیسے اور آنے ہوتے ہیں ان کی خاص

مغلانیاں مو بیگم اور عباسی خانم ان سے مہینے میں دو دو اور کبھی تین تین بار تنخواہیں وصول کر لیتی تھیں اور ان کو پتہ نہیں چلتا تھا، اور جب کبھی وہ کہتی تھیں کہ مجھے تو یاد پڑتا ہے کہ میں پہلی کو تمہاری تنخواہ دے چکی ہوں تو وہ کہتی تھیں ہے ہے بیگم صاحب بھلا ایسا اندھیر ہو سکتا ہے کہ ہم تنخواہ پا چکنے کے بعد بھی پھر آپ سے تنخواہ مانگیں حضرت عباس کی قسم آپ کو دھوکا ہو رہا ہے تو میری ماں الٹی شرمندہ ہو کر رہ جایا کرتی تھیں ان امور پر نگاہ کر کے، میرے باپ نے گھر کا انتظام کبھی ان کے سپرد نہیں کیا اور میری دادی 1 جان گھر چلاتی رہیں۔

---

1 میری دادی آگرے کے اس ممتاز اور متمول گھرانے میں پیدا ہوئی تھیں جس کے محل کے چاروں طرف ایک بہت بڑا پائین باغ تھا اور اسی بناء پر اہل آگرہ اس باغ کو ''باغ والے'' کہا کرتے تھے دادی جان کے باپ کا نام غالباً مرزا نثار حسین بیگ تھا جن کے دادا ترکستان سے آ کر آگرے میں آباد ہو گئے تھے مرزا نثار حسین بیگ صاحب آگرے کے کوتوال تھے اور آگرے کی مشہور ''کوتوالی گلی'' آج تک ان کے نام سے مشہور ہے میں نے دادی جان کے حقیقی خالہ زاد بھائی مرزا خادم حسین صاحب رئیس اکبر آبادی کو لڑکپن میں دیکھا تھا وہ کڑھا انگرکھا پہنتے تھے، اور شانوں پر شالی رومال پڑا رہتا تھا حضرت رئیس بڑے وضع دار اور بڑی آن بان کے بزرگ اور آدھے شعرائے آگرہ کے مانے ہوئے استاد تھے آخر عمر میں ان کی جاگیرداری پر زوال آ گیا تھا مگر رکھ رکھاؤ میں ذرہ بھر کمی نہیں آئی تھی ایک بار کسی نے ان کے سامنے مرزا غالب کا ذکر کیا تھا تو انہوں نے کہا تھا کہ غالب کو مجھ سے زیادہ کون جان سکتا ہے اس لئے کہ وہ میرے قرابت داروں میں سے تھے۔۔۔۔۔ دادی جان کو ہزاروں کہاوتیں اور فارسی و اردو کے ہزاروں اشعار یاد تھے جنہیں وہ بامحل صرف کیا کرتی تھیں اور جب ہم سب بھائی بہن دسترخوان پر بیٹھتے تھے وہ ہمارے ساتھ آ کر بیٹھ جاتیں اور کھانے کے آداب بتایا کرتی تھیں اور جب ہم میں سے کوئی غلط لفظ بول اٹھتا

تھا تو وہ منہ پر تھپڑ مار دیا کرتی تھیں وہ بیحد راسخ العقیدہ شیعہ تھیں اور جب وہ چپکے چپکے مجھ کو شیعیت کا درس دیا کرتی تھی تو میری پھپھی جو میرے چچا کی طرح کٹر سنی تھیں ان سے ہنس کر کہا کرتی تھیں اماں پوتے کو شیعہ نہ بنایئے تو وہ بگڑ کر کہتی تھیں چل چخ مردار خارجن آخر گھر میں کوئی تو ایسا ہو جس کا فاتحہ درود مرنے کے بعد مجھ تک پہنچ سکے۔

ان میں اس قدر زبردست انتظامی قوت تھی کہ وہ ایک سلطنت کا کام چلا سکتی تھیں۔

میری ماں کو شاعری سے بڑی دلچسپی اور امیر انیس سے بڑی محبت تھی اور ان کے مرثیے پڑھ پڑھ اور سن سن کر رویا کرتی تھیں۔

ہم سات بھائی بہن تھے یعنی افسر جہاں بیگم 1، شفیع احمد خاں، شبیر احمد خاں (بعد کو شبیر حسن خاں جوش) انیس جہاں بیگم، رئیس احمد خاں، حشمت جہاں اور شوکت جہاں۔۔۔۔لیکن ہم سات بھائی بہنوں میں میری ماں مجھے سب سے زیادہ چاہتی تھیں، اوروں کی خدمت گزاری بوا گلزار کے سپرد تھی لیکن میرے ناشتے کا دودھ، شہد اور جلیبیاں ملا کر وہ اپنے ہاتھ سے تیار کر کے مجھ کو آواز دیا کرتی تھیں، ننھے آ، تیرا دودھ تیار ہے۔

ابھی کوئی ایک ہفتہ کی بات ہے کہ صبح کو میری بیوی نے مجھ سے پکار کر کہا اے ہے کب تک اچھل کود (ورزش) کرتے رہو گے، تمہارا دودھ ٹھنڈا ہو رہا ہے بیوی کی یہ آواز سن کر مجھے اپنی ماں یاد آ گئیں دل پر بجلی گر پڑی اور آنکھوں سے آنسوؤں کا چشمہ جاری ہو گیا۔

میری پیاری ماں، آپ سو چکی ہیں اور میں ابھی تک جاگ رہا ہوں زندگی کی رات کس قدر بھیانک ہے یہ آپ سے کیوں کر بتاؤں۔۔۔۔اماں آپ کا ''ننھا'' اب بوڑھا ہو چکا ہے اور اب اس کو ''ابا'' اور ''نانا'' کے ناموں سے پکارا جا رہا ہے۔

کاش! میں آپ کے سامنے مر جاتا اور یہ دن نہ دیکھتا۔

میری اچھی ماں اب مجھے اپنے پاس بلا لیجئے اور اے اللہ اب مجھ کو اس دنیا سے اٹھا لے۔

سر گھوم رہا ہے، ناؤ کھیتے کھیتے
اپنے کو، فریب عیش دیتے دیتے
اف کار حیات، تھک گیا ہوں معبود
دم ٹوٹ چکا ہے، سانس لیتے لیتے!

---

1 صدصیف، افسر جہاں بیگم، شفیع احمد خاں اور حشمت جہاں کا انتقال ہو چکا ہے۔

☆☆☆

میرے چچا

نام تھا نواب محمد اسحٰق خان ''کسمنڈی'' کے تعلقہ دار اور بڑے رعب و داب کے بے حد اکھڑ پٹھان تھے آواز اس قدر بھاری تھی کہ سننے والوں کے کلیجے شق ہو جائیں مزاج میں اس قدر زبردست غصہ تھا کہ جب بگڑ جاتے تو بے تحاشہ گالیاں دینے اور بکنے لگتے تھے اور یہ بھی خیال نہیں رہتا تھا کہ بھائی بھتیجے بھانجے، بیٹے بیٹھے ہوئے ہیں۔

وہ میرے باپ کے حقیقی بڑے بھائی اور ان سے عمر میں اتنے بڑے تھے کہ میرے باپ نے ان کی بیوی کا دودھ پیا تھا۔ مزاج میں وہ میرے باپ کے بالکل برعکس تھے۔ علم و ادب اور تہذیب سے انہیں کوئی سروکار نہیں تھا میرے باپ تفضیلی اور وہ بیحد کٹر سنی خلیفہ اول کو تمام اصحاب پر ترجیح دیتے تھے۔

جب ان کے علم میں یہ بات آئی کہ میں شیعہ ہو گیا ہوں تو انہوں نے مجھے اس نیت سے اپنے گھر بلایا کہ میری مرمت کر دیں مجھے دیکھتے ہی انہوں نے گرج کر کہا:

سب کے سر تاج بعد پیغمبر
یعنی بوبکر، افضل و برتر

پوچھا کیسا شعر ہے میں نے کہا بڑے باوا اچھا، میرا جواب سن کر وہ بھنچے ہوئے غصے کے ساتھ منہ سے آوازیں نکالنے لگے ہوں، ہوں، ہوں، وہ معمولی آواز کی ''ہوئیں'' نہیں بڑی گھڑ گھڑاتی، اور طویل الصوت ''ہوئیں'' تھیں۔'' جن کے یہ معنی تھے کہ اگر اس شعر کے خلاف کچھ کہو گے تو مزا چکھا دوں گا لیکن میں بے وقوف نہیں تھا کہ ان کو موقع دے دیتا اس لئے ٹال کر چلا آیا۔

میری دادی جان، میرے باپ کے ساتھ رہتی تھیں اور وہ ہر جمعرات کو ان سے ملنے آیا کرتے تھے ایک روز رئیس احمد انگنائی میں کھیل رہا تھا کہ وہ دادی کے سلام کی خاطر آ گئے رئیس احمد سے انہوں نے کہا آؤ میرے ساتھ، اماں کو سلام کرنے کے بعد تم

کو گھر لے جا کر خوب برفی کھلاؤں گا وہ دادی کو سلام کر کے بیٹھ گئے اور رئیس کو گھٹنے پر بٹھالیا۔

دادی جان نے باتوں باتوں میں کہا بیٹا اسحٰق یہ بو کیسی آ رہی ہے، انہوں نے کہا اماں یہاں تو کسی قسم کی بو نہیں ہے دادی نے اپنی لونڈی سے کہا سکونت کیا تجھے بھی بو محسوس نہیں ہو رہی ہے اور جب سکونت نے بھی یہی کہا کہ بی بی مجھ کو تو بو نہیں آ رہی ہے تو دادی نے ناک پر آنچل کا سرا رکھ کر کہا افوہ بو بکر

یہ سنتے ہی چچا جامے سے باہر ہو گئے رئیس کو گھٹنے سے نیچے گرا دیا اور کہا اماں آپ تبرا بازی کر رہی ہیں یہ کہہ کر انہوں نے فرش پر دھم سے ڈنڈا مار کر کہا اماں دم چار یار دم 1 چار یار یہ سنتے ہی دادی نے کڑک کر کہا بیٹا دم پنجتن دم پنجتن اور وہ دم چار یار دم پنجتن کے نعرے اس قدر بلند ہو گئے کہ مردانے تک آواز پہنچی میرے باپ گھبرائے اندر آئے کہ یہ ''دم چار'' اور ''دم پنجتن'' کیا ہو رہا ہے۔

میرے باپ کے آتے ہی بڑے باوا غصے میں کانپتے کھڑے ہو گئے اور کہا بشیر تم دیکھ رہے ہو کہ اماں تبرے بازی کر رہی ہیں کیا کروں ماں ہو پڑیں، کوئی اور کہتا تو خون چوس لیتا ابھی وہ یہ کہہ ہی رہے تھے کہ سامنے سے مرغی گزرنے لگی۔

---

1 یعنی میں چار یار کا دم بھرتا اور ان کی برتری کا نعرہ لگاتا ہوں۔

انہوں نے مرغی کی ٹانگیں چیر کر پھینک دیں اور فوراً میرے گھر سے کانپتے ہوئے رخصت ہو گئے۔

ہنگامہ 1857ء کے بعد، فرنگی حکومت نے ایک سخت مزاج کمشنر کو، جس کا نام شاید ہیولاک تھا اس امر پر مامور کیا تھا کہ وہ روہیل کھنڈ اور ملیح آباد کے پٹھانوں کو ڈرائے اور ان کے دلوں پر انگریزی حکومت کے رعب کا سکہ بٹھائے۔۔۔۔۔ دورہ کرتا جب وہ ملیح آباد آیا، تو میرے دادا کی مخالف پارٹی نے اس سے کہا کہ نواب محمد اسحٰق خان کے سپاہیوں میں بہت سے بدمعاش اور ڈاکو شامل ہیں اور جب چچا اس

سے اپنے سپاہیوں کے لشکر کے ساتھ ملنے گئے تو کمشنر نے ان سے کہا ''دل کھان صاحب آپ کا سپاہی لوگ بد ماس (بدمعاش) اور ڈاکو ہے یہ سنتے ہی انہوں نے بڑے زور سے ڈانٹ کر کہا ابے تو بدمعاش ہے تو ڈاکو ہے، میں ابھی تیری اور تیری میمنی (میم) کی۔۔۔ پھاڑ کر رکھ دوں گا۔ اور کھانچی 1 بھر ہگا دوں گا'' یہ کہہ کر وہ اس کی طرف جھپٹے وہ گھبرا کر خیمے سے نکل گیا اور گھوڑی پر بیٹھ کر لکھنو بھاگ گیا۔۔۔۔ اور لکھنو جاتے ہی اس نے ملیح آباد کے تھانے کے انچارج کو تار دیا کہ چچا کے تمام اسلحہ ضبط کر لئے جائیں۔۔۔۔ تھانے دار کے پاؤں کے نیچے سے زمین نکل گئی وہ سیدھا دادا میاں کی ڈیوڑھی پر گیا۔ دادا میاں محل کے اندر جا چکے تھے اس نے ان کے منہ چڑھے خدمت گار رحم علی کی ٹھڈی میں ہاتھ ڈال کر کہا مجھ پر ایک بہت بڑی مصیبت آ گئی ہے میں اس وقت بڑے خاں صاحب سے ملنا چاہتا ہوں، خدا کے واسطے میری خبر کر دو۔۔۔۔ رحم علی کو ترس آ گیا، اس نے فوراً ماما کے ذریعہ سے خبر کر دی دادا میاں نے پردہ کرا کے اس کو اندر بلا لیا۔

تھانے دار ان کے قدموں پر گر پڑا اور کہا خاں صاحب بہادر میری جان بچا لیجئے چھوٹے خان صاحب (میرے چچا) کے اسلحہ ضبط کر لینے کا مجھے کمشنر نے تار دیا ہے حضور مدد کر دیں گے تو میری جان اور نوکری بچ جائے گی۔

---

1 بہت بڑا خرپڑے کا ٹوکرا (یہ ان کا تکیہ کلام تھا وہ جب کسی کو ہگاتے تو کھانچی بھر ہگاتے تھے)

دادا میاں نے چچا کو بلا کر کہا اسحٰق میرے سر پر ہاتھ رکھو چچا نے ان کے سر پر ہاتھ رکھ دیا تو انہوں نے کہا ان تھانے دار کو کمشنر نے تار دیا ہے کہ تمہارے اسلحہ ضبط کر لئے جائیں اس میں ان کی کوئی خطا نہیں میرے سر کی قسم انہیں کوئی گزند نہ پہنچانا۔

انہوں نے تھانے دار سے کہا آیئے میری طرف اور لے جایئے ہتھیار۔۔۔۔۔ اس کے بعد بیٹھ کے میں ایک بڑی سی میز پر تمام اسلحہ چن دیئے گئے،

سب سے پہلے انہوں نے بندوق اٹھائی، اس کو فرش پر رکھا، اور اس پر پانچ جوتے مارے، اور تھانے دار کی طرف یہ کہہ کر بندوق پھینک دی کہ لیجئے اس کو اپنی ماں کی۔۔۔۔ میں رکھ لیجئے اور اسی طرح، ایک ایک کر کے، تمام اسلحہ پر پانچ پانچ جوتے مار کر اور اسے بھی اپنی ماں کی۔۔۔۔ میں رکھ لیجئے کہہ کہہ کر انہوں نے تمام ہتھیار واپس کر دیئے اور گالیاں کھایا ہوا تھانے دار سلام کر کے رخصت ہو گیا۔

ان کو جب غصہ آتا تھا تو بقدر شدت غضب وہ دیر تک اس قابل نہیں رہتے تھے کہ بات کر سکیں اس عالم میں وہ اپنے دونوں ہاتھ کی انگلیوں کو باہم پیوست کر کے، اپنے دونوں انگوٹھوں کو اٹھا لیتے اور ایک دائرے کی صورت میں ایک دوسرے کے گرد گردش دینے لگتے تھے اور جب تک ان پر یہ کیفیت طاری رہتی تھی کوئی ان کے پاس آنے یا ان سے بات کرنے کی جرأت نہیں کرتا تھا۔

ایک روز وہ کسی کو گالیاں دینے کے بعد اپنے انگوٹھوں کو گھما رہے اور تمام حاضرین ان کے کمرے سے نکل کر برآمدے میں لرزاں و ترساں کھڑے ہوئے تھے کہ ایک ڈپٹی کلکٹر صاحب ان سے ملنے کے واسطے آ گئے، ڈپٹی کلکٹر صاحب سے کوئی یہ کہنے کی جرأت نہ کر سکا کہ فرط غضب کی بناء پر خاں صاحب کے انگوٹھے گھوم رہے ہیں اس وقت ان کے پاس نہ جایئے۔

چنانچہ ڈپٹی صاحب ان کے کمرے میں داخل ہو گئے داخل ہوتے ہی انہوں نے کہا آداب عرض خاں صاحب" چچا جان نے، ان کی طرف گھور کر دیکھا بول سکنے کی طاقت نہیں تھی سلام کا جواب نہیں دیا اور "ہوں" کر کے اور تیزی سے انگوٹھے گھمانے لگے، ڈپٹی نے بڑے غور سے ان کو دیکھا اور سوچنے لگا کہ آخر یہ ماجرا کیا ہے کہ انہوں نے میرے سلام کا جواب نہیں دیا اور یہ کیا تماشہ ہے کہ ان کے انگوٹھے برابر گھوم رہے ہیں اور دو ایک منٹ کی حیرانی کے بعد جب اس نے پھر کہا "خاں صاحب مزاج کیسا ہے؟" ۔۔۔۔۔ تو انہوں نے اپنی رانوں کی طرف اشارہ کر کے کہا" "

لے۔۔۔۔۔۔۔'' مزاج پرسی کا یہ انوکھا جواب سن کر وہ دفعتاً اٹھ کھڑا ہوا اور تنتناتا کمرے سے باہر نکل گیا۔

ایک بار ہمارے گھر میں مشاعرہ ہونے والا تھا لکھنو کے مشاہیر میرے باپ کے کمرے میں بیٹھے ہوئے تھے کہ ماں کو سلام کرنے کے لئے چچا جان کھڑکی سے نکل کر ہمارے صحن میں آ گئے اور میرے باپ کے گرد لوگوں کا ہجوم دیکھ کر ان کے کمرے میں چلے آئے میرے باپ کھڑے ہو گئے ٹوپی پہن لی حقہ سامنے سے ہٹا دیا گیا انہوں نے پوچھا بشیر یہ کون لوگ ہیں بتاؤ میرے باپ نے کہا میاں بھائی یہ لکھنو کے شعراء ہیں آپ ہیں مولانا صفی، آپ ہیں حضرت عزیز، آپ ہیں حضرت محشر، آپ ہیں حضرت آرزو، آپ ہیں حضرت ابر، آپ ہیں محمد صاحب بہار اور آپ ہیں حکیم منے آغا صاحب فاضل۔

چچا جان نے کہا مولانا صفی، سنتا ہوں آپ شاعر لوگ یہ باندھتے ہیں کہ معشوق کے کمر ہی نہیں ہوتی کیا یہ سچ ہے، مولانا صفی نے کہا جی ہاں خاں صاحب شاعری میں معشوقوں کی کمر کو معدوم و موہوم کہا جاتا ہے، اس پر چچا نے کہا اب ہم آپ سے یہ پوچھتے ہیں کہ اگر معشوقوں کی کمر ہوتی ہی نہیں تو پھر شب وصل میں وہ کیا چیز ہوتی ہے جس کو دونوں ہاتھوں سے پکڑ کر آپ لوگ چخ چخ چخ چخ کرتے رہتے ہیں؟ ان کے اس سوال سے تمام شعراء دنگ ہو کر رہ گئے اور میرے باپ کی پیشانی سے پسینے کی بوندیں ٹپکنے لگیں۔

ایک بار ان کے خلف اکبر وصی احمد خاں، ایک ابتدائی قسم کا گراموفون لے کر آئے اور کہا باوا اس باجے سے آدمیوں کی آوازیں آتیں اور گانا سنائی دیتا ہے میں آپ کو سنانے آیا ہوں، انہوں نے کہا یہ عجیب چیز لائے ہو، سناؤ۔

انہوں نے باجا بجایا تو اس سے بڑی مدھم گانے کی آوازیں آنے لگیں، اور جب وہ تیسری چوڑی چڑھانے لگے تو بڑے باوا نے فرمایا ہٹاؤ اس سالے باجے کو اس سے

تو ''چری پھٹی'' ''چری پھٹی'' ''چری پھٹی'' کی آوازیں آ رہی ہیں آئندہ مجھ کو یہ فحش باجا نہ سنانا، ورنہ ڈنڈا۔۔۔گھسیڑ دوں گا۔

اور جب وصی احمد بھائی کھسیانے ہو کر باجہ اٹھنے لگے، تو بڑے باوا نے ڈنڈا مار کر اس کو توڑ ڈالا۔

ایک مرتبہ وصی احمد بھائی سوٹ پہن کر اپنی فرنگی معشوقہ سے ملنے کے لئے لکھنو جا رہے تھے ابھی وہ احاطے کو طے ہی کر رہے تھے کہ معلوم نہیں کیا بات ہوئی کہ بڑے باوا، خلاف وقت و معمول مردانے میں نکل آئے اور ان کی پشت دیکھ کر، سپاہیوں سے پوچھا یہ کون فرنگی جا رہا ہے، سپاہیوں کو یہ بتانے کی جرأت نہیں ہوئی کہ آپ کے فرزند اکبر وصی احمد خان ہیں، لیکن بڑے باوا نے جب ڈانٹ کر پوچھا تو انہوں نے ڈرتے ڈرتے بتا دیا کہ حضور یہ وصی احمد خان ہیں، بڑے باوا نے ڈانٹ کر آواز دی پلپلی صاحب ادھر آیئے۔ وصی احمد بھائی اچھل پڑے رنگ زرد ہو گیا سر جھکائے ہوئے آئے بڑے باوا نے فرمایا کہ آپ پٹھان ہو کر ایسے بے غیرتی کے ننگے کپڑے پہنتے ہیں جب آپ پھاٹک کی طرف منہ کئے جا رہے تھے تو میں نے دیکھا کہ آپ کے سرین ط، ظ، ط ظ، کرتے اوپر نیچے آ جا رہے ہیں تھوک ہے آپ کی پٹھنولی پر جایئے۔۔۔۔میں آپ کو عاق کرتا ہوں، ہر چند آپ فرزند اکبر ہیں مگر میں آپ کو نہیں آپ کے چھوٹے بھائی کو اپنا جانشین بناؤں گا۔۔۔جایئے، اور اب بڑے مزے سے اپنے سرینوں کو طوئے ظوئے، طوئے، ظوئے، طوئے ظوئے کرتے پھریئے۔

☆☆

میری بیوی

اشرف جہاں بیگم، میرے دادا کے مختلف البطن، چھوٹے بھائی، نواب محمد نسیم خان بہادر، تعلقہ دار سہلاموکے فرزند محمد مقیم خان کی بیٹی، اور سالمہ بیگم کی نواسی ہیں۔

صائمہ بیگم کا ذکر اس لئے ضروری ہے کہ میری بیوی کا مزاج سمجھنے میں اس سے بڑی مدد ملے گی۔

صائمہ بیگم میرے اور میری بیوی کے پردادا نواب فقیر محمد خان بہادر کی نہایت شعلہ مزاج، اور چہیتی بیٹی تھی اور باپ نے اس خیال سے کہ بڑے محل میں ان کی شعلہ مزاجی کی بناء پر کوئی ہنگامہ نہ ہو۔ انہیں ''منجھلا محل'' دے دیا تھا، کہ وہاں وہ بلا شرکت غیرے آرام سے رہیں۔

صائمہ بیگم کی غیرت کا یہ عالم تھا کہ ان کے کپڑے دھوبی کے وہاں نہیں جاتے تھے، دھوبن ان کو گھر ہی میں دھوتی اور استری کر دیا کرتی تھی،

ان کا کھانا تو منجھلے محل ہی میں پکتا، لیکن ان کا ناشتہ، ایک روپیوں اور اشرفیوں سے بھرے ہوئے تھال کے ساتھ بطور جیب خرچ، باپ کے گھر سے آیا کرتا تھا جس کو وہ چاندی اور سونے کی آمیزش کی بناء پر ''کھچڑی'' کہا کرتی تھیں۔

چونکہ ان کے دو تین بچے سنور ہی میں جا سکے تھے، اس لئے اپنی مغلانیوں، اماؤں، اصیلوں، اور لونڈیوں باندیوں کے متعلق انہیں یہ بدگمانی پیدا ہوگئی تھی، کہ ہو نہ ہو، ان میں کوئی ''ھنہیا1'' ضرور ہے۔

اور جب تیسرے یا چوتھے بچے کی ولادت ہوئی تو انہوں نے محل کے تمام دروں میں پردے جھڑوا دیئے اور زچہ خانے کے دروازے پر عورتوں کا پردہ بٹھا دیا کہ مخصوص ماماؤں کے سوا اور کوئی اندر نہ آ سکے۔

اسی اثناء میں ایک متجسس مزاج کمسن لونڈی نے ان کے بچے کو ایک نظر دیکھنے کی خاطر کوٹھے پر دبے پاؤں چڑھ کر جیسے ہی کھڑکی کا پٹ کھول کر جھانکا، صائمہ بیگم کی نگاہ

اس پر پڑ گئی، انہوں نے جھٹ سے بچے کے منہ پر پلو ڈال کر، فوراً یہ حکم دیا کہ اس کلموئی ٹھہیا کو زندہ دفن کر دیا جائے اور اسے چاری لونڈی کو محل کے ایک گوشے میں قد آدم گڑھا کھود کر دفن کر دیا گیا۔

اس انتہائی ظالمانہ حادثہ کے بعد ایک روز ان کے شوہر نے جو اودھ کی فوج کے عہدہ دار تھے جب لکھنو جانے کی اجازت طلب کی تو انہوں نے کہا آج نہیں، پرسوں جانا، شوہر نے کہا ایک ایسا سرکاری کام ہے کہ مجھے آج ہی جانا ہے، انہوں نے کہا، میں آج تو ہرگز جانے نہیں دوں گی، شوہر نے کہا بیگم مجھے تو آج ہی جانا ہے اتنا کہہ کر وہ محل سے نکل گئے صائمہ بیگم نے کسی لونڈی کو حکم دیا کہ سل اٹھالائے وہ سل اٹھالائی اور سل انہوں نے اپنے سینے پر اس قدر زور سے ماری کہ پل بھر میں روح پرواز کر گئی:

دیدی کہ خون نا حق پروانہ شمع را
چنداں اماں نہ داد کہ شب را سحر کند

محل میں رونا پیٹنا ہونے لگا، ان کے شوہر نے وہ آہ و بکا کی آواز سنی، گھوڑے سے کود پڑے اور جب محل میں قدم رکھتے ہی انہیں بیوی کی خودکشی کا حال معلوم ہوا، تو پستول نکال کر سینے پر مار لیا۔۔۔۔اور بیوی کی چارپائی کے پاس ہی گر کر دم توڑ دیا۔

---

1 وہ عورت جو ٹونے ٹوٹکے سے بچوں کو ہلاک کر کے ان کا کلیجہ نظروں ہی نظروں میں چبا ڈالتی ہے۔

یہ ہے میری بیوی کے مزاج کا پس منظر۔۔۔۔۔وہ بہمہ وجوہ صائمہ بیگم ہیں اس لئے جب ان کو غصہ آجتا ہے تو جان لینے اور جان دینے پر اتر آتی ہیں۔

میں اب تک زندہ ہوں، میری سخت جانی کا یہ معجزہ ہے وہ کبھی سیدھے منہ بات نہیں کرتیں، میری بیٹی سعیدہ، میرا بیٹا سجاد، اور ان دونوں کے بچے ان سے ڈرتے ہیں اور چونکہ وہ بچوں کو ہر آن ڈانٹتی ڈپٹتی، گھرکتی اور بات بات پر بدتمیز کہتی رہتی ہیں اس لئے وہ ان کے پاس آنے جانے سے گریز کرتے ہیں۔

جب مکانوں کے سقف و بام سے آوازیں اگلوا لینے والا کوئی آلہ ایجاد ہو جائے گا تو میرا سارا مکان ''بدتمیز، بدتمیز'' کی آوازوں سے گونجنے اور کانپنے لگے گا۔

یہ میرا دعویٰ ہے کہ اس پورے کرۂ ارض کا کوئی شخص خواہ وہ کتنا ہی ماہر نفسیات، یا ماہر نفسیات کا باوا ہی کیوں نہ ہو اس امر کا کبھی اندازہ لگا ہی نہیں سکتا کہ وہ کب اور کس بات پر ہنسیں اور کس بات پر جامے سے باہر ہو جائیں گی۔

کون ان کے مزاج کو پرکھ یا پکڑ سکتا ہے۔۔۔۔۔ میں ہزاروں بار تجربہ کر چکا ہوں کہ ایک روز میرے جس لطیفے پر وہ خوب جی بھر کے ہنسی تھیں، جب میں نے ان کو وہی لطیفہ دوبارہ سنایا تو ان کی آنکھوں میں خون اتر آیا، اور کہنے لگیں بھاڑ میں جائے یہ بھی کوئی لطیفہ ہے۔۔۔۔ میرے سامنے ایسی باتیں نہ کہا کرو۔

ہر چند میں نے اپنے معاملات عشق امکانی حد تک ان سے مخفی رکھے تھے لیکن وہ جو کہتے ہیں کہ عشق اور مشک چھپ نہیں سکتے، میرے دو ایک اور خصوصیت کے ساتھ، میرے آخری عشق کے معاملات اڑتے اڑتے ان تک پہنچ گئے تھے، اور انہوں نے مجھے ایک کمرے میں قید کر کے جو جو ستم مجھ پر ڈھائے تھے ان کی شرح اب بیکار ہے کہ:

سفینہ اپنا کنارے جب آ لگا غالب
خدا سے کیا ستم و جور ناخدا کیجئے

لیکن اب بھی جب کہ میں کم بخت بوڑھا ہو چکا ہوں وہ کم سے کم مہینے میں چار پانچ بار عین اس وقت جب کہ آفتاب غروب ہونے کے بعد میں طلوع ہونا شروع کرتا ہوں وہ مجھے بڑی شدت کے ساتھ میری عاشقی پر طعن و تشنیع کا ہدف بنایا کرتی ہیں میں دانت نکال نکال کر کہتا ہوں ارے اشرف جہاں میں دن بھر کا تھکا ماندہ اس وقت پینے اور جینے بیٹھا ہوں اس وقت تو گڑھے مردے نہ اکھیڑو، اس وقت، میری غلطی سے ہو گیا سو ہو گیا، ارے اب تو اس پر خاک ڈالو، بھول جاؤ، معاف کر دو، لیکن میری

گڑگڑاہٹوں کا ان پر کوئی اثر نہیں پڑتا اور مجھے لگاتار برا بھلا کہتی رہتی ہیں وہ سلسلہ اس قدر طویل اور روح فرسا ہوتا ہے کہ میں تلملا اٹھتا ہوں، کبھی کبھی جلدی جلدی چار پیگ زہر مار کر کے اور اوندھے سیدھے دو چار لقمے کھا کر اور کبھی کھانا کھائے بغیر ہی خواب گاہ کی طرف بھاگتا اور بستر پر جا کر لیٹ جاتا ہوں مگر وہاں بھی وہ میرا پیچھا نہیں چھوڑتی ہیں اور خواب گاہ میں داخل ہو کر وہی سلسلہ شروع کر دیتی ہیں۔

اثنائے ملامت میں جب وہ پان دان کھول کر پان بنانے لگتی ہیں تو میں یہ سوچ کر خوش ہو جاتا ہوں کہ اب تبرے بازی ختم ہو جائے گی اور میں کم بخت سو سکوں گا لیکن وہ وقفہ خاموشی قبل از طوفان بن جاتا ہے اور گلوری منہ میں رکھ کر وہ اپنی ملامت کی بندوق میں نئے کارتوس بھر کر مجھ پر دوبارہ گولیاں برسانے لگتی ہیں۔

اس طرح وہ بار بار پان بناتیں اور دو ایک منٹ خاموش رہ کر پھر تبرا شروع کر دیتی ہیں میں بار بار کروٹیں بدلتا ہوں اور وہ ہر بار، ٹھہر ٹھہر کر طعن و تشنیع کے بالکل نئے نئے گوشے نکال کر'' آتے ہی غیب سے یہ مضامیں خیال میں کا ثبوت دیتی رہتی ہیں۔''

شاید کسی نے یہ شعر میرے ہی واسطے کہا تھا:

آ کر سر مزار وہ کیا کیا نہ کہہ گئے
ہم نے نہ کچھ جواب دیا چپ پڑے رہے

اور بالآخر مشکلیں اتنی پڑیں مجھ پر کہ آساں ہو گئیں کے زیر اثر میں تڑپ تڑپ کر سو جاتا نہایت بھیانک خواب دیکھنے لگتا اور صبح کو اس زخمی چوہے کی طرح بیدار ہوتا جس سے جی بھر کر بلی کھیل چکی ہو۔

اب ان کے مزاج کی چند خصوصیات اور بھی سن لیجئے۔

پہلی خصوصیت تو یہ ہے کہ وہ اپنی ہر بدگمانی، ہر وسوسے، ہر قیاس، ہر ظن، اور ہر واہمے کو ایک حقیقت کبریٰ اور روحی و الہام کا مرتبہ دے دیتی ہیں۔

مثلاً جب کسی نواسے یا پوتے کو وہ کوٹھے سے پکارتی ہیں اور وہ بچہ آواز پر آواز نہیں

دیتا تو یہ جانچے بغیر کہ وہ اس وقت مکان میں ہے کہ نہیں، یا کسی ایسے دور کے گوشے میں ہے جہاں تک آواز نہیں پہنچ سکتی ان کو اس بات کا یقین اور یقین کامل ہو جاتا ہے کہ بیٹی یا بیٹے نے اپنے بچوں کو ہدایت کر دی ہوگی کہ وہ میری آواز پر آواز نہ دیں، اور یہ سوچ کر وہ بیٹی اور بیٹے پر برس پڑتی ہیں اور وہ سلسلہ دیر تک قائم رہتا ہے۔

یعنی ان کے دل میں جب کسی امر کے متعلق ایسا ہوا ہوگا کا خیال پیدا ہو جاتا ہے تو اس کے ہمیشہ یہ معنی ہوتے ہیں کہ یقیناً ایسا ہو چکا ہے اور اس کے سوائے کچھ اور ہو ہی نہیں سکتا۔

یوں تو میں بالعموم پچھلے پہر بیدار ہوتا ہوں لیکن مہینے میں کبھی ایک آدھ بار کسی نا معلوم سبب کے باعث، جب میں دیر سے جاگتا ہوں تو اس غم میں سر پکڑ کر بستر پر بیٹھ جاتا ہوں کہ آج میں جلوہ ہائے طلوع صبح سے محروم ہو کر رہ گیا اور وہ جب مجھے اس عالم میں دیکھتی ہیں تو ان کے دل میں یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ میں نے اپنی معشوقہ کو خواب میں دیکھا ہوگا اور چونکہ ''دیکھا ہوگا'' کے یہ معنی ہوتے ہیں کہ میں ''دیکھ چکا ہوں'' وہ مجھ سے بگڑ کر کہتی ہیں اب بھی تم خوابوں میں اس کلموئی کو دیکھا کرتے ہو، اللہ تم کو غارت کرے کیا اب بھی مجھے چین سے نہیں رہنے دو گے؟''

ان کی دوسری خصوصیت یہ ہے کہ جب وہ صبح کو بیدار ہوں، اس وقت کوئی شخص بلند آواز سے نہ بولے اگر اس وقت کوئی بلند آواز سے بول دیتا ہے تو اس کی شامت آ جاتی ہے۔

چھوٹے دادا کو بلند آواز سے بولنے کا مرض تھا، اور میری بیوی سب سے زیادہ ان کو جھڑکیاں دیا کرتی تھیں اور وہ میرے پاس منہ پھلائے آتے اور کہا کرتے تھے بھائی شبیر حسن خاں تمہاری بیوی نے تو ناطقہ بند کر رکھا ہے۔

ان کی تیسری خصوصیت یہ ہے کہ ایک بار انہوں نے جو چیز کسی جگہ رکھ دی ہے اب وہ چیز قیامت تک اسی جگہ رکھی جائے گی اور اگر کوئی اس چیز کو کسی دوسری جگہ رکھ

دے گا تو قیامت آجائے گی وہ صبح کو خواب گاہ سے نکل کر، برآمدے کے تخت کے جس گوشے پر سب سے پہلی مرتبہ آ کر بیٹھی تھیں روز اس گوشے پر آ کر بیٹھتی ہیں ہر چند گرمیوں کے موسم میں ادھر دھوپ آ جاتی ہے مگر وہ اپنی جگہ سے نہیں ہٹتیں اور جب میں کہتا ہوں دھوپ سے ہٹ کر سائے میں بیٹھ جاؤ تو وہ بگڑ کر کہتی ہیں یہ میری وضع کے خلاف ہے میں تمہاری طرح تو ہوں نہیں کہ روز ٹھور ٹھکانے بدلتی رہوں اگر میں اس قدر مستقل مزاج نہ ہوتی تو تمہارے سے ہرجائی کو آج تک نباہ ہی نہ سکتی تھی۔

ان کی تیسری خصوصیت یہ ہے کہ وہ دنیا کے کسی آدمی کو شریف نہیں سمجھتی کسی پر بھروسہ نہیں کرتیں اور یہی وجہ ہے کہ آج تک کسی عورت سے ان کا خلا ملا نہیں بڑھ سکا، وہ کہیں نہیں جاتیں اور کسی عورت کا اپنے وہاں آنا جانا پسند نہیں کرتیں۔

چوتھی خصوصیت یہ ہے کہ وہ بے ترتیبی کو برداشت نہیں کر سکتیں، چادروں کی شکنوں اور کرسیوں وغیرہ کے زاویئے درست کرتی رہتی ہیں۔

پانچویں خصوصیت یہ ہے کہ وہ ناشتہ کے بعد، کم سے کم، آدھ گھنٹے کے واسطے ہمیشہ لیٹ جاتیں اور منہ سے نہیں بولتی ہیں۔

چھٹی خصوصیت یہ ہے کہ وہ بیدار ہوتے ہی کراہتیں اور کہتی ہیں کہ آج طبیعت بہت خراب ہے ہڈی ہڈی ٹوٹی ہوئی ہے۔

اور اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ لڑکپن ہی سے اختلاج قلب میں بری طرح مبتلا ہیں میں نے لاکھوں علاج کر دیکھے مگر وہ بیچاری تن درستی سے آج تک محروم ہیں۔

اور ان کی چھٹی خصوصیت یہ ہے کہ وہ ہر روز ایک ایک پائی کا حساب لکھاتیں اور جب تک حساب نہ لکھ جائے ماہی بے آب کی طرح تڑپتی رہتی ہیں۔

جہاں تک کہ تدبیر منزل کا تعلق ہے ان کی سی منتظم اور سلیقہ مند عورت میری نظر سے آج تک نہیں گزری ہے۔

میں ایک لکھ لٹ انسان ہوں، اگر میری شادی ان سے نہ ہوئی ہوتی تو میں فاقے

کر کے مر جاتا۔

میں دس کروڑ گھوڑوں کی طاقت کا انجن ہوں، وہ اس سے چوگنی طاقت کا بریک ہیں اگر اس قدری قوی بریک نہ ہوتا تو میں اپنا انجن ہمالیہ سے ٹکرا کر اب تک کب کا پاش پاش کر چکا ہوتا۔

میں جب حیدر آباد دکن میں تھا وہ اپنے ماں باپ سے ملنے کے لئے تین مہینے کے لئے ملیح آباد چلی گئی تھیں ان تین مہینوں کا حال سن لیجئے۔

جب پہلی تاریخ کو تنخواہ ملتی تھی تو ساری تنخواہ، مہمان نوازیوں اور اللوں تللوں کی وجہ سے دسویں پندرھویں دن ہی ختم ہو جاتی تھی اور ہر پندرھویں کو رام لال بقال سے قرض لے کر، گھر کا کام چلایا کرتا تھا اور جب دوسرے مہینے کی پہلی تاریخ کو تنخواہ لے کر گھر آتا۔ رام لال کو اپنے برآمدے کی کرسی پر بیٹھا یا سوتا پاتا اور رام لال اپنا روپیہ مع سود کاٹ کر باقی رقم میرے حوالے کر دیا کرتا تھا۔ اور اسی کے ساتھ ساتھ میں نے بہت سی دکانوں میں کھاتے بھی کھول لئے تھے اور اس طرح چیزیں گھر لایا کرتا تھا گویا وہ سب آندھی کے آموں کی طرح مفت مل رہی ہیں اور مہینے کی پہلی یا دوسری کو جب ان دکانوں کے بل آتے تھے تو سر پکڑ کر رہ جاتا رام لال سے مزید قرض لے کر بل ادا کیا کرتا تھا۔

بیوی جب ملیح آباد سے آئیں تو گھر کا یہ رنگ دیکھ کر انہوں نے منہ پیٹ لیا اور تھوڑے ہی دن کے اندر انہوں نے پھر گھر کو درست کر کے رام لال بقال سے نجات دلا دی اور میرے سارے کھاتے بند کرا دیئے۔

ان کی سختی کا یہ عالم ہے کہ جب گھر سے جاتے وقت ان سے دس پانچ روپے مانگتا ہوں تو تین چار پیشیوں کے بعد دس مانگتا ہوں تو صرف پانچ دیتی ہیں، اور جب گھر پلٹتا ہوں تو پائی پائی کا حساب لکھا لیتی ہیں۔

ایک ایک قطرے کا مجھے دینا پڑا حساب

خون جگر، ودیعت مژگان یار تھا

مجھ کو مشاعروں سے نفرت ہے، اس کی پہلی وجہ تو یہ ہے کہ مجھے خلاف معمول دیر تک جاگنا پڑتا ہے اور میرے دماغ پر اس کا کم از کم دو تین دن تک بار رہتا ہے اور دوسری وجہ یہ ہے کہ مشاعروں میں زاغ و زغن کو اس یقین کے ساتھ کلام سنانا پڑتا ہے کہ مفہوم شعر تو الگ رہا سامعین الفاظ کا تک سمجھ نہیں سکیں گے اور اسی کے ساتھ ساتھ زاغ و زغن کا کلام سننا بھی پڑتا ہے۔

لیکن چونکہ میں اس قربانی کے بعد مشاعرے سے ایک ہزار روپیہ گھر لاتا ہوں وہ مجھے مشاعروں کی قربان گاہ پر چڑھا دیا کرتی ہیں اور مجھے قربان گاہ پر نہ چڑھائیں تو کیا کریں اس لئے کہ میری معاش بیحد محدود ہے۔

لگے ہاتھوں مشاعروں کے متعلق میری دو رباعیاں بھی سن لیجئے۔

ہوتی ہے، مشاعروں میں بو گھورے کی
حاجی بخش اللہ کی، میاں نورے کی
افسوس کہ اس عطر سخن کو اپنے
بھرتا ہوں میں شیشیوں میں قارورے کی

یہ بندہ، سر حشر، بجرم تشکیک
دوزخ کا سزا وار ہے؟ تیرے نزدیک
معبود، خطا ایک، سزا ہو سو بار
فدوی تو مشاعروں میں ہوتا تھا شریک

ابھی پانچ چھ برس کی بات ہے، جب میں عامل کالونی میں رہتا تھا اس وقت انہوں نے مجھ سے کہا تھا کہ تمہارا مزاج ایسا ہے کہ نوکری زیادہ دن تک نبھ نہیں سکے گی، اور نبھ بھی گئی تو جب پنشن پر علیحدہ ہو جاؤ گے تو یہ مکان چھن جائے گا اس لئے

میں چاہتی ہوں کہ اپنا ایک ذاتی مکان بنوالوں، یہ سن کر میں نے کہا تھا کہ اب تو میر امقبرہ بننے کا زمانہ ہے تم مکان کی فکر کر رہی ہو۔

لیکن صاحب، میری بیوی کی ہمت پر صد آفریں کہ انہوں نے لاکھ ڈیڑھ لاکھ کا دو منزلہ مکان بنوا کر دم لیا ورنہ ایوب خان سابق صدر پاکستان اور ان کے نفس لوامہ الطاف گوہر صاحب کے عتاب کے بعد میں اپنے پورے قبیلے کے ساتھ آج کسی جھونپڑی میں پڑا ہوتا۔ سچ ہے سگھڑ بیوی بڑی دولت ہوتی ہے ان کا ایک کارنامہ اور بھی سن لیجئے۔

ایک روز انہوں نے مجھے کمرے میں بلا کر ایک دم بکس دکھایا اور کہا بتاؤ، اس میں کیا ہے؟ میں نے کہا مجھے کیا معلوم، انہوں نے پوچھا تم کب سے شعر کہہ رہے ہو میں نے کہا لڑکپن سے، انہوں نے کہا وہ پرچے اور کاپیاں کیا کیں جن پر تم نے شعر کہے تھے میں نے کہا سب کی سب تلف ہوگئیں میری یہ بات سن کر انہوں نے وہ بکس کھول کر کہا دیکھو میں نے تمہاری ایک ایک کاپی اور تمہارا ایک ایک پرچہ اس بکس میں محفوظ کرلیا ہے اب تم یہ کاپیاں ممتاز حسن صاحب کے قومی عجائب گھر کے ہاتھ فروخت کردو اور میں نے وہ کاپیاں پندرہ ہزار روپے میں فروخت کر دیں (میں اس باب میں مختار حسن صاحب اور پیر حسام الدین صاحب راشدی کا شکر گزار ہوں کہ اگر وہ توجہ نہ کرتے تو یہ سودا کبھی نہ ہوسکتا)

کہاں تک اپنی بیوی کی خوش انتظامی بیان کروں آموں کے چار باغ انہوں نے نصب کرائے اور 1921ء میں انہوں نے ٹھیل ٹھیل کر، مجھے مجبور کیا میری سب سے پہلی تصنیف ''روح ادب'' کے مرتب اور شائع کرانے پر اس کے بعد انہوں نے میرے سر پر مسلط ہو ہو کر میری مندرجہ ذیل کتابیں مجھ سے مرتب کرائیں اور چھپوائیں اگر وہ زبردستی نہ کرتیں تو یہ کتابیں کبھی معرض وجود میں آ ہی نہیں سکتی تھیں۔

روح ادب، جذبات فطرت، خیالات زریں، اوراق سحر، آوازہ حق، شاعر کی

راتیں، شعلہ و شبنم، حرف و حکایت، جنون و حکمت، آیات و نغمات، سیف و سبو، فکر و نشاط، سرود و خروش، حسین اور انقلاب، اشارات، سنبل و سلاسل، رامش و رنگ، عرش و فرش، سموم و صبا، قطرہ و قلزم، طلوع فکر، نجوم و جواہر، اور الہام و افکار[1]

اور میری یہ زیر کتاب ''یادوں کی برات[2]'' بھی انہیں کی مرہون منت ہے اگر وہ میرے سر پر سوار نہ ہو جاتیں تو میں اسے بھی مرتب نہ کر سکتا۔

اپنے ان متذکرہ بالا کارناموں کی بناء پر جب وہ حسب سنت جاریہ، مجھ سے

---

[1] میری مندرجہ ذیل کتابیں ہنوز شائع نہیں ہوئی ہیں ''مدوجزر'' آگ ''وحدت انسانی'' ''موت''، ''محمدؐ و آل محمد کی نگاہ میں ''موجد و مفکر'' عظمت انسانی اور ''حرف آخر'' اس طویل ڈرامائی نظم کا آغاز 1948ء میں ہوا تھا اس کے بعد مجھ کو زندگی کے مکروہات سے نجات نہیں ملی اس لئے ابھی تک نا تمام ہے اگر فرصت ہاتھ آئی تو اس نظم کو مکمل کر کے کسی بینک میں یا بیوی کے پاس رکھوا دوں گا کہ اسے میرے مر جانے کے بعد شائع کیا جائے اور یہ اس لئے کروں گا کہ اگر یہ اوہام شکن روایات فگن نظم میری زندگی میں شائع ہو گئی تو مجھ پر عرصہ حیات تنگ کر دیا جائے گا۔

---

[2] بیوی سے چھپا کر میں نے اس کتاب میں اپنے معاشقوں کا حال قلم بند کیا ہے اب دیکھئے اس کی طباعت کے بعد کیا ہوتا ہے۔

کسی بات پر، بگڑ جاتی ہیں تو کہتی ہیں کہ میری جوتیوں ہی کا طفیل ہے کہ تم اس وقت جوش صاحب بنے بیٹھے ہو اگر میں تم پر زور نہ ڈالتی تو تمہاری کوئی ایک کتاب بھی نہ چھپتی اور دنیا کو یہ معلوم بھی نہ ہوتا کہ تم کس کھیت کی مولی ہو۔

اور کبھی یہ بھی کہتی ہیں کہ جب مجھ سے تمہاری شادی ہوئی تھی، اس وقت تک، تم، چھوٹے دادا کی زبان میں لفا جھنا تھے اگر میں جی لگا کر تمہاری تاک نہ کرتی تو تم کو یہ ڈیل ڈول کبھی حاصل ہی نہ ہوتا، اور ہمیشہ دبلے پتلے لقات ہی بنے رہتے۔

ہر چند، جیسا کہ اوپر لکھ چکا ہوں وہ نہایت مغلوب الغضب اور تنک مزاج ہیں،

لیکن میری ذات کے ساتھ اب بھی ان کی محبت کا یہ عالم ہے کہ اگر میں اسے لفظ عشق سے منسوب کروں تو اس کے یہ معنی ہوں گے کہ میں ان کی محبت کی تخفیف و توہین کر رہا ہوں۔

جوانی میں جب میں، باہر سے، رات کے وقت، گھر آتا تھا تو اس امر کا پتہ چلانے کی نیت سے کہ میں کسی عورت سے ہم آغوش ہو کر تو نہیں آ رہا ہوں وہ مجھے روشنی میں لے جا کر غور سے میرا چہرہ دیکھتیں لال ٹین اوپر اٹھا کر میری شیروانی پر نگاہ کرتیں کہ کہیں کسی زلف کا بال تو اس میں چمٹا ہوا نہیں ہے، اسی کے ساتھ ساتھ وہ میرے کپڑے لمبی لمبی سانسیں لے کر سونگھا کرتی تھیں کہ میرے جسم سے کسی عورت کے بدن یا بالوں کی خوشبو تو نہیں آ رہی ہے

اور: عشق است و ہزار بدگمانی کے تحت یہاں تک ہوتا تھا کہ وہ جاڑوں میں پچھلے پہر، میرے لحاف میں ہاتھ ڈال کر یہ پتہ چلانے کے لئے کہ میں ان کے سو جانے کے بعد کسی عورت کے پاس چلا تو نہیں گیا تھا وہ میرے تلوے ٹٹول کر یہ دیکھا کرتی تھیں کہ وہ ٹھنڈے ہیں یا گرم۔

اور آج بھی جب کہ میں ایک خبیث بوڑھے کی صورت اختیار کر چکا ہوں، جب کبھی کوئی اخباری جوان عورت میرا انٹرویو لینے یا کوئی نوعمر شاعرہ مجھ سے ملنے آتی ہے وہ میرے چہرے کے نشیب و فراز اور میری آنکھوں کے رنگ پر اپنی متجسس نظروں کے آلات لگا کر یہ جانچتی رہتی ہیں کہ میں اس کو محبت کی نظر سے تو نہیں دیکھ رہا ہوں۔۔۔۔ اور جب تک وہ عورت بیٹھی رہتی ہے، ان کے چہرے پر بدگمانی کا پیدا کردہ کرب مچلتا رہتا ہے۔

مری خاک بھی لحد میں، نہ رہی امیر باقی
انہیں مرنے کا ہی اب تک نہیں اعتبار ہوتا

وہ مجھ کو آج تک چوتھی کا دولہا سمجھتی اور پہلے کی طرح اب بھی مجھ سے محبت کرتی

ہیں۔

ہر چند میری پاگل اور اندھی جوانی کے مسلسل معاشقوں نے میری اختلاج کی ماری دھان پان بیوی کے دل پر ایسے ایسے گھن چلائے تھے کہ اگر وہ پہاڑوں پر چلائے جاتے تو ان کے پرخچے اڑ جاتے لیکن اللہ ری میری بیوی کی استقامت محبت کہ انہوں نے ان روح فرسا حوادث کا ڈٹ کر مقابلہ کیا اور ایسا مقابلہ کہ العظمۃ للہ۔

جھانسی کی رانی نے ڈٹ کر انگریزوں کا مقابلہ کیا، میدان جنگ میں شہید ہو گئی مگر دشمن کے سامنے سپر نہیں ڈالی، میری بیوی نے ڈٹ کر میرے محبوبوں کا مقابلہ کیا، نہ سپر ہی ڈالی نہ شہید ہی ہوئیں اور آخر کار مجھ کو سب سے چھین کر، میدان جیت لیا۔

بہر کارے کہ ہمت بستہ گردد
اگر خارے بود گل دستہ گردد

میں نے 1950ء میں ام الشعراء یعنی اپنی بیوی پر ایک نظم کہی تھی جو ہنوز نا تمام ہے آپ بھی سن لیں:

رفیقۂ حیات سے خطاب

دیکھ کر تجھ کو، مرے دل سے ٹپکتا ہے لہو
اے مرے باپ کی، غم دیدہ و ناشاد بہو
تیرا، ہر لمحہ، بجز حسرت و وسواس نہ تھا
میری قصاب جوانی کو یہ احساس نہ تھا
مجھ کو ہر رات، وہ آراہ لئے پھرتی تھی
ایک بجلی تھی کہ خرمن پہ ترے گرتی تھی
جب مجھے، چھاؤں میں زلفوں کی وہ سلوتی تھی
چاندنی، دھوپ ترے واسطے بن جاتی تھی
آگ تھی جس میں، برستا نہ وہ پانی تجھ پر
کاش بھولے سے بھی آتی نہ جوانی مجھ پر
ہائے، اک شب بھی نہ ہوتی تھی سہانی تیری
کروٹیں، آنچ پہ لیتی تھی، جوانی تیری
جب بھی اٹھتی تھیں، مری سمت، نگاہیں تیری
ان نگاہوں سے برستی تھیں کراہیں تیری
تیری عفت کے شبستاں میں ہے اک حشر بپا
میرے معصوم گناہوں کو یہ معلوم نہ تھا
تجھ پہ بالقصد نہیں تھی وہ جفائیں میری
جبر سرکار مشت تھیں، خطائیں میری
اس قدر قرب پہ بھی، تجھ سے بہت دور تھا میں
الاماں، طبع کی افتاد سے مجبور تھا میں
اب کہ، بالوں کی سفیدی نے جگایا ہے مجھے

جذبہ کرب ترے سامنے لایا ہے مجھے
شرم سے جو نہیں اٹھتی وہ نظر لایا ہوں
اپنی بہکی ہوئی شاموں کی سحر لایا ہوں
اپنی آنکھوں کے، ترے در پہ گہر رکھتا ہوں
بخش دے مجھ کو، ترے پاؤں پہ سر رکھتا ہوں

☆☆☆☆☆☆

www.IqbalCyberLibrary.Net
All rights reserved.
©2002-2006

میری بیٹی

نام ہے سعیدہ خاتون میں پیار سے مردانہ نام بنا کر کلوا کہتا ہوں۔

غالباً 1917ء یا 1918ء کے لگ بھگ وہ ملیح آباد میں اپنی نانی کے گھر پیدا ہوئی تھی حیدرآباد دکن میں تعلیم پائی تعلیم جاری تھی کہ مجھے نظام نے خارج البلد کر دیا اور اس کے بعد برابر ایسے مواقع پیدا ہوتے رہے کہ اس کی تعلیم کا تکملہ نہیں ہو سکا۔

وہ غالباً 1936ء کا زمانہ تھا کہ میں نے دہلی میں اس کی شادی کر دی تھی۔ اپنی چچا زاد بہن کے بیٹے التفات احمد شہاب سے التفات احمد علی گڑھ کا گریجویٹ، خوش فکر شاعر، اور صاحب فکر انسان تھا لیکن اس میں جینے اور ابھرنے کا حوصلہ نہیں تھا کثرت آرام سے بیمار ہو کر وہ بے چارہ بہت قبل از وقت اس دنیا سے سدھار گیا۔

سعیدہ بے حد ذہین اور نکتہ سنج ہے اور سخن فہم بھی، طبیعت موزوں ہے مگر شعر نہیں کہتی وہ ماشاءاللہ نو بچوں کی ماں ہے نانی بھی بن چکی ہے، لیکن مجھ کو اب تک گڑیاں کھیلتی بچی نظر آتی ہے جی چاہتا ہے کہ اس کے بچوں کے نام بھی لکھ دوں ان خطابات کے ساتھ جو ان کو میری سرکار کی جانب سے عطا ہوئے ہیں۔

انور سعید خاں، عرف ''میاں''، ''مویاں'' اور ''مسٹر بھقا قا''۔۔۔۔۔حیدر مسعود خاں، عرف ''بغا''۔۔۔۔پرویز شہاب خاں، عرف ''پری''، یمسٹر پریر ''مسٹر باٹا'' اور ''وحشت کا چڑغا'' صبوحی خاتون، عرف ''بوئی چوئی''۔۔۔۔۔۔غزالہ خاتون، عرف ''غزلیا''۔۔۔۔۔۔خسرو شہاب خاں عرف بلو ''مسٹر ٹارزن'' اور جاموس اشرف جہاں علی معظم خاں عرف ''مسٹر مینورٹ'' اور ''مسکین شاہ''۔۔۔۔۔۔۔۔فرخ جمال عرف ''بدھا''، قلن ''قلندر'' اور ''قلوا۔۔۔۔''سراج انور خاں عرف مسٹر کپی اور ''مسٹر کالا گڈون'' ماشاءاللہ اتنے بہت سے بچوں کا پالنا کوئی ہنسی کھیل نہیں اس نے اپنے خون جگر سے ان پودوں کو سینچا اور پروان چڑھایا ہے میری بیوی شکایت کرتی ہیں کہ اب سعیدہ کو ہمارا خیال نہیں رہا ہے میں کہتا ہوں اس بیچاری کو فرصت ہی کب ملتی

ہے اپنے بچوں اور اپنی نواسیوں نواسوں کی خدمت سے کہ وہ کسی اور طرف توجہ کر سکے۔

اس دن رات کی مسلسل کاوش نے اس کی صحت بگاڑ کر رکھ دی اور جب میں اپنی بیٹی کا منہ اترا ہوا دیکھتا ہوں تو میرے دل سے خون کی بوندیں ٹپکنے لگتی ہیں۔

☆☆☆

www.IqbalCyberLibrary.Net
All rights reserved.
©2002-2006

میرا بیٹا

نام ہے سجاد حیدر خاں میں اس کو پیار سے ''چھجوا'' کہتا ہوں سعیدہ کی ولادت کے غالباً دو سال کے بعد وہ لکھنو میں پیدا ہوا تھا۔

وہ بیمار پیدا ہوا، اور آج تک تندرست نہیں ہے وہ اپنڈکس سے لے کر ٹائی فائیڈ ڈبل نمونیا اور طاعون کے سے مہلک مرض میں گرفتار رہ چکا ہے۔

اس نے سات آٹھ برس کی عمر ہی سے موٹر چلانا سیکھ لیا تھا، اور جب کسی قدر سیانا ہوا تو شوفر کی مدد سے اس نے تھوڑا بہت موٹر کی مرمت کا علم بھی حاصل کر لیا جو آج آڑے وقت اس کے کام آ رہا ہے (جس کی تفصیل آگے آئے گی)

میرے پونے کے اثناء قیام میں اس نے محمد فقیہہ صاحب بیرسٹر اور نائب وزیر جوناگڑھ کی بیٹی انور خانم سے اپنی ماں کی علی الرغم شادی کر لی تھی جس پر بیوی اب تک ناخوش ہیں۔

وہ ماشاء اللہ پانچ بچوں کا باپ ہے ان کے نام بھی مع عرفیت سن لیجئے ۔۔۔۔۔ ساجد حیدر خاں، عرف ''مسٹر ٹائز''۔۔۔۔۔۔ناز خاتون، عرف ''امی''۔۔۔۔۔ترنم خاتون عرف ''چمنی'' تاج دار بیگم ۔۔۔۔۔۔تبسم خاتون عرف ''خچی'' اور فواد حیدر عرف ''مسٹر بندر''

سجاد بھی اپنی بہن کی طرح بلا کا ذہین ہے شعر بھی کہتا ہے بعض اشعار آب دار بھی ہوتے ہیں اور وہ دعویٰ کر سکتا ہے کہ

پانچویں پشت ہے شبیر کی مداحی میں

۔۔۔۔۔۔افسوس کہ بیماریوں کے تواتر سے وہ اعلیٰ تعلیم حاصل نہیں کر سکا۔

وہ آج سے کچھ اوپر دو برس پہلے میری سیمنٹ ایجنسی کو چلاتا خود اپنے پر خرچ کرتا اور مجھے ما کر دیا کرتا تھا لیکن 1946ء میں جب کہ میں ہندوستان گیا اور وہاں کسی انگریزی اخبار میں میرا ایک انٹرویو شائع ہوا تھا اس وقت ترقی اردو بورڈ کے سیکرٹری

شان الحق حقی، وزارت اطلاعات کے سیکرٹری الطاف گوہر، اور میرے نئے حواری عیش ٹونکی نے اس انٹرویو کے معنی کچھ اس قدر مسخ کر کے پیش کئے کہ اس وقت کے مطلق العنان صدر فیلڈ مارشل صاحب یعنی ایوب خاں نے برہم ہو کر میری نوکری بھی ختم کر دی میرا پاسپورٹ بھی چھین لیا اور قومی عجائب گھر کو بھی میرے مسودات کی خریداری سے روک دیا میری بیوہ لڑکی کے آئیل ٹینکر کے بارے میں بھی اشارہ فرما دیا کہ اس میں مال نہ بھرا جائے اور میری ایجنسی بھی بند کر دی۔

میری اس بے سروسامانی سے متاثر ہو کر سجاد نے ایک چھوٹی موٹی ورکشاپ کھول لی جس سے وہ لشتم پشتم زندگی بسر کر رہا ہے یا یوں کہئے کہ زندگی کو بھوگ رہا ہے ہائے میرے بچے۔

سجاد نے لکھنو کی بھاٹ کھنڈے یونیورسٹی سے سند حاصل کی تھی وہ پاکستان ریڈیو پر ستار بجانے کے واسطے بلایا جاتا تھا ایوب خاں صاحب بہادر نے اس کا وہ دروازہ بھی بند کروا دیا۔

میں نے اجداد کی تلوار کو پگھلا کر قلم بنا لیا تھا میرے بیٹے نے میرے قلم کو ہتھوڑے میں ڈھال لیا ہے ہائے میرے خاندان کا وہ عروج اور ہائے یہ زوال

☆☆

میرے چند قابل ذکر احباب

یاں چمپئی دھوپ ہے، گلابی سایا
رہتا ہے، سحاب ابدیت چھایا
جوش آؤ، کہ منتظر ہے بزم ارواح
آیا۔۔۔۔۔ یاران رفتہ۔۔۔ آیا، آیا

☆☆☆☆☆☆

www.IqbalCyberLibrary.Net
All rights reserved.
©2002-2006

ابرار حسن خاں اثر ملیح آبادی

خوب صورت، خوش دماغ، حاضر جواب، جادو بیان، داستان سرا، عاشق مزاج، لطیفہ گو، شوخ وطرار، ملیح آباد کی نژادنو میں، سب سے زیادہ ذہین مرغ و ماہی پکانے میں استاد میرے لنگوٹیا یار، میرے بہنوئی، میری سراپا شفقت پھپّی زاد بہن کے منجھلے بیٹے (جو میری صحت کی ناز بردار، اور میری بیماری میں مستقل تیماردار تھیں) چڑھتی عمر تک سراپا نیاز، ڈھلتی زندگی میں خوفناک دشنام طراز۔ اور میرے اس کوچے کے واہ بر اولین تھے جس کو بدتوفیقوں کی اصطلاح میں کوئے بد اعمالی کہا جاتا ہے چونکہ وہ بچپن ہی میں یتیم ہو گئے تھے اس لئے میرے باپ نے ان کی پرورش وتعلیم کا بار اپنے ذمے لے لیا تھا ان کے اور میرے مکان کے مابین کھڑکی تھی وہ سونے کے اوقات کے علاوہ ہمارے ہی مکان میں رہا کرتے ہمارے ہی ساتھ کھاتے پیتے اور کھیلتے کودتے رہتے تھے لڑکپن کا ذکر ہے ایک روز ہم لوگ، دوپہر کے وقت، ڈیوڑھی میں بیٹھے غالباً تاش کھیل رہے تھے کہ ابرار آ گئے، اور اصرار کرنے لگے کہ ہم کو بھی کھیل میں شریک کرو، میرے بڑے بھائی نے (جو سال، دو سال مجھ سے بڑے تھے) ان سے کہا کہ تم کھیل میں ہمیشہ بے ایمانی کرتے ہو ہم تم کو نہیں کھلائیں گے انہوں نے کہا اگر ہم کو نہیں کھلاؤ گے تو ہم ''قرآن مجید [1]'' کی قسم تم کو بشیر ماموں [2] سے ابھی پٹوا دیں گے میرے بڑے بھائی

---

1 نہ جانے ان کی زبان میں کیا خرابی تھی کہ وہ ''قرآن مجید'' کہا کرتے تھے 2 چونکہ میرے باپ

نے کہا جا بے مردود، تو کیا پٹوا سکتا ہے۔ یہ سنتے ہی وہ میرے باپ کے پاس گئے اور کہنے لگے بشیر ماموں شفیع احمد خاں (میرے بڑے بھائی) کہہ رہے ہیں کہ ہم سے مسلمانی لڑاؤ یہ سنتے ہی میرے باپ آگ بگولا ہو گئے اور ڈیوڑھی میں آ کر میرے بڑے بھائی کو خوب مارا وہ چیختے رہے کہ ابرار جھوٹا ہے لیکن انہوں نے پروا نہیں کی اور

ابرار کا چہرہ 1 بحال ہو گیا وہ رئیس 2 احمد کی انا سے اس گمان پر جلتے تھے کہ وہ ان کو باسی کھانا دیتی ہیں اور انا ان سے اس بناء پر کھنستی تھیں کہ وہ ان پر جھوٹا الزام لگاتے ہیں ایک روز شام کے وقت ڈیوڑھی کے پھاٹک سے چیخ چیخ کر کہا ہے ہے میاں آگ لگے اس چودھویں صدی کو ارے غضب خدا کا یہ کل کا چھوکرا ابرار مجھ سے کہہ رہا ہے'' اوندھی ہو جاؤ'' میرے باپ کو تاؤ آ گیا سپاہی کو حکم دیا کہ آٹھ دس چھڑیاں نیم سے کاٹ لاؤ پھاٹک بند کر دو کہ ابرار بھاگ نہ پائے اور جب چھڑیاں آ گئیں ابرار کو پکڑ بلوایا اور میرے باپ نے چھڑی اٹھا کر کہا کیوں بے مردود گھر کی بڑی بوڑھیوں سے بدتمیزی کرتا ہے ادھر آ آج تیرے ٹکڑے اڑا کر رکھ دوں گا انہوں نے تھر تھر کانپتے ہوئے کہا بشیر ماموں تو ان مجید کی قسم تو ان مجید کی قسم تو ان مجید کی قسم میرے باپ نے کہا قسمیں ہی کھاتا رہے گا یا کچھ کہے گا بھی ۔۔۔ وہ دوڑ کر میرے باپ کے قدموں پر گر پڑے اور ڈبڈبائی آنکھیں اٹھا کر کہا بشیر ماموں تو ان مجید کی قسم میں نے تو '' اوندھی ہو جاؤ'' نہیں '' اندھی ہو جاؤ'' کہا تھا ابرار کی اس ذہانت پر میرے باپ کو ہنسی آ گئی اور چھڑی پھینک کر فرمایا گرو گھنٹال 3 آج تو چھوڑے

کو ان کی ماں ''بشیر ماموں'' کہتی تھیں اس لئے ان کی زبان پر یہی لفظ چڑھ گیا تھا 1 یہ اور بات ہے کہ جب میرے باپ کو دوسرے دن یہ پتا چل گیا کہ ابرار نے جھوٹا الزام لگایا تھا تو ان کی بھی پٹائی کر دی گئی تھی 2 میرا چھوٹا بھائی 3 چونکہ وہ ہم لوگوں کو نئی نئی شرارتیں سکھایا کرتے تھے اس لئے میرے باپ نے ان کو گرو گھنٹال کا خطاب دے دیا تھا۔

دیتا ہوں لیکن اب اگر اس قسم کی کوئی بات زبان پر لائے گا تو تیری ہڈیاں پسلیاں ایک کر دوں گا۔

ہماری ماماؤں میں سے تھیں ایک کوزہ پشت محبوبن بوا، وہ بھی ان کی شرارتوں کے باعث، ان سے جلتی تھیں ایک روز انہوں نے امام باڑے سے ملے ہوئے کمرے

میں ان کو سگریٹ پیتے دیکھ لیا اور میرے باپ سے جا کر کہا میاں ''ابریل'' (ابرار) چرٹ پی رہا ہے اور جب ''ابریل'' خوب تھپڑائے گئے، تو بوا محبوبن کے چہرے کی جھریوں میں خوشی کی لہر دوڑ گئی اور اس چالاکی سے کہ کسی کو پتا ہی نہیں چلا کہ وہ حرکت ان کی تھی جس زمانے میں رئیس احمد اور ابرار میرے ساتھ لکھنو کی لاٹوش روڈ کی گلی کے مکان میں بسلسلہ تعلیم رہتے تھے ابرار کا معمول تھا کہ روز منہ اندھیرے وہ سگریٹ پی کر دو غزلیں:

کھلی ہے کنج قفس میں، مری زبان ''صیاد'' اور
محبت میں تری، ہم سے، برآں اہل وطن بگڑا

بالالتزام گایا کرتے تھے اور سگریٹ کے واسطے جب فق سے دی سلائی جلاتے تھے تو دھندلکے کا اندھیرا کانپ اٹھتا تھا اور اس کا شعلہ میری آنکھوں میں اس طرح چبھ جاتا تھا کہ میں آنکھیں بند کر لیا کرتا تھا اس مکان کا ذکر ہے، میرے باپ، ملیح آباد سے آ کر اس مکان کی نچلی منزل میں اور میرے بڑے بھائی، ہمارے اوپر کے کمرے سے ملے ہوئے دوسرے کمرے میں ٹھہرے ہوئے تھے۔

ہفتے کی رات تھی، میں اور ابرار اپنے پڑوسی طالب علم شریف 1 کے ساتھ باتیں کر کر کے قہقہے مار رہے تھے ابرار نے مجھ سے کہا ہم ہنس بول رہے ہیں شفیع احمد خاں (میرے بڑے بھائی) پر یہ بات شاق گزر رہی ہوگی۔ وہ عجب نہیں کہ بشیر ماموں سے جا کر شکایت کر دیں وہ ہمیشہ ہماری تاک میں رہا کرتے ہیں ابرار کا یہ جملہ ختم ہی ہوا تھا کہ بھائی صاحب دروازہ کھول کر نیچے اترنے لگے انہوں نے کہا دیکھئے وہ جو میں نے ابھی کہا تھا وہی ہوا۔ شفیع احمد خاں ہماری شکایت کرنے کے لئے نیچے جا رہے ہیں۔

---

1 وہ ''بھدوئی'' کا رہنے والا اور میرا محبوب دوست تھا اب نہ جانے کہاں ہے

میں تو شریف کو لے کر اس چور دروازے سے اسی وقت بھاگا جا رہا ہوں اگر بشیر

ماموں اوپر آ کر آپ کو برا بھلا کہیں تو آپ بھی گھر چھوڑ کر شریف کے وہاں آ جایئے گا اور صبح کی گاڑی سے ہم لوگ نواب صاحب رام پور کے پاس چلے جائیں گے ابرار یہ کہہ کر اتر گئے میں تنہا رہ گیا اتنے میں میرے باپ آئے، فرمانے لگے تم لوگوں نے شفیع احمد کی نیند حرام کر دی، شہدے کہیں کے، اور وہ مرودگر دگھنٹال کہاں ہے، میں نے کہا وہ شریف کے گھر چلے گئے ہیں۔

باپ کی یہ بے جا ڈانٹ پھٹکار، مجھ کو زہر لگی، ان کے نیچے اتر جانے کے بعد میں ابرار کے پاس چلا گیا ابرار نے کہا اب یہ گھر رہنے کے قابل نہیں رہا ہے قرآن مجید کی قسم شفیع احمد خاں ایک روز ہم کو مروا ڈالیں گے، چلئے انیس خالہ (میری چھوٹی بہن) کے گھر میں رات گزار دیں اور پہلی ٹرین سے رام پور چلے جائیں اس کے سوا اور کوئی چارہ ہی نہیں ہے ابھی ہم شریف کے دروازے سے نکلے ہی تھے کہ دیکھا ہمارے باپ کے سپاہی، ریاست علی خاں، لالٹین لئے چلے آ رہے ہیں ابرار نے کہا کہ یہ مخبری بھی شفیع احمد خاں نے کر دی ہوگی کہ آپ بھی گھر چھوڑ کر شریف کے ہاں چلے آئے ہیں، دیکھئے ریاست علی خاں جب قریب آئیں تو قرآن مجید قسم ان کو ماں کی گالی دیجئے گا میں نے کہا ابرار کیسی باتیں کرتے ہو ریاست علی خاں کھرے پٹھان ہیں، اور بوڑھے آدمی بھی ہیں۔ میں ان کی سفید داڑھی کی حرمت کرتا ہوں ان کو ہرگز گالی نہیں دوں گا اتنے میں ریاست علی خاں قریب آ گئے اور کہا خاں صاحب بہادر نے فرمایا ہے کہ آپ فوراً گھر آ جائیں نہیں تو مجھ سے برا اور کوئی نہیں ہوگا ابرار نے دو قدم آگے بڑھ کر کہا ریاست علی خاں سو بات کی بات یہ ہے کہ قرآن مجید کی قسم، تمہاری تو ماں ۔۔۔۔۔ بے چارے ریاست علی خاں اس قدر فحش گالی سن کر اس طرح اچھل گئے گویا کسی نے ان کو گولی مار دی ہے انہوں نے بڑی بے چارگی کے ساتھ نگاہیں جھکا لیں اور دھل دھل آنکھوں سے آنسو بہنے لگے (ان کے بہتے آنسو آج تک میرا تعاقب کر رہے ہیں)

انیس کے وہاں ہم دونوں بہت تڑکے بیدار ہو کر سفیر کی تیاری کر ہی رہے تھے کہ مکان کے نیچے گاڑی ٹھہرنے کی آواز آئی انہوں نے جھانک کر دیکھا تو ان کے منہ سے چیخ نکل گئی ارے بشیر ماموں آ گئے انیس خالہ نے ہماری مخبری کر دی آپ کو ایسا چاہئے نہ تھا اور زینے پر جب قدموں کی آواز گونجنے لگی تو انہوں نے آؤ دیکھا نہ تاؤ، جھٹ سے چارپائی کے نیچے جا کر دبک گئے میں نے آ کر بڑی خشونت کے ساتھ مجھ کو دیکھا میں کانپنے لگا فرمایا گرو گھنٹال کہاں ہے انیس نے چارپائی کی طرف اشارہ کر دیا۔ میاں نے گرج کر فرمایا نکل چارپائی کے نیچے سے مردود ابرار چارپائی کے نیچے سے یوں نکلے جیسے آواز صور سن کر بے چارے مردے اپنی بے حساب دردمند زندگی کا حساب دینے کے واسطے، اپنی اپنی قبروں سے نکلیں گے۔

میاں نے ایک حرف بھی نہیں کہا ہم دونوں کو کوٹھے سے اترنے کا اشارہ فرمایا آگے آگے میاں، اور پیچھے پیچھے ہم مفرورین کوٹھے سے اترے تو میاں نے گاڑی میں بیٹھ جانے کا اشارہ کیا، اور ہم دونوں ان کے سامنے اس طرح گاڑی میں بیٹھ گئے گویا شیر کے سامنے دو بکرے بندھے ہوئے ہیں راستے بھر میاں نے کوئی بات نہیں کی گھر آتے ہی فرمایا چلو اوپر جب ہم اوپر آ گئے تو میاں نے ابرار کے منہ پر زناٹے کے ساتھ تھپڑ مارا کہ ابرار لونڈ پونڈ ہو گئے لیکن چار پانچ سیکنڈ کے اندر ہی اندر بھاگ کھڑے ہوئے اور ایک ایک جست میں تین تین چار چار سیڑھیاں پھلانگتے ہوئے مکان سے باہر نکل گئے۔

ان کے اس ڈرامائی فرار کے بعد میاں نے مجھ سے کہا سنتا ہوں آپ کو سپہ گری کا بڑا دعویٰ ہے امیدی 1 دو لاٹھیاں لے آؤ۔ ایک ان سورما صاحب کے ہاتھ میں دے دو، ایک مجھے آج میرے ان کے مابین دو دو ہاتھ ہو جائیں۔ اور پتا چل جائے کہ بہادر کون ہے امیدی نے ایک لاٹھی میاں کے ہاتھ میں دے دی اور دوسری لاٹھی میری طرف بڑھائی میری کیا مجال تھی کہ باپ سے نبرد آزمائی کے واسطے لاٹھی ہاتھ

میں لیتا میں نے ہاتھ نہیں بڑھایا۔

1 داروغہ امید علی خاں

اور امیدی نے میرے کاندھے سے لگا کر لاٹھی کھڑی کر دی میں پیچھے ہٹ گیا لاٹھی گر گئی میاں نے ڈپٹ کر فرمایا اے بزدل لاٹھی ہاتھ میں لے اور میدان پکڑ اور جب میں ٹس سے مس نہ ہوا تو میاں نے ارشاد فرمایا کہ تو سراسر زنخا ہے علمائے اخلاق نے سچ کہا ہے کہ بزدلی و بے حیائی کا چولی دامن کا ساتھ ہے تو سمجھا میں تجھے بے حیا کیوں کہہ رہا ہوں؟ تجھ کو بخوبی معلوم ہے کہ آج کل تیرے نکاح کی تنسیخ کا مقدمہ چل رہا ہے، اگر تو غیرت مند ہوتا تو اس موقع پر گھر چھوڑ کر نہ چلا جاتا کہ اگر میرے باپ مقدمے سے ہاتھ اٹھا لیں گے تو میری بیوی کسی اور کے پہلو میں چلی جائے گی میں نے آب دیدہ ہو کر کہا میاں میں آپ کو اس قدر غیرت مند اور شریف انسان سمجھتا ہوں کہ مجھے یقین ہے کہ آپ مجھ سے کتنے ہی ناخوش ہو جائیں مگر مقدمے سے کبھی دست بردار ہو ہی نہیں سکتے میری یہ بات سن کر میاں کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے۔

رئیس احمد کو ابتداء ہی سے شکار، ورزش، گھوڑے کی سواری اور اپنے جیب خرچ کو گنیوں میں تبدیل کر کے جمع کرنے کا شوق تھا ابرار نے ان کے اس میلان صحت کو دیکھ کر ایک دن ان سے کہا رئیس احمد، میں آپ کو قرآن مجید کی قسم، ایک ایسی نایاب دوا دے سکتا ہوں کہ آپ دو مہینے کے اندر اندر ایک دیو پیکر پہلوان بن جائیں، رئیس کی باچھیں کھل گئیں پوچھا اس دوا کا نام کیا ہے انہوں نے کہا ''زبان پر لگانے کا طلا'' رئیس نے قیمت دریافت کی ابرار نے کہا ارے کچھ نہیں فقط پانچ گنیاں رئیس نے چپکے سے گنیاں دے دیں ابرار ایک چھوٹی سی شیشی میں روغن بادام لے آئے، اور کہا دیکھئے روز ایک کوری سینک اس میں ڈبو کر نہار منہ چاٹ لیا کیجئے گا قرآن مجید کی قسم آپ بھونپو ہو جائیں گے بھونپو ایک روز بڑے بھائی صاحب نے رئیس کو سینک چاٹتے

دیکھ کر پوچھا یہ کیا دوا ہے رئیس نے بڑی سادگی کے ساتھ کہا میاں بھائی یہ زبان کا طلا ہے ابرار پانچ گنیوں میں لائے ہیں بڑے بھائی صاحب کو لفظ طلا کے معنی تو معلوم نہیں تھے لیکن یہ سمجھ کر کہ ابرار ڈاکٹر ہیں نہ حکیم، ہو نہ ہو انہوں نے چھلی بٹا کر کے رئیس سے اشرفیاں اینٹھ لی ہیں، میاں سے جا کر سارا واقعہ بیان کر دیا میاں نے رئیس کو بلا کر پوچھا، اسے کیا معلوم تھا کہ اس میں کوئی بری بات ہے کل واقعہ بیان کر دیا میاں نے شیشی دیکھی اس میں روغن بادام پایا اسی وقت ابرار کو بلایا اور فرمایا کیوں مردود تو نے ''دبابا1'' سے گنیاں اینٹھ لیں مجھ کو اس کی پروا نہیں مگر اس دوا کا نام اس قدر فحش بتایا'' زبان کا طلا'' آج تیرے ٹکڑے اڑا کر رکھ دوں گا یہ کہہ کر میاں ابرار کی طرف جھپٹے ابرار نے چیخ مار کر کہا ں قرآن مجید کی قسم میں نے ''زبان کا طلا'' نہیں ''زبان کا تیل'' کہا تھا رئیس احمد خاں نے میری بات سمجھی ہی نہیں میں نے کہا تھا ''تیل'' وہ سمجھے طلا طلا کیا چیز ہوتا ہے قرآن مجید کی قسم مجھ کو معلوم ہی نہیں میاں سمجھ تو گئے کہ ابرار بات بنا رہا ہے لیکن ان کی ذہانت و حاضر جوابی کی داد کے طور پر انہیں معاف کر دیا۔

جس زمانے میں ہم، 2 آگرے کے سینٹ پیٹرز کالج میں زیر تعلیم تھے اور ملیح آباد سے تعطیل کی مدت گزار کر آگرے جا رہے تھے میاں نے رئیس ابرار اور مجھے پانچ پانچ سو روپے دیئے تھے کہ آگرے جا کر جڑاول بنوالینا اس وقت ابرار نے یہ لکھ کر کہ میری جڑاول پانچ سو روپے میں نہیں بن سکے گی مزید پانچ سو روپے کا مطالبہ کیا تھا۔

میاں نے ہم دونوں بھائیوں اور ابرار کو طلب کر کے مجھ سے اور رئیس سے پوچھا کہ تمہاری جڑاول پانچ پانچ سو روپے میں بن جائے گی کہ نہیں ہم نے جواباً عرض کیا کہ بن جائے گی میاں نے ابرار سے کہا کہ ان دونوں کی جڑاول تو پانچ پانچ سو میں بن جائے گی تمہاری جڑاول میں کیا سرخاب کے پر لگے ہیں کہ وہ اس قدر رقم میں تیار نہیں ہو سکے گی؟ تو ابرار نے آنکھوں میں آنسو بھر کر یہ جواب دیا تھا کہ بشیر ماموں

آپ غصے نہ ہو جائیں تو یہ کہوں کہ ان دونوں کی جڑ اول بھی اس قدر کم روپے میں نہیں بن سکے گی یہ آپ کے بیٹے ہیں روپیہ کم پڑے گا تو یہ آپ سے دوبارہ منگالیں گے میں آپ کا

1۔ رئیس کا پیار کا نام 2۔ رئیس وابرار

بیٹا نہیں ہوں مجھ یتیم کی ہمت نہیں پڑے گی یہ سن کر میاں نے ابرار اور ان کے طفیل ہم دونوں بھائیوں کو بھی ایک ایک ہزار روپے مرحمت فرما دیئے تھے۔

ایک بار ان کے ایک کشمیری محبوب نے ان سے چار سو روپے طلب کئے وہ اس سے وعدہ کر کے تو چلے آئے لیکن بڑے خلفشار میں پڑ گئے کہ روپیہ دوں گا کہاں سے کئی روز تک پریشان رہنے کے بعد انہوں نے مجھ سے کہا شبیر حسن خاں قرآن مجید کی قسم ایک ایسی تدبیر سمجھ میں آ گئی ہے کہ کبھی پٹ نہیں پڑ سکتی آپ رئیس احمد خاں کو بلا لیں رئیس آ گئے تو انہوں نے کہا آپ جانتے ہیں کہ بشیر ماموں آپ سب کو کس قدر چاہتے ہیں وہ آپ کے ناخن کا دکھنا تک برداشت نہیں کر سکتے ہیں۔

رئیس نے کہا آخر کہنا کیا چاہتے ہو، انہوں نے کہا بشیر ماموں کو جو محبت آپ سے ہے اس سے فائدہ اٹھانا چاہتا ہوں میں نے کہا پہیلیاں سی کیوں بجھا رہے ہو، صاف صاف بات کہو، انہوں نے کہا میں چاہتا ہوں کہ آپ جھوٹ موٹ بے ہوش ہو جائیں ظاہر ہے کہ آپ کی بیہوشی سے بشیر ماموں کا دل دہل کر رہ جائے گا اور تھوڑی دیر بے ہوش رہ کر ہوش میں آ جائیں اور ان سے چار سو روپے کی فرمائش کر دیں اگر رئیس احمد خاں آپ یہ ڈراما کھیل کر مجھے روپے دلا دیں گے تو قرآن مجید کی قسم، میں زندگی بھر کے لئے آپ کا غلام بن جاؤں گا رئیس نے ان سے امداد کا جب وعدہ کر لیا تو برابر تین دن تک ابرار نے ان کو ریہرسل کرایا جسمانی حرکات بتائیے اور لہجے کے طول وعرض کو بار بار سکھایا خود لیٹ لیٹ کر بتایا کہ کھانا کھانے میں آپ یوں لیٹ جائیے گا یوں نوالہ توڑیئے اور پھر یوں دھم سے گر پڑیئے گا اور ہوش میں آ جانے کے بعد پھر یوں

ٹھہر ٹھہر کر حرف مطلب زبان پر لائے گا۔

جب تین دن تک کا مسلسل ریہرسل ختم ہو گیا تو ہمارا طائفہ ملیح آباد آیا اور شام ہوتے ہی رئیس احمد نے حسب تعلیم ابرار، اپنی انا سے کہا آج طبیعت کچھ خراب ہے کھانا ابھی سے کھلا دو کھانا، امام باڑے کے برآمدے میں چن دیا گیا ابرار اور میں دونوں صحن میں بیٹھ گئے یہ دیکھنے کو کہ رئیس کیسی ایکٹنگ کرے گا۔

رئیس نے ابرار کے کہنے کیمطابق گن کر تین نوالے کھائے چوتھا نوالہ اٹھا کر کراہنے لگا ابرار نے مجھ سے چپکے سے کہا کتنی اچھی ایکٹنگ ہو رہی ہے رئیس نے کراہ کر تین بار آہ آہ آہ کی آواز نکالی نوالہ ہاتھ سے چھوٹ گیا اور دھم سے لیٹ کر بے ہوش ہو گیا۔

اس کے ''بے ہوش'' ہوتے ہی گھر بھر میں کہرام برپا ہو گیا انا دوڑی ہوئی باہر گئیں اور دیوانہ وار پکار کر کہا ہے ہے میاں رئیس بے ہوش ہو گیا میاں کے حواس اڑ گئے ننگے پاؤں دوڑتے آئے اور رئیس کے گرد گھوم گھوم کر دعا کرنے لگے کہ اے اللہ میری جان کی قربانی قبول کر، اور اسے اچھا کر دے۔ پانچ منٹ کے بعد ڈاکٹر عبدالکریم صاحب آ گئے میاں نے کہا خدا کے واسطے میرے بچے کو بچا لیجئے ڈاکٹر صاحب نے آلہ لگا کر اور انگلیوں سے ٹھونک ٹھونک کر اس کے سینے کا مطالعہ کیا نبض دیکھی اور کہا خاں صاحب کوئی گھبرانے کی بات نہیں گرمی دماغ پر چڑھ گئی ہے میں ابھی دوا لے کر حاضر ہوتا ہوں ڈاکٹر کے چلے جانے کے بعد میاں پھر رئیس کے گرد گھوم گھوم کر دعائیں مانگنے لگے دادی جان نے جب قرآن کی ہوا دی رئیس نے ابرار کی سکھائی ہوئی انتہائی نقاہت کے ساتھ ذرا سی آنکھیں کھول دیں میری ماں نے کہا مبارک ہو رئیس کو ہوش آ گیا۔

میاں نے انتہائی بے تابی کے ساتھ جھپک کر پوچھا طبیعت کیسی ہے؟ رئیس نے سن کر بار بار پلکیں جھپکائیں میاں کا چہرہ فق ہو گیا وہ اس کے سرہانے بیٹھ گئے رئیس

نے دوبارہ آنکھیں کھول کر تاگے کی سی مہین آواز میں ٹھہر ٹھہر کر کہا باوا چار سو روپے میاں نے میری ماں سے کہا ارے جلدی سے پانچ سو کی تھیلی لے آؤ اور جب تھیلی اس کے سامنے رکھ دی گئی اس نے بڑی کانپتی آواز میں پوچھا میاں ہمارے سر کی قسم یہ روپے دے کر واپس تو نہیں لے لیں گے؟ میاں نے بڑی گرم جوشی کے ساتھ جواب دیا ارے تیرے سر کی قسم واپس نہیں لوں گا اس کے دوسرے ہی دن ہم لوگ لکھنو چلے گئے اور شام ہوتے ہی ابرار اس کا شمیری لڑکے کو چار سو دے آئے اور باقی سو روپوں سے خوب تفریح کی۔

انہیں کہانیاں کہنے کا بھی نہایت شوق تھا سنی ہوئی کہانیوں ہی پر اکتفا نہیں کرتے ہزاروں من گھڑت کہانیاں اور فرضی قصے بھی سنایا کرتے تھے اور اس جادو بیانی اور اس ڈرامائی انداز کے ساتھ کہ سننے والے چھ چھ سات سات گھنٹے تک مسلسل سنتے رہتے اور بھوک پیاس تک بھول جایا کرتے تھے۔

اور جب وہ مسائل پر زبان کھولتے تو حاضرین پر سناٹا سا چھا جاتا اور بڑے بڑے صاحبان علم و ارباب خطابت کا منہ کھلا کا کھلا رہ جاتا تھا۔

ابتداء میں بادہ خواری کے وقت وہ بلبل ہزار داستان بن جاتے ٹھمریاں، دادرے اپنا اور دوسروں کا کلام اور لطیفے سناتے اور بسا اوقات انگریزی ناچ بھی دکھایا کرتے تھے لیکن زندگی کے آخری دور میں وہ اس قدر خوفناک ہو گئے تھے کہ شراب پینے کے وقت جس کی طرف بھی ان کی نظر اٹھ جاتی تھی وہ اس کو گالیاں دینے لگتے تھے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ان کی کھوپڑی میں ماں بہن اور بیٹی وغیرہ کی گالیوں کے کارتوس دن سے چل جایا کرتا تھا میں نے اور مجھ سے زیادہ رئیس نے بے حد کوشش کی اور بارہا سزائیں بھی دیں کہ ان کی اصلاح ہو جائے مگر عمر کے انحطاط اور شراب کی کثرت نے ان کے دماغ کو ماؤف کر دیا تھا کہ وہ راہ راست پر نہیں آئے آخر کار تنگ آ کر میں نے اپنی رات کی محفلوں میں شریک ہونے سے ان کو روک دیا، اور پہرے بٹھا دیئے کہ وہ

باریاب نہ ہوسکیں۔

حقہ پانی بند ہوگیا تو وہ بڑے اداس ہوکر رہ گئے اور اپنے گھر میں بیٹھ کر پینے لگے اور گھر والوں کو گالیاں دینے لگے اور اس مقاطعے اور گھر والوں کے احتجاج مسلسل سے تنگ آ کر وہ نان پارے چلے گئے اور راجہ صاحب نان پارہ کی نوکری کر لی۔

ایک روز میں اپنی لکھنو کی بنارسی باغ کے سامنے والی کوٹھی سے منہ اندھیرے سیر کرنے کے واسطے باہر نکلا ہی تھا کہ وہ تانگے پر اپنا سامان رکھے آ گئے میرا ماتھا ٹھنک گیا کہ ہو نہ ہو وہ راجہ صاحب نان پارہ کو گالیاں دے کر آئے ہیں۔

اور جب تانگے سے اترتے ہی انہوں نے مجھ سے یہ کہا کہ شبیر حسن خاں یہ نان پارے کا راجہ نہایت کمینہ ہے، تو میرے خیال کی تصدیق ہوگئی اس لئے کہ ان کی یہ سنت جاریہ تھی کہ وہ رات کو جسے گالیاں دیتے تھے اگر وہ صبح کو شکایت کرتا تھا تو وہ اسے کمینہ آدمی کہا کرتے تھے۔

میں نے کہا تمہارا اس طرح لدا پھندا آنا اس امر کی غمازی کر رہا ہے کہ رات کے وقت تم نے راجہ کو ضرور گالیاں دی ہیں انہوں نے کہا قرآن مجید کی قسم میں نے گالیاں نہیں دی ہیں اسی دن سرِ شام میں انہیں ساتھ لے کر راجہ صاحب کے پاس گیا ان سے کہا تم موٹر میں بیٹھے رہو جب بلاؤں تو آنا اندر جا کر راجہ صاحب سے پوچھا انہوں نے کہا رات کو خاں صاحب نے میری تمام محفل درہم برہم کر دی میرے وہاں ڈرنک اور ڈنر کی پارٹی تھی جس میں انگریزوں کو بھی مدعو کیا گیا تھا جب ہم سب کھانے کی میز پر آئے خاں صاحب چینی کی پلیٹ میں ہڈی توڑنے لگے کھٹا کھٹ، اور جب میرے سیکرٹری نے انہیں روکنا چاہا تو خاں صاحب نے اس کو فحش گالیاں دینا شروع کر دیں۔

ادھر ادھر کی باتیں کرنے کے بعد میں نے کہا راجہ صاحب، ابرار کو آپ سے بے حد محبت ہے وہ اپنی اس غلطی پر بے حد پشیمان ہیں اب وہ نوکری کرنا نہیں چاہتے لیکن

چونکہ وہ آپ کو بہت چاہتے ہیں اس لئے ان کی یہ تمنا ہے کہ آپ کے پاس آ کر معذرت کرلیں راجہ صاحب نے کہا جوش صاحب میں نے خاں صاحب کو کبھی ملازم نہیں ہمیشہ اپنا بزرگ سمجھا آپ انہیں بلوالیں آدمی بھیج کر میں نے انہیں

---

1. جس دعوت میں انگریز شریک ہوتے تھے ہم گھٹیا لوگ اس دعوت کو بڑھیا سمجھتے تھے۔

بلوالیا ابرار نے جھپٹ کر راجہ کو گلے سے لگالیا اور رونے لگے راجہ نے کہا خاں صاحب خدا کے واسطے نہ روئیے میں آپ کا بڑا احترام کرتا ہوں چھوڑیئے اس ذکر کو پھر آ جایئے میرے پاس اسی اثناء میں آفتاب غروب ہوگیا میں اٹھنے لگا راجہ نے کہا ایسی بھی کیا بے مروتی تھوڑی سی ڈرنک تو کرتے جایئے میں نے کہا میں ابرار کی صحبت میں شراب نہیں پیوں گا آپ کسی دوسرے کمرے میں ان کا انتظام کردیں۔ ابرار نے مجھ کو بڑی شکایت آمیز نظروں سے دیکھا اور راجہ صاحب نے کہا جوش صاحب آپ اجازت دے دیں تو خاں صاحب ایک پیگ تو میرے ساتھ کرلیں، پھر دوسرے کمرے میں انہیں بھیج دوں گا اس کے بعد بوتل کھلی سب سے پہلے حسب دستور مہتمم شراب کو ایک پیگ پلایا اور دس پندرہ منٹ کے بعد جب اس امر کی تصدیق ہوگئی کہ شراب میں کسی دشمن نے زہر نہیں ملوادیا ہے ہم لوگوں کے جام بھر دیئے گئے۔

آدھا جام خالی کرکے، ابرار نے صوفہ چھوڑ دیا راجہ کے سامنے فرش پر آ کر بیٹھ گئے ان کے ہاتھ چوم چوم کر ''میر چنوا'' ''میر منوا'' کہنے لگے اس کے بعد جلدی سے اپنا گلاس ختم کرکے انہوں نے میرا جام غٹ غٹا کر پی لیا اور اس کے بعد جلدی سے راجہ کا جام بھی ایک سانس میں خالی کرکے وہ مسکرائے اور اپنی ترکی ٹوپی کج کرلی۔

میں سمجھ گیا کہ اب وہ گالی دینے ہی پر ہیں اس لئے کہ بارہا دیکھ چکا تھا کہ گالیاں دینے سے پیشتر وہ مہین مہین مسکراتے اور ٹوپی کج کرلیا کرتے ہیں میں نے چاہا کہ میں فوراً اٹھ جاؤں لیکن راجہ نے میرا دامن پکڑ لیا مجھے بٹھالیا ابھی بیٹھا ہی تھا کہ ابرار نے

راجہ صاحب کی جانب نظر اٹھائی، ان کا ہاتھ چوما اور ان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔

راجہ صاحب قرآن مجید کی قسم آپ بھی بڑے حرام زادے ہیں اور محفل برخواست ہوگئی ایک روز سہ پہر کے وقت لکھنو کے ''مقبرہ جناب عالیہ'' کے قریب کے مکان میں جہاں اپنی سالی کے علاج کی غرض سے ٹھہرا ہوا تھا وہ میرے پاس اداس اداس آئے اور کہنے لگے شبیر حسن خاں آپ جانتے ہیں کہ مجھے لڑکپن ہی سے آپ سے کس قدر محبت ہے آپ نے جس دن سے میرا بائیکاٹ کر دیا ہے میری زندگی ویران ہو کر رہ گئی ہے یہ کہا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے میں نے انہیں گلے لگا لیا، اور کہا ابرار تم کو بھی معلوم ہے کہ میں تم کو کس قدر چاہتا ہوں مگر بابا تمہاری گالیاں کون برداشت کر سکتا ہے انہوں نے جواب دیا کہ بات یہ ہے کہ لوگ مجھے ''اری ٹیٹ 1'' ''برافروختہ'' کر دیتے ہیں اس لئے مشتعل ہو کر میرے منہ سے آخر پٹھان ہوں نا، گالیاں نکل جاتی ہیں اگر کوئی مجھے ''اری ٹیٹ'' نہ کرے تو قرآن مجید کی قسم میرے منہ سے گالی نکل ہی نہیں سکتی میں نے کہا اچھا تو آج یہ کرو کہ میرے ساتھ پیو، اور اس طرح کہ میرے تمہارے سوا اور کوئی تیسرا شخص موجود نہ ہو۔ میں تو ''اری ٹیٹ'' نہیں کروں گا؟ انہوں نے کہا بھلا آپ اور مجھے اری ٹیٹ کریں یہ ہو ہی نہیں سکتا اور آپ نے اگر مجھے ''اری ٹیٹ'' بھی کیا تو آپ کے قدموں پر سر رکھ دوں گا اور اگر آپ مجھے جوتے بھی ماریں گے تو قرآن مجید کی قسم اف تک نہیں کروں گا میں نے کہا میرے گھر پر روز دس پانچ دوست آجاتے ہیں یہاں تخلیہ میسر نہیں ہو سکے گا انہوں نے کہا چلئے شاہ پیر محمد صاحب کے ٹیلے کے نیچے، گومتی کے کنارے بیٹھ کر پئیں گومتی کے کنارے، ایک پیگ کرنے کے بعد، انہوں نے کہا یہاں اندھیرا ہو چکا ہے چلئے چوک چلیں، اور نازنین 2 کے کمرے میں بیٹھ کر پئیں اور گانا بھی سنیں میں نے کہا چلو اسی وقت چلو بسم اللہ، دیکھو میں تمہیں ''اری ٹیٹ'' نہیں کر رہا ہوں۔

نازنین کے کمرے کے زینے پر پہنچ کر انہوں نے کہا میری رائے یہ ہے کہ پہلے ٹنڈے کبابی کے وہاں دو پیگ پی لیں اور کباب کھا کر گانا سنیں۔

میرے نزدیک کبابی کی دکان پر بیٹھ کر شراب پینا تو درکنار کباب تک کھانا آداب شرفاء کے خلاف تھا مگر ابرار کی خاطر میں نے یہ ننگ بھی گوارا کرلیا۔

---

1 Irritate 2 ایک نہایت حسین طوائف

ٹنڈے کبابی سے میں نے کہا اپنی دکان کے ایک گوشے میں اوٹ کھڑے کر دو آج یہاں ہم شراب پئیں گے یہ سن کر کبابی گھبرا گیا اور ہاتھ جوڑ کر اس نے کہا'' خاں صاحب'' اس کی بات کاٹ کر میں نے کہا میں سب جانتا ہوں، لیکن اس وقت ایک ایسی بات آن پڑی ہے کہ تم کو یہ بندوبست کرنا ہی پڑے گا ٹنڈے نے، انتظام کر دیا بیٹھتے ہی میں نے ان سے کہا ابرار حسن صاحب دیکھئے میں آپ کو مطلق'' اری ٹیٹ'' نہیں کر رہا بلکہ آپ کے اشاروں پر چل رہا ہوں ابرار نے اپنا سر میرے پاؤں کی طرف جھکا کر کہا قرآن مجید کی قسم آپ کا سا شریف آدمی ہو ہی نہیں سکتا۔

انہوں نے دکان پر دو پیگ پیے اور جیسے ہی تیسرا پیگ بنایا میری جان نکل گئی اس لئے کہ میں نے دیکھا وہ مہین مہین مسکرا کر اپنی ٹوپی کو کج کرنے کے لئے ہاتھ بلند کر رہے ہیں یہ آثار دیکھ کر میں دکان سے فوراً باہر آ گیا اور سامنے کی مسجد کے دروازے پر جا کر کھڑا ہو گیا ابھی مشکل سے ایک منٹ گزرا ہو گا کہ دکان کے اندر سے ابرار کی آوازیں آنے لگی ۔۔۔۔۔ماردوں گا1۔۔۔۔۔ماردوں گا۔۔۔۔۔۔۔۔ماردوں گا۔ اور ان کی اس عمومی دھمکی سے خوف زدہ ہو کر میں نے یہ دیکھا کہ لوگ ٹنڈے کی دکان سے اس سراسیمگی کے ساتھ نکل نکل کر بھاگ رہے ہیں گویا بہت بڑا زلزلہ آ گیا ہے اور ابرار کی آواز برابر گونج رہی ہے'' ماردوں گا'' ''۔۔۔۔ماردوں گا'' اور کبابی کی دکان کے سامنے آنے جانے والوں کے ٹھٹ کے ٹھٹ لگ گئے ہیں۔

اتنے میں یہ دیکھا کہ وہ جھومتے جھامتے باہر آ رہے ہیں انہوں نے جب دکان

سے باہر قدم رکھا تو پھر وہی نعرہ لگا۔۔۔۔۔ماردوں گا اور تمام مجمع کائی کی طرح پھٹ گیا۔

کسی نہ کسی طرح ان کو تانگے میں لاد کر وہاں سے چلا تو راستے بھر جو سواری بھی تانگے سے

---

1 وہ ماردوں گا کے حرف گاف کو با تشدید ادا کر رہے تھے۔

مل کر گزری انہوں نے۔۔۔۔۔ماردوں گا کے برابر نعرے لگائے اور گھر آ کر جب تک سو نہیں گئے یہی نعرہ لگاتے رہے اور جب صبح کو میں نے کہا آداب 1 بجالاتا ہوں ابرار حسن صاحب اثر ملیح آبادی تو وہ پانی پانی ہو کر رہ گئے۔

نورالحسن خاں 2 نام تھا نورالحسن خاں (ہائے مہر نام آخر ''تھا'' بن جاتا ہے) مجھ سے 20 برس بڑے میری پھپّی کے منجھلے بیٹے نئے نئے الفاظ کے موجد، ہر شخص کی ہر افتاد پر یہ کہنے والے کہ ''ہم تو پہلے ہی سے کہتے تھے'' دنیا کی ہر چیز کو ''ٹکڑے اڑا دینے'' کی حد تک برتنے والے قہقہوں کے بادشاہ بخل میں قارون بارگاہ بیماروں کے قرب سے گریزاں اپنی بیماری میں تیمارداری کے خواہاں کھانے پینے پر جان دینے والے دوسروں سے مذاق کرنے پر ہمہ وقت تیار دوسرے ان سے مذاق کریں تو آمادہ پیکار شدید گرمی سردی کے وقت اپنے ساتھ والوں سے بلا وجہ بیزار صحت کے پرستار، درازی عمر کے خواست گار موت کے نام سے گرم فرار۔۔۔۔۔بڑے کلے ٹھلے کے، موٹے تازے، دراز قامت، بلند آواز، گچھے دار مونچھوں اور چوڑی ہڈیوں کے جرنیل نما انسان تھے۔

---

1 صد حیف کہ ان کی بے پناہ ذہانت ان کو لے ڈوبی اور وقت سے پہلے ہی ان کی جان بھی لے لی بلا کی ذہانت بے حد خطرناک چیز ہوتی ہے ذہانت کے منہ میں اگر عقل سلیم کی خاردار لگام نہ لگائی جائے تو وہ اپنے سوار کر زمین پر گرا کر ٹاپوں سے کچل دیتی ہے ابرار کے پاس ذہانت تو تھی لیکن عقل سلیم سے وہ محروم تھے اسی لئے ان

بیچارے کا یہ حشر ہوا۔

وہ اچھے شاعر بھی تھے افسوس کہ ان کے بیٹے اظہار ملیح آبادی نے ان کا تمام کلام ضائع کر دیا ورنہ میں ان کے شعر سنا کر کے آپ کو یہ تسلیم کرا دیتا کہ وہ بڑے خوش گو تھے انہوں نے حیدر آباد میں دو نظمیں کہی تھیں لو آ ہی گئی لاڈلے بیٹے پہ جوانی اور ''سیندھی نے تو اے یار عجب دھوم مچا دی'' جن میں نظیر اکبر آبادی کی سی رونا ئی تھی ایک شعر یاد رہ گیا ہے ان کا

زوال ہوش کے عالم میں بھی ہم نے یہ دیکھا ہے
خرو کے چند فتنے ذہن میں بیدار رہتے ہیں۔

ان کی موت میرے دل کا زخم نہیں ناسور ہے اور ایسا کہ زندگی بھر رستا رہے گا اور ان کا اس دنیا سے اٹھ جانا میری زندگی کا ایک ایسا خلا ہے جو مرتے دم تک پر نہ ہو سکے گا2 ہم پٹھانوں میں بڑے بھائی کو ''دادا'' بھی کہا جاتا تھا۔

چھوٹے دادا کے جملہ خصوصیات کو میں نے ان چند سطروں میں بند کر دیا ہے اب جو کچھ لکھوں گا وہ اس اجمال کی تفصیل ہو گی۔

خدا جانے وہ کون ایسی قبول عام کی گھڑی تھی کہ میں نے ان کو ''چھوٹے دادا'' کے نام سے پکارنا شروع کیا تھا کہ تمام ملیح آباد اور تمام لکھنو ان کا نام بھول کر انہیں اس طرح ''چھوٹے دادا'' کہنے لگا کہ وہ جگت گرد کے مانند جگت چھوٹے دادا بن گئے اور ان سے بڑی عمر کے لوگ بھی ان کو ''چھوٹے دادا'' کہنے لگے۔

اب تفصیلی ملاحظہ فرمائیے۔ ان کا تندرست رہنے اور زیادہ سے زیادہ جینے کا شوق، جنون کی حد تک پہنچا ہوا تھا۔ وہ امانی گنج کے میدان میں ہر صبح و شام میرے ساتھ ٹہلا کرتے اور ٹہلنے میں ایسے ایسے شندے کرتے تھے کہ بے ساختہ ہنسی آ جاتی تھی۔

وہ اپنے دونوں ہاتھ بلند کر کے چکر گھنی کی طرح گھماتے پھر بھالو کی طرح کودتے

گردن کو دائیں بائیں گھما گھما کر ''یا علی'' کے نعرے لگاتے درختوں کے نیچے جا کر اس زور زور سے سانسیں لیتے تھے گویا عالم نباتات کا تمام جوہر پی جائیں گے اور پھر ہاہاہاہا ہا کی آوازوں کے ساتھ اپنا منہ طلسم ہوش ربا کے حملہ آور دیو کے مانند اس طرح پورا کھول کر دوڑتے تھے کہ میدان کی ہوا کے تمام اجزائے صحت کو چبا کر رکھ دیں گے اور جب ٹہل کر گھر آئے تھے تو چارپائی پر چت لیٹ کر اپنی دونوں کلائیوں کو بلا ناغہ ناپا کرتے تھے کہ اب وہ کتنی اور موٹی ہوگئی ہیں۔

اسی ذوق میں صحت اور تمنائے درازی عمر نے ان میں کھانا کھانے کا ہوکا بھی پیدا کر دیا تھا وہ کھانے کی میز یا دسترخوان پر اس طرح خم ٹھونک کر بیٹھا کرتے تھے گویا وہ میدان جنگ میں کود پڑے ہیں اور اپنے شرکائے طعام کو بڑی ذلیل شکست دینے پر تل گئے ہیں۔

وہ اپنے سامنے کی پلیٹیں اور پیالے جلد جلد صاف کر کے انتہائی بے تکلفانہ بے دردی کے ساتھ ہاہاہا کر کے دوسروں کی پلیٹوں پر ٹوٹ پڑا کرتے، اور ان کے شرکائے طعام خالی معدوں کے ساتھ دسترخون سے اٹھ جایا کرتے تھے۔

اور تو اور وہ اس معاملے میں بچوں پر بھی رحم نہیں کرتے اور جب کوئی بچہ ادھر ادھر کسی گوشے میں ان کو مل جاتا تھا تو وہ اس کو گود میں اٹھا کر گھر سے باہر نکل جاتے اور وہاں جا کر اس کے ہاتھ کی چیز پھسلا کر اس سے لے لیتے، اور ہاہا کر کے کھا جایا کرتے تھے۔

وہ میرے لڑکپن میں میرے گنے چھیلا کرتے دو چار گنڈیریاں مجھے دیتے اور یہ کہہ کر پورا گنا خود کھا جاتے تھے کہ باقی سب گر ہیں نکل گئیں اور جب میرے واسطے برفی آتی تھی تو دونا میرے ہاتھ سے لے کر کہتے تھے مولود شریف تو پڑھوا لو اور دونے کو ''مولود شریف مولود شریف'' کہہ کر بلند کرتے اور دو ڈلیاں میرے حوالے کر کے ساری مٹھائی ہاہا کر کے خود کھا لیا کرتے تھے۔

ایک بار ابرار تیخ میں لگا ہوا تیتر بھون کر لائے اور کہا رئیس احمد خاں آج ایسا تیتر بھون کر لایا ہوں کہ قرآن مجید کی قسم مزا آ جائے گا یہ کہتے ہی ان کے ہاتھ کو یکا یک ایک جھٹکا لگا اور مڑ کر یہ دیکھا کہ چھوٹے دادا اس تیخ کو اپنے ہاتھ میں لئے ہاہا کرتے اپنے گھر دوڑے چلے جا رہے ہیں۔

ایک روز میری کھانے کی میز پر کھانا چنا جا رہا تھا، اور وہ آستینیں چڑھائے بیٹھے تھے کہ کسی نے آ کر ان کی والدہ کے انتقال کی خبر سنائی میں اداس ہو کر کھڑا ہو گیا اور آدمی سے کہا کھانا بڑھاؤ انہوں نے بے حد علان ہو کر مجھے دیکھا میں سمجھا ماں کی خبر مرگ نے ان کو غمگین بنا دیا ہے میری آنکھوں میں بھی آنسو بھر آئے میں نے کہا چھوٹے دادا چلئے آخری دیدار کر لیں انہوں نے کہا بھائی شبیر حسن کاں زندگی و موت پر کس کا قابو چلتا ہے آخری دیدار سے پہلے کھانا تو کھا لیں بھوکے پیٹ سے تو رویا نہیں جائے گا میں بڑی حیرت سے ان کو دیکھنے لگا اور انہوں نے ایک ہاتھ 1 مار چھیلا دو ٹوکے ہو جائیں کہہ کر کھانا شروع کر دیا دیکھا آپ نے ان کا ذوق طعام!

---

1 اے چھیلا (بانکے محبوب) ایک ایسا ہات میرے مار کہ میرے دو ٹکڑے رہ جائیں۔

اسی تمنائے صحت نے ان میں یہ بات بھی پیدا کر دی تھی کہ جب میں یا میرے گھر کا کوئی فرد بیمار پڑ جاتا تھا تو چھوت چھات کے ڈر سے وہ مریض کے کمرے میں قدم نہیں رکھتے تھے اور دروازے کی دہلیز سے ناک پر رومال رکھ کر دور ہی سے مزاج پرسی کر کے فوراً چلے جاتے تھے ان کی شخصیت کا ایک پہلو یہ بھی تھا کہ وہ بے حد بخیل بھی تھے اور حیرت تو یہ ہے کہ ان کے کھانے پینے کے ذوق پر بھی وہ بخل حاوی رہتا تھا اور کبھی وہ اپنی جیب سے خرید کر دو پیسے کی چیز بھی نہیں کھاتے تھے۔

انہوں نے زندگی بھر کوئی محنت نہیں کی ان کی آمدنی کا تمام انحصار میری ذات پر تھا، میں جیب خرچ اور کپڑے لتے، جوتے ٹوپی وغیرہ کے واسطے جو روپیہ ان کی

خدمت میں حاضر کیا کرتا تھا وہ اس کو ایک پائی خرچ کئے بغیر سیونگ بینک میں جمع کر دیا کرتے تھے۔

انتقال سے کوئی دو مہینے پیشتر، وہ بھائی بہنوں سے ملنے کے لئے مجھ سے رخصت لے کر پونے سے ملیح آباد چلے گئے وہیں ان کا انتقال ہو گیا۔

جب ان کے پرسے کے لئے میں وطن گیا تو ان کے چھوٹے بھائی محمد علی خاں نے مجھ سے کہا کہ جب چھوٹے دادا بیمار پڑ گئے اور حالت غیر ہونے لگی تو میں نے ان سے کہا چھوٹے دادا میں بڑی اوچھی پونجی کا آدمی ہوں آپ سیونگ بینک سے دو چار سو روپے نکال لیں تا کہ آپ کا علاج ہو جائے یہ سن کر وہ بگڑ گئے کہنے لگے خاں صاحب آپ روپیہ نکالنے کا ہم کو مشورہ نہ دیں ہمارا علاج ولاج کچھ نہ کریں اور اگر ہمارے دشمن مر جائیں تو ہماری لاش کو سمرا[1] تالاب میں پھنکوا دیں اب ان کی خودداری کا حال سنیئے ایک بار کوئی ڈپٹی کلکٹر صاحب مجھ سے ملنے کے لئے آئے ان کے سامنے حقہ رکھ دیا گیا حقے کا دس پانچ کش لگا کر، انہوں نے وہ حقہ اپنے ہاتھ سے اٹھا کر چھوٹے دادا کے سامنے رکھ دیا اور جب چھوٹے دادا حقہ پی چکے تو جوتے کی نوک پر حقہ رکھ کر اپنا پاؤں ڈپٹی کی طرف پھیلا دیا۔ اور ڈپٹی بے چارہ منہ تکتا رہ گیا۔

---

[1] ملیح آباد کے ایک تالاب کا نام

ایک بار ایک سہ منزلے کے اوپر کی دیوار پھلانگ کر مجھے ایک فتنہ روزگار سے مل کر یہ کہنا تھا کہ

کودا کوئی یوں گھر میں ترے دھم سے نہ ہو گا
وہ کام کیا ہم نے ' جو رستم سے نہ ہو گا

میں دیوار پر چڑھ گیا اور منڈیر پر بیٹھ کر کہا چھوٹے دادا آپ بھی آ جائیں انہوں نے کہا بھائی شبیر حسن خاں آپ دبلے پتلے آدمی ہیں آپ آسانی کے ساتھ دیوار پھلانگ سکتے ہیں میں ماشاءاللہ موٹا آدمی ہوں مجھے ڈر ہے کہ دیوار پھاند نے

میں کہیں خدانخواستہ ایسا نہ ہو کہ میں سڑک کی طرف اتر جاؤں۔

دیکھی آپ نے چھوٹے دادا کی خودداری' اپنے باب میں یہ نہیں کہا کہ کہیں ایسا نہ ہو سڑک پر گر پڑوں اس لیے کہ گر پڑنے کے لفظ کو اپنی طرف منسوب کرنا انہیں اپنی شان کے خلاف نظر آیا۔ میں نے کہا چھوٹے دادا اس اتر جاؤں کی بلاغت کی داد نہیں دی جا سکتی۔ یہ کیوں نہ کہا کہ مجھے خوف ہے کہ کہیں میں گر نہ پڑوں انہوں نے کہا گرتے ہیں دھنیے جلاہے ہم پٹھان گرتے نہیں فقط سڑک کی طرف اتر جاتے ہیں۔ ہائے ان کے علاوہ' سڑک کی طرف اتر جانا اس دنیا میں اور کون کہہ سکتا تھا۔ اور وہ بھی ''فقط'' کے ساتھ۔

اور ان کی خودداری کا یہ پہلو بھی بڑا دلچسپ ہے کہ وہ اپنے کو تو بڑی کشادہ دلی کے ساتھ اس امر کا حق دیے ہوئے تھے کہ وہ جس سے بھی چاہیں مذاق کر سکتے ہیں لیکن انہوں نے کسی کا' اپنی ذات پر یہ حق تسلیم نہیں کیا تھا کہ کوئی ان کے مذاق کا تصور بھی کر سکے۔

اور اسی بنا پر جب کوئی ان سے مذاق کا ارتکاب کر بیٹھتا تھا تو وہ مارنے مرنے پر اتر آتے تھے اور زندگی بھر کے لیے اس سے تعلقات منقطع کر لیا کرتے تھے۔

ایک بار کاکوری کے عرس پر شاہ جہانیاں پور کے کسی معمر و معزز پٹھان سے' بہت گھل مل کر باتیں کر رہے تھے کہ ان معمر پٹھان نے ملیح آباد کے آموں کے تذکرے میں ان سے پوچھا خاں صاحب آپ نے کبھی ہمارے شہر کا ''بلاغنڈ'' بھی کھایا ہے یہ سن کر ان کو یہ خیال پیدا ہوا کہ بلاغنڈ کسی عضو فحش کا نام ہے وہ جامے سے باہر ہو گئے اور آستینیں چڑھا کر کہنے لگے کہ بلاغنڈ آپ نے کھایا ہوگا اور آج بھی کھا رہے ہوں گے' وہ تو کہیے ایک صاحب فوراً چھوٹے دادا اور شاہ جہاں پور کے آمادہ نبرد آزما پٹھان کے درمیان آ کر کھڑے ہو گئے اور کہا چھوٹے دادا شاہ جہاں پور میں بیل کو بلاغنڈ کہتے ہیں۔ اگر وہ عین موقع پر آ کر رفع شر نہ کر دیتے تو دونوں لڑ مرتے۔

چاہیے تو یہ تھا کہ چھوٹے دادا معافی کے خواست گار ہوتے مگر ان کو بلا غنڈ سن کر ہی اس قدر غصہ آ چکا تھا کہ معافی طلب نہیں کی' اور تنتناتے ہوئے باہر چلے گئے اللہ ری بلا غنڈ کی فحاشی آمیز صوتی دھمک ایک بار میرے سکھانے پر ان کا پانچ برس کا بھانجا چوہے دان لیے ہوئے گھر سے نکلا اور دہلیز سے پکار کر اس نے کہا مانموں مانموں چھوٹے دادا نے کہا کیا ہے بیٹا اس نے چوہے دان کی طرف اشارہ کر کے کہا مانموں آؤ اس کے اندر بیٹھ جاؤ یہ سنتے ہی وہ ابے مردود کہتے ہوئے اس کے پیچھے دوڑے وہ بھاگا۔ وہ مکان کے اندر گھس کر اپنی نانی یعنی ان کی ماں کی پشت پر جا کر کھڑا ہو گیا۔ وہ جھپٹے اسے مارنے کے لیے بچے نے نل مچایا ان کی ماں نے پوچھا نورتن کیا ہے انہوں نے کہا میں اس کے ٹکرے اڑا دوں گا۔ یہ مردود مجھ سے کہتا ہے مانموں آؤ چوہے دان میں بیٹھو ان کی ماں ہنسنے لگیں۔ وہ ان کے ہنسنے پر بگڑ گئے اور جیسے ہی انہوں نے چاہا کہ ماں کی پشت سے لپٹے ہوئے بچے کو کھینچ کر ماریں بیٹیں ان کی ماں جھلا کر کھڑی ہو گئیں اور کہنے لگیں اگر بچے کو ہاتھ لگایا تو تیرے ہاتھ توڑ کر رکھ دوں گی۔ دیوانہ ہو گیا ہے۔ معصوم بچوں سے لڑتا ہے۔ آج کی اس نئی نسل کا کوئی بیٹا ہوتا تو بھانجے ہی کو نہیں ماں کو بھی دھنک کر رکھ دیتا مگر وہ تھے پرانے دور کے شریف زادے' ماں کی ڈپٹ سن کر باہر چلے گئے۔ لیکن بھانجے سے اپنے نزدیک یہ انتقام لیا کہ اس کے دوسرے روز جب اس کا فتنہ ہوا تو وہ شریک نہیں ہوئے اور لکھنو چلے گئے۔

حیدرآباد کا ذکر ہے ایک رات کے بارہ بجے میں گھر آیا ابرار میرے ساتھ تھے پھاٹک پر آتے ہی موٹر رک گئی میں نے ابرار سے کہا اب موٹر خانے تک کیسے پہنچاؤں ابرار نے صحن میں لیٹے ہوئے چھوٹے دادا کی طرف اشارہ کر کے' کہا یہ کیا قلی پڑا ہوتا ہے اس سے ڈھکلوا لیجیے۔ یہ سنتے ہی چھوٹے دادا نے شیر کی مانند بستر سے جست کی' ڈنڈا اٹھا کر کہا' ابرار کی طرف یہ کہتے ہوئے جھپٹ پڑے کہ ابے مردود' گھس کھدے' ہم کو قلی کہہ رہا ہے۔ ٹھہر جا تیرے ٹکرے اڑا کر رکھدوں گا۔ ابرار بھاگے وہ ڈنڈا

گھماتے پیچھے دوڑے ابرار گلی کے نکڑ پر پہنچ گئے وہ راستے ہی میں کھڑے ہو کر ہانپنے اور غل مچانے لگے۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ پولیس والے سیٹیاں بجانے اور کتے بھونکنے لگے۔

لکھنو کا ذکر ہے کہ ایک دن رفیع احمد خاں کی انگنائی میں بیٹھے ہم لوگ ادھر ادھر کی باتیں کر رہے تھے کہ رفیع نے میرے کان میں کہا چھوٹے دادا سے مذاق کرنے کو بہت جی چاہ رہا ہے۔ میں نے کہا وہ عمر بھر کے لیے خاموش ہو جائیں گے تمہارے۔ انہوں نے کہا ان کی دوستی ہی کیا مجھے چھپن ٹکے دیے دے رہی ہے کہ ان کی دشمنی سے خوف کھاؤں۔ یہ کہہ کر وہ بالا خانے پر زینے کو اندر سے بند کر کے چڑھ گئے ایک منٹ کے اندر اوپر کی کھڑکی کھولی اور اس سے منہ نکال کر کہا ابے چھوٹے دادا اب کیا تھا قیامت برپا ہو گئی۔ ڈنڈا گھما کر پھینکا اور کھڑے ہو کر کہا ابے مردود اگر پٹھان کا نطفہ ہے تو نیچے اتر آ۔ ابھی ٹکڑے اڑا کر رکھ دوں گا۔ کھڑکی بند ہو گئی۔ وہ زینے کے دروازے پر زور آزمائی کر کے اول فول بکنے لگے۔ اتنے میں کھڑکی پھر کھلی اور پھر آواز آئی ابے چھوٹے ددوا۔ انہوں نے جوتہ کھینچ کر مارا جو نیچے گر گیا انہوں نے گرج کر کہا ابے زنخے تجھ پر لعنت اگر مرد ہے تو آ جا نیچے۔ حرام زادے کہیں کے ابے..... نیچے اترے گا نہیں؟ جب اوپر سے کوئی جواب نہ آیا تو وہ غصے میں بھرے وہاں سے چلے گئے۔ اور اس کے بعد مرتے دم تک رفیع کا منہ نہیں دیکھا۔

اسی طرح قہقہے لگانے میں بھی کوئی ان کا نظیر نہیں تھا۔ ان کے قہقہے پورے اٹھارہ ٹھکوں کے ہوا کرتے تھے۔ ان کا ہر قہقہہ زمین پر میل ڈیڑھ میل تک پھیل کر آسمان سے باتیں کرنے لگتا تھا ان کے قہقہوں کی آوازیں سن لیجیے قہ قہ قہ قہ قہ قہ قاہا قاہا قاہا قاہا قاہاہاہا' ہاہا' ہاہا' ہاہا' ہاہا' ہاہا' ہاہا۔ آہ!

میری کوٹھی آبادی سے تقریباً دو میل کے فاصلے پر تھی۔ وہ راتوں کو جب قہقہوں پر اتر آتے تو ان کے قہقہے دادا جان کی باردری سے ٹکرا ٹکرا کر آبادی کے گلی کوچوں میں

گونجنے لگتے تھے اور قہقہے مار کو جب وہ اخ تھو کرتے اور ان کا تھوک چار پانچ گز آگے جا کر گرتا تھا۔ تو وہ بڑے فخر سے کہا کرتے تھے بھائی شبیر حسن خاں دیکھا میرے پھیپھڑوں کا زور؟

ان کے الفاظ کی تراش خراش بھی دنیا سے نرالی تھی' ان کے سینکروں الفاظ میں چند یاد رہ گئے ہیں آپ بھی سن لیں۔ قرول باغ دہلی کا واقعہ ہے حضرت آزاد انصاری میرے ساتھ ہی رہتے تھے۔ وہ روز صبح ان کے کمرے میں جا کر پوچھا کرتے تھے آزاد صاحب کیا لکھا جا رہا ہے وہ کہتے تھے اپنے دیوان کا مقدمہ لکھ رہا ہوں۔ وہ ہا ہا کرتے ان کے کمرے سے نکل جاتے تھے۔ جب یہ سلسلہ آٹھ دس روز تک جاری رہا تو ایک دن' انہوں نے پھر پوچھا آزاد صاحب کیا لکھا جا رہا ہے اور جب آزاد نے پھر یہی جواب دیا کہ چھوٹے دادا اپنے دیوان کا مقدمہ لکھ رہا ہوں تو انہوں نے ایسا فارا شگاف قہقہہ لگایا کہ آزاد اچھل پڑے۔ اور کہا آزاد صاحب اللہ اللہ یہ مقدمہ ہے کہ بالے میاں کی چھیر ہم تو سینکڑوں مقدمہ بازیاں دیکھ چکے ہیں۔ مگر آپ کی مقدمہ بازی اس قدر طویل ہے کہ قطب مینار اس کے سامنے چرکٹے کا لونڈا معلوم ہوتا ہے۔ ارے یہ پاتا بہ سقراطی اور قنوطی زرد بفتی والا' لمبا چوڑا' جھبر جھاڑ' جھاڑ جھنکار شتر خوار مقدمہ۔ مقدمہ ہے یا صدر پور کے نبی شیر خاں کے تاڑوں کا سر درد روسرو رو' سرو' رو' رو' قاہ' قاہ' قاہ' قاہ' قاہ۔ آزاد کے ہاتھ سے قلم چھوٹ گیا۔ اور لوٹنے لگے۔ ایک بار لکھنو کی ایک تنگ گلی سے ہم گزر رہے تھے دیکھا ایک مست سانڈ' رسیاں تڑا کر ہماری طرف سرپٹ دوڑتا چلا آ رہا ہے۔ میں اور چھوٹے دادا' ایک چبوترے پر چڑھ گئے۔ اور شرر صاحب جب گلی کے ایک کنارے سے مل کر چلتے رہے تو انہوں نے چیخ کر کہا ارے شرر صاحب چبوترے کے اوپر چڑھ آیئے ورنہ یہ ادھیایا ہوا مادہ دیوانہ سانڈ اپنے سینگوں سے اپ کی دونوں مغیانوں کو پھاڑتا ہوا اور آپ کے سارے جھولے کو روندتا ہوا نکل جائے گا۔

ایک روز میں نے پوچھا یہ آپ کی بھنویں کیوں چلتی رہتی ہیں انہوں نے قہقہہ مار کر کہا بھائی شبیر حسن خاں جب سے میں بوڑھا ہو گیا ہوں یہ خصماتی حرام زادیاں چھنال ہو گئی ہیں اور یاروں کو اشارے کیا کرتی ہیں۔

ایک روز کسی نے پوچھا چھوٹے دادا اپ نے شادی کیوں نہیں کی انہوں نے قہقہہ مار کر کہا۔ جناب یہ دم بھر کی پلپلاہٹ' اور جیتے جی کی بھلبھلاہٹ آپ ہی کو مبارک ہو۔ یار لوگ ایسی نچال نہیں پالتے۔ خاں صاحب کا ایک مادہ کانر بن جانے کے بعد دنیا بھر کے نروں کی مادہ بن جانا کون گوارا کر سکتا ہے۔

ایک پلا اس کاندھے پر اور ایک پلا اس کاندھے پر اور میانی کے گولے تھر تھر' تھر تھر ہاہاہاہا۔ بھبوتیا کون بنے۔ اگر دا شادی او مائی کے نعروں میں بنو کو گھر میں بیاہ کر لے آتا تو اس سارے ہاڑ سے ہاتھ دھو کر خاں صاحب میں بھی آپ ہی کی طرح لقات اور لفاجھنا بنا ڈگ ڈگ ڈگ کرتا پھرتا ہوتا۔

ایک بار میں نے اپنے نانا جان کے ساتھ ریاست رام پور کے سرکاری مہمان خانے میں ٹھہرا ہوا تھا کہ میرے مامنوں کے ایک بوڑھے اتالیق نے جن کو شاہ صاحب کہا جاتا تھا برآمدے میں بیٹھ کر بری طرح کھانس رہے تھے۔ ان کی کھانسی کی آوازوں کو سن کر انہوں نے مجھ سے کہا بھائی شبیر حسن خاں سن رہے ہیں آپ یہ آوازیں بھوق والی دی' بھوق والی دی ہاہا' ہاہا' ہاہا۔

ہائے اب بھی جب کوئی بری طرح کھانستا ہے تو چھوٹے دادا بھوق والی دی یاد آ جاتی ہے۔

وہ عصر حاضر کی سپاٹ عمارتوں کو حرام زادی کلین شیو کہا کرتے تھے۔ اور نئے فیشن کی لڑکیوں کو انہوں نے لونڈا فیمیل کا خطاب بخشا تھا۔ اور جب کسی موٹے تازے امرد کی پشت پر وہ نظر جماتے تو قہقہہ مار کر کہا کرتے تھے بھائی شبیر حسن خاں ٹھاپ دی بال!۔

ان کے مزاج کی یہ بھی ایک نا قابل فہم خصوصیت تھی کہ جس وقت موسم میں غیر معمولی شدت آ جاتی تھی۔ مثلاً شدید گرمی یا شدید سردی پڑنے لگتی تھی تو وہ اپنے ہم نشینوں سے اس طرح بگڑ جاتے تھے گویا موسم کے شدائد کو انہوں نے ہی پیدا کر دیا ہے ایک بار جب میں نے ان سے پوچھا کہ چھوٹے دادا، سختی تو موسم کرتا ہے اور بگڑ جاتے ہیں آپ ہم سب سے آخر اس کی کیا وجہ ہے تو ایک روکھی ہوں کے سوا وہ کچھ بولے ہی نہیں۔ ہاں یہ بھی سن لیجیے کہ ان کا کوئی فعل ٹکڑے ٹکڑے ارادے سے کم کا کبھی ہوتا ہی نہیں تھا۔

مثلاً جب وہ حمام سے نکلتے تو یہ کہتے نکلتے کہ بھائی شبیر حسن خاں آج تو نہاتے نہاتے ٹکڑے اڑا دیے میں نے اسی طرح جب کھانے کی میز سے اٹھتے تو یہی کہتے کہ بھائی شبیر حسن خاں آج تو کھاتے کھاتے ٹکڑے اڑا دیے میں نے اور جب ٹہل کر آتے تو یہی کہتے کہ بھائی شبیر حسن خاں آج تو ٹہلتے ٹہلتے ٹکڑے اڑا دیے میں نے یعنی وہ دنیا میں جو بھی کام کرتے اسے ٹکڑے اڑا دینے کی حد تک کرتے تھے۔

ان کی یہ بھی ایک دنیا بھر سے نرالی خصوصیت تھی کہ جس وقت کسی اللہ کے بندے کو کوئی حادثہ پیش آ جاتا تو ہو ہمیشہ کہا کرتے تھے ہم تو پہلے ہی کہتے تھے حالاں کہ وہ کبھی پہلے سے ایک حرف بھی نہیں کہا کرتے تھے۔ میں اکثر یہ تماشا دیکھا کرتا تھا

ا یعنی جس طرح فٹ بال پر ٹھاپ سے ٹھوکر لگاتے ہیں اسی طرح تم بھی ایک ٹھوکر لگا دو۔

کہ جب کوئی سائیکل سے گر جاتا یا پھل تراشنے میں کسی کی انگلی کٹ جاتی، کسی شخص کی ریل چھوٹ جاتی تھی، تو ان تمام مواقع پر وہ بڑے پیمبرانہ انداز میں ہم تو پہلے ہی کہتے تھے کا اعلان کیا کرتے تھے۔

آخر میں ان کی ایک اور بات بھی سن لیجیے جس سے پتہ چل جائے گا کہ ساٹھ برس کی عمر میں بھی عورت نا دیدہ چھوٹے دادا کس قدر بے خبر انسان تھے۔

ایک روز میرے پاس غصے سے بھرے ہوئے آئے اور کہنے لگے بھائی شبیر حسن خاں آپ نے اپنے دوکوڑی کے خدمت گار جگنو کو بے حد منہ چڑھا رکھا ہے۔ اگر آپ کا منہ نہ ہوتا تو آج مار مار کر سالے کے ٹکڑے اڑا دیتا۔ میں نے پوچھا کیا بات ہے انہوں نے کہا وہ مجھ سے بحث کر رہا تھا کہ بچہ مادہ کے آگے کے رخ سے پیدا ہوتا ہے اور جب میں نے اس گاؤدی سے یہ کہا کہ تیرا خیال سراسر غلط ہے بچہ مادہ کے پیچھے سے پیدا ہوتا ہے۔ تو وہ سالا مجھ پر ہنسنے لگا۔ مجھے ان کے اس بھولے پن پر ہنسی آ گئی میں نے کہا چھوٹے دادا جگنو سچ کہتا ہے بچہ مادہ کے اگلے حصہ سے پیدا ہوتا ہے تو انہوں نے بڑے وثوق کے ساتھ کہا بھائی شبیر حسن خاں میں اپنی ان دونوں آنکھوں سے دن دیہاڑے میتھنیا کی بھینس کو خود جنتے دیکھ چکا ہوں کہ اس کا بچہ پیچھے کی طرف سے پیدا ہوا تھا۔ اور جب میرا قہقہہ نکل گیا تو وہ وزیرے چنیں شہر یارے چناں۔ کہتے ہوئے باہر چلے گئے۔

☆☆☆

مختار احمد خاں

میرے ساتھ کھیلے ہوئے پڑوسی میرے باپ کے رفیق، شبیر احمد خاں کے بیٹے، نسلی طور پر رام پوری وطنی اعتبار سے ملیح آبادی، عاشق مزاج وصوفی منش دبلے پتلے دھان پان اور بلا کے ذہین انسان تھے۔ ابرار اور چھوٹے دادا وغیرہ کے مانند خصوصیات کثیرہ کے جامع تو نہیں تھے۔ لیکن ان کی ایک خصوصیت ایسی تھی کہ جو ہزاروں خصوصیات پر بھاری تھی اور انسانی تاریخ آج تک اس کی کوئی نظیر پیش نہیں کر سکی ہے۔

اس سے پیشتر کہ میں اس خصوصیت پر روشنی ڈالوں، یہ کہہ دینا چاہتا ہوں کہ وہ پڑھے لکھے آداب مجلسی سے واقف لکھنو کی تہذیب سے متاثر تھے اور اس امر کو بھی خوب بدرجہ اتم سمجھتے تھے کہ بے محل کی بات کرنا یا کہنا آدمی کو سبک بنا دیتا ہے..... لیکن یہ سب کچھ جاننے کے باوجود وہ جب کسی ایسی نا قابل تعظیم ہستی سے دوچار ہو جاتے تھے جس کی ذات سے کسی دینی احترام کا تصور وابستہ ہوا کرتا تھا اس وقت ان کو بے اختیار ہنسی آنے لگتی تھی۔ ہر چند وہ صاحبان کشف وکرامات کے روبرو اس امر کی انتہائی کوشش کرے تھے کہ باادب وسنجیدہ رہیں اور بعض اوقات تو سنجیدہ رہنے کی کوشش میں ان کی جان تک پر بن جایا کرتی تھی لیکن ان تمام مساعی کے باوجود ان بزرگوں کے سامنے ان کی چھاتی کو توڑ کر قہقہے بلند ہو جایا کرتے تھے۔

یہ بھی سن لیجیے کہ وہ ملحد نہیں بلکہ دین دار آدمی تھے۔ اور تصوف کی چاشنی ان کو اپنے باپ سے وراثت میں ملی تھی۔ اس لیے ہونا یہ چاہیے تھا کہ وہ ان بزرگوں کا احترام کرتے اور بڑی عقیدت کے ساتھ ان کے روبرو سر جھکاتے اور ان کے ہاتھ چومتے لیکن یہ عجیب بات تھی کہ رسم عالم اور خود اپنے عقائد کے خلاف وہ ہنسنے اور قہقہے لگانے پر مجبور ہو جایا کرتے تھے۔

نفس انسانی کا مسئلہ بڑی ٹیڑھی کھیر ہے اور بعض اوقات تو یہ مسئلہ ایسی بھول

بھلیاں بن جاتا ہے کہ اس میں داخل ہو کر باہر نکلنا بے حد دشوار ہو جاتا ہے۔

اب ان کی زندگی کے چند واقعات سن لیجیے۔ اور زندگی بھر غور فرماتے رہیے کہ ان کی علت کیا تھی۔

پہلا واقعہ: ایک روز میں اپنے نانا کے انتقال کے غم میں چارپائی پر اداس لیٹا تھا اور وہ پائنتی کی طرف غمگین بیٹھے ہوئے مجھے تسلی دے رہے تھے کہ اتنے میں مولانا صاحب تعزیت کے لیے آ گئے میں اٹھ کر بیٹھ گیا..... اور جب انہوں نے فاتحہ کو ہات بلند کیے تو نیچے سے میری چارپائی اچھلنے لگی' میں گھبرا گیا۔ اور تھوڑا سا جھک کر جب چارپائی کے نیچے نظر دوڑائی تو یہ دیکھا کہ وہ چارپائی کے نیچے پڑے ہنسی کے مارے لوٹ پوٹ ہو رہے ہیں اور مولانا صاحب لاحول ولاقوۃ کہتے باہر تشریف لیے جا رہے ہیں۔

دوسرا واقعہ: ایک بار امین آباد (لکھنو) کے چوراہے پر ہماری مڈبھیڑ ہو گئی' شمس العلما مولانا عبدالحمید صاحب فرنگی محل سے ہم لوگ تانگے اور وہ گاڑی میں تھے مولانا کو دیکھ کر میں نے تانگہ ٹھہرا لیا اور مجھے دیکھ کر مولانا نے گاری روک لی۔ صاحب سلامت و مزاج پرسی کے بعد جب مولانا نے پوچھا کہ خاں صاحب کہاں جا رہے ہیں؟ تو مختار نے قہقہہ مار کر جواب دیا حضور چوک جا رہے ہیں چوک گانا سننے کے واسطے قاقا' قاقا' قاقا۔ ارے جوش جلدی تانگہ بڑھاؤ۔ ہم مرے جا رہے ہیں۔ یہ خلاف توقع بات دیکھ کر مولانا نے کوچ بان سے بلند آواز سے کہا گاڑی بڑھاؤ۔ اور مختار نے جھک کر کہا حضور آداب اور مولانا دور تک مڑ مڑ کر نہایت غصے کے ساتھ دیکھتے چلے گئے۔

تیسرا واقعہ: یہ واقعہ غالباً سنہ ۱۹۲۰ء کا ہے جب کہ لکھنو میں ایک بزرگ وارث جن شاہ صاحب کے کشف و کرامات کے ڈنکے پٹے ہوئے تھے ان کے خاص مریدوں میں زیادہ تر علماء بیرسٹر اور ہائی کورٹ کے جج تھے۔ اور یہ مشہور تھا کہ وہ ان سب کی

شراب چھڑوا چکے ہیں۔ اس لیے کہ جب وہ پیگ بناتے تھے تو ان کو یہ نظر آتا تھا کہ جام کے اندر سینکڑوں سور کے بچے تیر رہے ہیں۔

ان کے عقیدن مندوں نے شاہ صاحب کے ٹیلے کی مسجد کے جوار میں ان کے واسطے ایک کوٹھی تعمیر کروادی تھی۔ اور وہ بڑی شان کے ساتھ وہاں رہتے تھے۔

اسی اثنا میں ایک روز صبح کو مختار میرے پاس آئے اور کہا چلو حضرت وارث شاہ حسن صاحب کی زیارت کر آئیں۔

ابھی ہم مسجد کی سیڑھیاں طے ہی کر رہے تھے کہ میں نے کہا دیکھو مختار شاہ صاحب کی ذات سے احترام کا تصور وابستہ ہے خدا کے واسطے ان کے سامنے جا کر ہنسنے نہ لگنا۔ وہ میری بات سن کر چوکنا ہو گئے اور کہا خدا تمہارا بھلا کرے بڑے موقع سے تم نے ہنسی کی بات یاد دلا دی۔ اب دانش مندی اسی میں ہے کہ شاہ صاحب کا تصور کر کے یہیں سیڑھیوں میں بیٹھ جاؤں۔ وہ بیٹھ گئے اور اس زور زور سے ہنسنے لگے کہ گویا ان کو ہنسی کا ہیضہ ہو گیا ہو۔

شاہ صاحب کے خادم ابو بکر نے اپنے کوارٹر سے جب ان کا یہ عالم دیکھا تو یہ سمجھ کر کہ ان پر جن آیا ہوا ہے وہ پانی بھرا ہو بدھنا لے کر ان کی طرف دوڑ پڑا۔ اور کچھ پڑھ پڑھ کر ان کے منہ پر زور زور سے چھینٹے مارنے لگا۔ اس عمل نے ان کی ہنسی میں اور بھی اضافہ کر دیا۔ اور وہ ہنسے کے مارے لوٹنے لگے۔ الغرض کوئی آدھ گھنٹے یا پون گھنٹے کے بعد یہ بادل چھٹا اور ہنسی کا مینہ تھم گیا..... انہوں نے منہ دھو کر رومال سے پونچھا پانی پیا گہری سانس لی اور آسمان کو دیکھا۔ ٹوپی درست کی پھریری لی اور مجھ سے کہا اب چلو بڑے اطمینان سے بیٹھیں گے۔ اس قدر ہنس چکا ہوں کہ اب سال بھر تک ہنسی نہیں آئے گی۔

اب ہم وارث شاہ صاحب کی خدمت میں پہنچ گئے مختار ان کے داہنے ہاتھ پر اور میں الٹے ہاتھ پر بیٹھ گیا۔ ادھر ادھر کی باتیں ہونے لگیں اور وہ انتہائی عقیدت کے

ساتھ مکالمت کرتے رہے۔ اور میں مطمئن ہو گیا کہ اب کوئی بات خلاف تہذیب نہیں ہو سکے گی۔

باتوں باتوں میں شاہ صاحب نے پوچھا مختار تمہارے والد کا مزاج کیسا ہے۔ اس سوال نے ان کے صبر و تحمل کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔ وہ شاہ صاحب کے احترام کا بار پہلے ہی برداشت کیے بیٹھے تھے۔ اب شاہ صاحب کے سوال کے دوش پر ان کے باپ کا احترام بھی لاد دیا اور یہ دہرا بوجھ ان سے اٹھ نہیں سکا۔ اور پہلو بدل کو انہوں نے کہا حضور..... میں سمجھ گیا کہ اب حضور کو کیا ہونے والا ہے۔ اس لیے کہ میں بارہا تجربہ کر چکا تھا کہ جس طرح گالی دینے سے پیشتر ابرار مہین مہین مسکرا کر اپنی ٹوپی کج کر لیتے تھے۔ اسی طرح مختار قہقہوں سے پیشتر اپنی لانبی آواز میں حضور کہا کرتے تھے۔

شاہ صاحب نے یہ دیکھ کر کہ وہ حضور کہہ کر خاموش ہو گئے ہیں پھر دریافت کیا کہ بتاؤ تمہارے والد کا مزاج کیسا ہے..... انہوں نے بھنچی سی تھرتھراتی آواز میں کہا حضور خیریت سے ہیں۔ اور ان کے شانے ہلنے لگے۔ اور شاہ صاحب کے تیور بدل گئے۔

مجھ کم بخت میں یہ بڑا عیب ہے کہ جب کوئی میرے سامنے ہنسنے لگتا ہے تو میں کسی طرح بھی ہنسی کو ضبط نہیں کر سکتا میں نے فوراً کھنکھار کر اس طرح اٹھنا چاہا گویا باہر جا کر گلا صاف کرنا چاہتا ہوں شاہ صاحب نے کہا میاں اگالدان آپ کے پیچھے رکھا ہوا ہے۔ میں نے منہ موڑ کر اس بڑے اگالدان میں اپنی ہنسی خوب جی بھر کر تھوکی، اور اس قصد سے آنکھیں جھکا کر بیٹھ گیا کہ اب مردود مختار کی طرف دیکھوں گا ہی نہیں۔

اتنے میں شاہ صاحب نے بگڑ کر مختار سے کہا اودھ کے شریف زادوں میں یہ کیا ناشائستگی پیدا ہو گئی ہے کہ جب ان کے والد گرامی کا مزاج پوچھا جاتا ہے تو وہ حضور کہہ کر ہنسنے لگتے ہیں۔ انہوں نے جھک کر شاہ صاحب کے قدم پکڑ لیے اور قہقہہ مار کر کہا۔ حضور میں بدتمیز نہیں ہوں۔ میرے پیر تھے دیرے شریف کے حاجی وارث علی شاہ، حضور پرسوں انہیں خواب میں دیکھا تھا جب سے بیکار بیکار برابر ہنسی آتی رہتی

ہے قاہ قاہ قاہ..... اور میں اپنی پسلیاں پکڑ کر اگال دان میں دوبارہ ہنسی تھوکنے لگا۔

شاہ صاحب نے غصہ بھری آواز میں کہا۔ مختار یہ عذر گناہ بدتر از گناہ ہے کہ تم نے اپنے پیر کو خواب میں دیکھا اور اس کا یہ اجر ہوا کہ تمہیں بیکار بیکار ہنسی آتی رہتی ہے۔ میں تمہیں بتاتا ہوں کہ تمہارا قلب سیاہ ہو چکا ہے۔ میں تمہیں چالیس تعویز دوں گا انہیں چالیس دن تک گھول کر پینا اس سے جو شیطان تم پر مسلط ہو گیا ہے وہ بھاگ کھڑا ہوگا۔ مختار کے حواس بجا نہیں رہے تھے انہوں نے پھر قہقہہ مار کر کہا اے حضور ایک تعویز کو پورے چالیس دن تک کیسے پیتا رہاں گا..... شاہ صاحب نے ڈانٹ کر کہا میں تمہیں چالیس تعویز دوں گا تم اسے ایک سمجھ رہے ہو۔ یہ سنتے ہی مختار نے قہقہے میں دھلی چیخ مار کر مجھ سے کہا۔ ارے جوش اپنا قلم دے دے ترکیب استعمال لکھ لوں قاہ قاہ قاہ..... میں نے قلم نکالنے کے لیے جیب کی طرف ہاتھ اٹھایا۔ ہاتھ ایک من کا ہو کر کانپنے لگا۔ اور ایک زبردست قہقہہ میرا سینہ توڑ کر ہوا میں گونجنے لگا۔ اور میں یہ کہتا ہوا بھاگا کہ شاہ صاحب یہ خاکسار چلا۔ اور مختار میرے پیچھے یہ کہتے ہوئے دوڑے کہ ارے قلم تو دے دو۔ اور اسی عالم میں ہم دونوں مسجد سے باہر آ کر مسجد کے فرش پر گر کر ماہی بے آب کی طرح تڑپنے لگے۔

چوتھا واقعہ: وہ ایک زبردست عشق کے سلسلے میں بمبئی اور بمبئی سے کلکتہ چلے گئے۔ اور وہیں پھر تجارت بھی کرنے لگے تھے۔ اور میں بھی اپنی زندگی کے سب سے زیادہ پیچیدہ عشق کو بہلانے اور بھلانے کی خاطر غالباً سنہ ۱۹۲۲ء میں کلکتہ چلا گیا تھا اور غالباً ڈھائی تین مہینہ ان کے ساتھ رہا تھا۔

میں ان کی ناقابل شرح ہنسی کے تو بہت سے واقعات دیکھ چکا تھا لیکن ان کے ناقابل فہم رونے سے وہاں جا کر دوچار ہوا تھا۔

کلکتہ میں ایک فرنگی لڑکی پر جس کا نام تھا مس میبی وہ عاشق ہو گئے تھے اور وہ اس قدر وفادار تھی کہ روز وقت نکال کر چار بجے سہ پہر سے آٹھ بجے رات تک وہ ان کے

پاس بلا ناغہ ایا کرتی تھی لیکن یہ دیکھ کر مجھے بڑی حیرت ہوتی تھی کہ روز اس کے آتے ہی وہ رونے لگتے تھے۔ معشوق کی بے وفائی پر تو سب روتے ہیں وہ معشوق کی وفاداری پر رو دیا کرتے تھے۔ ان کی اس روش سے ان کی محبوبہ کو بھی تعجب ہوتا تھا۔ اور تاسف بھی۔ اس نے مجھ سے بھی کہا تھا کہ میں مختار کو سمجھاؤں کہ وہ خوشی کے موقع پر رویا نہ کریں۔ میں نے انہیں سمجھایا بھی اور انہوں نے وعدہ بھی کر لیا کہ اب نہیں روئیں گے۔ لیکن جب وہ سامنے آئی اس اللہ کے بندے نے پھر رونا شروع کر دیا۔ جب میں نے بہت غور کیا تو یہ بات میری سمجھ میں آئی کہ چوں کہ تصوف کا جذبہ ان کو اپنے باپ سے خون میں ملا تھا اور چوں کہ صوفیا کے متعلق یہ سنا گیا ہے کہ وہ لذات شیرینی میں غم کی چاشنی ملا دیا کرتے ہیں۔ اور یہاں تک کہ لزیذ کھانوں میں بھی پانی کی آمیزش کر کے ان کو بدمزہ بنا دیتے تھے۔ اس لیے مختار اپنی معشوقہ کے شربت دیدار میں اپنے آنسو گھول دیتے ہیں کہ مسرت کی تیز دھار کند ہو جائے۔

وہ میرے ناقابل حل پیچیدہ عشق کو بھلانے کی خاطر، اکثر کلکتے کی حسینوں کے پاس مجھ کو لے جایا کرتے تھے۔ لیکن میرے دل میں کسی کی جگہ ہی پیدا نہیں ہوتی تھی ..... ایک روز وہ ایک نہایت حسین لڑکی کے کان میں کچھ کہہ کر دوسرے کمرے میں چلے گئے تو وہ لڑکی میرے پہلو میں آ کر بیٹھ گئی اور میری آنکھوں میں انکھیں ڈال کر مسکرائی۔ میں مسکرا نہ سکا۔ پھر اس نے چٹ سے میرا بوسہ لے کر میری گردن میں اپنی بانہیں ڈال دیں۔ میں نے کہا میں ان بانہوں کا بوجھ نہیں اٹھا سکتا۔ اس نے جھینپ کر کہا اللہ رے لکھنو کی نزاکت۔ ارے میں تو مختار کا چوتھا واقعہ بیان کر رہا تھا اپنا دکھڑا،

---

۱ وہ دور ایسا دور تھا کہ اپنے عشق کی بنا پر میرے دل میں تل بھر جگہ بھی خالی نہیں تھی۔ ورنہ میمی کے جال کا وہ عالم تھا کہ اگر میرا دل برائے کرایہ خالی ہوتا تو میں

اسے اپنے دل میں بسالیتا۔ چلیے بہت اچھا ہوا ورنہ مختار کے سے جگری دوست سے تصادم ہو جاتا۔ اپنے اس عشق پر میں نے ایک نظم بھی کہی تھی جس کا ایک شعر یاد ہے۔

تیرے پانے پہ بھی نہیں راضی
تیرے کھونے پہ بھی نہیں تیار

ہاں تو سنیے اسی زمانے میں ایک دن مختار نے مجھ سے کہا شبیر میں دنیا ترک کر کے اب اللہ اللہ کرنا چاہتا ہوں۔ یہ ساری دکان فروخت کر کے اور زمینی کو اس کا روپیہ دے کر ملیح آباد چلا جاؤں گا۔ اور کاکوری شریف کے سجادہ نشین کے ہاتھ پر بیعت کر لوں گا وہیں کوئی حجرہ مجھے بھی دلا دینا۔ وہاں بیٹھ کر ساری زندگی یاد الٰہی میں گزار دوں گا۔ میں نے لاکھ لاکھ سمجھایا کہ ان کے سر پر ترک دنیا کا بھوت سوار ہو چکا تھا۔ وہ نہیں مانے دکان کو غالباً ستر ہزار میں فروخت کر کے انہوں نے اپنے پاس فقط تین سو روپے رکھ لیے اور باقی تمام روپیہ اپنی معشوقہ کے حوالے کر دیے ہر چند وہ روپیہ قبول نہ کرنے اور ان سے کلکتہ نہ چھوڑنے پر اصرار کرتی رہی۔ لیکن انہوں نے اس کی بات نہیں مانی۔ مجھے ساتھ لے کر ملیح آباد سے میرے ساتھ ٹم ٹم میں سوار ہو کر کاکوری پہنچ گئے۔

خانقاہ کے گنبد پر نظر پڑتے ہی میں نے کہا دیکھو مختار حبیب حیدر شاہ سے ہمارے تمہارے تین چار پشتوں کے تعلقات ہیں اور پھر میں ان کا مرید بھی ہوں اگر ان کے سامنے جا کر تم نے ہنسنا شروع کر دیا تو یاد رکھو ہماری ناک کٹ جائے گی۔ یہ سنتے ہی وہ مجھ سے لپٹ کر اتنا روئے کہ ہچکیاں بندھ گئیں۔ اور جب ہچکیوں کا تار ٹوٹا تو ڈبڈباتی آنکھیں اٹھا کر انہوں نے کہا شبیر تمہارا ہنسوڑ مختار تو اب مر چکا ہے وہ اب جب تک جیئے گا لگاتار روتا ہی رہے گا۔ اگر مزا ہے تو پچھلے ہر رونے میں اس کے بعد نہایت اطمینان کے ساتھ میں ان کو حبیب حیدر شاہ کے پاس لے گیا' ان کا اور ان کے

باپ کا نام بتا کر درخواست کی کہ ان کو اپنے حلقہ ارادت میں شامل فرما لیجیے۔

شاہ صاحب ہر شخص کو مرید نہیں بناتے تھے لیکن چوں کہ میں نے درخواست کی تھی اور وہ مختار کے پورے خاندان سے بھی واقف تھے انہوں نے میری درخواست منظور کر کے ان کو حکم دیا کہ پہلے دو رکعت نماز پڑھ لو۔ انہوں نے اس قدر طویل رکوع و سجود اور اس درجہ اخلاص مندی کے ساتھ نماز پڑھی کہ عہد رسالت کے مسلمان یاد آ گئے۔ نماز پڑھ کر انہوں نے ان پورے روپوں کی مٹھائی منگائی جو کلکتہ کی دکان کے باقی رہ گئے تھے۔ اب مال دنیا میں ان کے پاس ایک پائی بھی نہیں تھی۔

اب حبیب حیدر شاہ ان کو اپنے روبرو بٹھا کر حسب دستور قدیم ان کا ہات اپنے ہاتھ میں لے کر اپنے سلسلے کے تمام بزرگوں کے نام لے لے کر ان سے یہ کہلانے لگے کہ میرا یہ ہات فلاں فلاں بزرگوں کے ہاتھ پر ہے۔!

غالباً تراب علی شاہ قلندر کا نام لے کر انہوں نے مختار سے کہا اب کہو یہ میرا ہات مجا شاہ قلندر کے ہات پر ہے۔ مجا شاہ قلندر کا نام سنتے ہی مختار پر دفعتہً خاموشی چھا گئی۔ شاہ صاحب اس خیال سے کہ ان پر رقت طاری ہو گئی ہے۔ دو منٹ کے واسطے خاموش ہو گئے۔ اور جب ٹھہر کر شاہ صاحب نے پھر فرمایا ہاں تو کہو میرا یہ ہاتھ مجا شاہ قلندر کے ہاتھ پر ہے تو انہوں نے پھر یری سی لے کر کہا حضور۔ ان کے اس طویل الصوت حضور کو سن کر میرے پاؤں کے نیچے سے زمین نکل گئی۔ اور سمجھ گیا کہ اب پل بھر میں کیا ہونے والا ہے۔ اس لیے میں نے ٹھان لی کہ فوراً بھاگ کھڑا ہوں ..... لیکن یہ سوچا کہ اگر جوتے پہن کر جانے لگوں تو شاہ صاحب پوچھ بیٹھیں گے کہ میں کہاں جا رہا ہوں اس لیے آؤ دیکھا نہ تاؤ۔

اور ایک دقیقہ ضائع کیے بغیر میں جھٹ سے اٹھا اور شاہ صاحب کی نظر بچا کر ان کے بائیں ہاتھ کے برآمدے میں آ گیا اور پاکھے لگ کر چوروں کی طرح کھڑا ہو گیا۔ وہ برآمدہ آٹھ دس فٹ بلند تھا۔ اور جھانک کر میں نے دیکھ لیا تھا کہ بھاگ سکتا ہوں کہ

نہیں۔

اب شاہ صاحب نے فرمایا کہ مختار میاں نماز میں تاخیر ہو جائے گی۔جلد ان منازل سے گزر جاؤ اور کہو کہ میرا ہاتھ مجا شاہ صاحب کے ہاتھ پر ہے۔

شاہ صاحب کے ہونٹوں کی جنبش ابھی ختم ہوئی تھی کہ ان کے خاراشگاف قہقہے سے خانقاہ کے تمام سقف و بام گونج اٹھے۔

شاہ صاحب نے گھبرا کر ان کا ہاتھ چھوڑ دیا' اور تیز تیز قدم رکھتے ہوئے مسجد چلے گئے۔

(تمام ناموں کے بعد حضرت علی کا نام لیا جاتا تھا۔اور پھر بیعت مکمل ہو جاتی تھی۔

میں ننگے پاؤں دھم سے کود پڑا۔اور اپنی باہر کھڑی ہوئی ٹم ٹم کی طرف بھاگا۔ان کے قہقہے اور ان کے یہ الفاظ میرا تعاقب کرنے لگے کہ حضور ایسا نام تو کبھی سنا ہی نہیں تھا۔اللہ اکبر مجا شاہ قلندر ہاہا' ہاہا' ہاہا' ہاہا۔ارے شبیر کہاں غائب ہو گئے ہو ارے مجھے سنبھالو دم نکلا جا رہا ہے میرا اف اف مجا شاہ ارے توبہ قاہ قاہ قاہ' قاہ' قاہ' ہا' ہا' ہا۔

☆☆☆

قاضی خورشید احمد

ریاضی استاد، شاعر و نقاد، فارسی و سنسکرت ماہر، مکذب بدیہیات، طفل حرکات، اخلاق شعار، دوست نواز، دشمن ناشناس، امر و پسند، آداب شکن، سریع الکلام، آشفتہ مزاج، غریب الخصائل، بظاہر بیگانہ، باطن یگانہ اور

گہے بر طارم اعلیٰ نشینم
گہے بر پشت پائے خود نہ بینم

قسم کے ایسے سنکی انسان تھے کہ جن کو نفسیات کے ماہر غور و فکر کا ایک اہم موضوع بنا سکتے تھے۔ ان کے سے کثیر الجہات آدمی کے تمام خصوصیات اور گفتنی ناگفتنی حالات پر اگر تفصیل کے ساتھ قلم اٹھاؤں تو ایک دفتر ہو جائے..... لیکن چونکہ میں بڑی تیزی کے ساتھ غروب ہو رہا ہوں اور اس جھٹپٹے میں اتنا وقت نہیں نکال سکتا، اس لیے ان کی زندگی کے چند ہی پہلوؤں پر لکھ سکوں گا۔

وہ جھانسی اٹاوہ اور الہ آباد کالج میں پرنسپل کے عہدے پر فائز رہے۔ اور ڈاکٹر ضیاء الدین کے بعد مسلمانوں میں ریاضی کے سب سے بڑے ماہر تھے..... ریاضی دانوں کو بالعموم ادب سے دور کا بھی واسطہ نہیں ہوتا۔ لیکن وہ دریائے ادب کے بھی پیراک اور اس قدر زود گو شاعر تھے کہ جب کبھی ان کے کالج میں کوئی مشاعرہ ہوتا تو وہ ایک نشست

---

۱ قصبہ قہونہ ضلع سیتاپور کے باشندے تھے۔

میں ہزار ہزار پندرہ سو شعر کہہ کر کالج کے لڑکوں میں تقسیم کر دیا کرتے تھے۔

ظاہر ہے کہ Mass Production یعنی وافر پیداواری تکثر آفرینی یا انبار ابداعی میں بڑھیا مال تو پیدا نہیں ہو سکتا۔ پھر بھی ان کی غزلوں میں کبھی کبھی اچھے شعر

بھی جھلک اٹھا کرتے تھے۔

شاعری کے سلسلے میں وہ دو بار مجھ سے بگڑ بھی گئے تھے پہلی بار تو شفق پر میری نظم سن کر انہوں نے اپنے مخصوص لہجے میں جلدی جلدی کہا تھا..... یہ مناظر کی شاعری انگریزوں کو مبارک ہو مجھے تو یہ ایک آنکھ نہیں بھاتی۔ انگریزی پڑھ کر اپ نے اپنی شاعری خراب کر ڈالی ہے۔ بالکل خراب اور دوسری بار میری ایک فارسی غزل مسلسل کو سن کر انہوں نے کہا تھا کہ آپ مہربانی فرما کر ایران تشریف لے جائیں۔ ایران آپ کو مطلق اردو نہیں آتی مطلق مطلق مطلق نہیں آتی۔ ہر چند میں نے اپنا اب تک کوئی تخلص تجویز نہیں کیا تھا اس کے باوجود آپ سے بہتر کہیں بہتر شعر کہتا ہوں۔

اس پر میں نے ہاتھ جوڑ کر کہا تھا ارے قاضی خدا کے لیے تخلص نہ رکھ لینا ورنہ میں تو خاک میں مل کر رہ جاؤں گا۔

اب ان کے انتقاد کی شان بھی دیکھ لیجیے ان کو جب یہ شعر سنایا گیا

کبھی اے حقیقت منتظر نظر آ لباس مجاز میں
کہ ہزاروں سجدے تڑپ رہے ہیں مری جبین نیاز میں

تو انہوں نے زور سے منہ جھٹک کر کہا لاحول بھلا یہ بھی کوئی شعر ہے شاعر صاحب اللہ تعالیٰ سے فرما رہے ہیں کہ ہر چند میرے ماتھے پر ہزاروں سجدے پھڑک رہے ہیں لیکن جب تک تو اطلاق وتنزیہ کے دائرے سے نکل کر چھپن چھری یعنی جانکی بائی آف الہ آباد کے لباس میں انگیا کرتی پہن کر نہیں آئے گا میں تیری بارگاہ میں ایک سجدہ بھی نہیں کروں گا اس سے زیادہ مادہ پرستی اور اہانت الٰہی کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا..... اس کے بعد انہوں نے کہا مجھے اس غزل کے دو شعر یاد آ گئے ذرا ان کو بھی پرکھ کر دیکھ لیجیے۔

نہ کہیں جہاں میں اماں ملی، جو اماں ملی تو کہاں ملی
مرے جرم ہائے سیاہ کو ترے عفو بندہ نواز میں